عید مبارک

دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

# جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

مارچ 2026

قیمت 200 روپے

بانی

معراج رسول

مدیر اعلیٰ

عذرا رسول

مدیرہ : لبنیٰ خیال

نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

مارکیٹنگ و سرکولیشن مینجر

ثمر عباس

0301-2454188



07 — چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ

قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

12 — کمین گاہ — پروین زبیر

خوابوں سے کنارہ کش ہو جانے والوں
کی آخری خاموش قربانیاں

50 — نشانہ باز — مظہر حسین

پُراسرار ماحول میں بُنی گئی
کہانی کے اُلجھے پیچ و خم......

59 — بکھرے خواب — مظہر سلیم ہاشمی

ایک عادی نے نوش کے
شب و روز گزارنے کا نیا انداز

64 — سربکف — طاہر جاوید مغل

سنسنی خیز واقعات اور انتقام کے جذبات
سے لبریز ایک لہورنگ داستان

93 — زہریلا مقتول — بشریٰ اسجد

دوسروں کی ضرورت پوری
کرنے والے معالج کا کاری وار

97 — خدائی فوجدار — جاوید بسام

پُرتجسس سنگین جرم کے پیچھے
چھپی حقیقت کا سنسنی خیز انکشاف



جلد 56 • شمارہ 03 • مارچ 2026 • زرِ سالانہ 3500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

108
## دہر
حسام بٹ

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے
عیار ذہنوں کی ہوش رُبا حیلہ سازیاں

131
## تاوان
عمران قریشی

اس شوہر کی کارکردگی جس کی
بیوی کو اغوا کرلیا گیا تھا

141
## آزاد قیدی
نسرین خان

قدرت کے فیصلے کے آگے
سرنگوں ہونے والے شخص کا ماجرا

147
## ہیرا پھیری
صائمہ دانش

قانون اور مجرم کے درمیان طے
پا جانے والے معاملات......

150
## شکار
عائشہ نصیر

جدید فیشن زدہ معاشرے میں مرد اور عورت
کے تعلق کی دل شگاف پیچیدگیاں

171
## لاپتا
محمد فاروق انجم

اپنے ہی لہو سے ہاتھ سرخ کرنے
والے والدین کا سودائے جنوں......

## تراش خراش
ادارہ و قارئین

اقتباسات گدگدیاں مسکراہٹیں اور قہقہے
سب کچھ آپ کی تفریح طبع اور توضع کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

# چیلنج، نکتہ، چیلنج

مدیر اعلیٰ

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

مارچ 2026ء کا تیسرا شمارہ تمام تر تابانیوں کے ہمراہ حاضر ہے۔ ماہِ رمضان کی پُروقار اور مبارک ساعتیں گزر رہی ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں بے حساب جبیں سجدہ ریز ہیں...... اللہ تعالیٰ ان کے سجدوں...... دعاؤں...... حاجتوں کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آخری عشرے کی طاق راتوں کا آغاز ہوا چاہتا ہے...... یا اللہ اپنے کرم سے...... اپنی مہربانی سے دنیا بھر میں جہاں جہاں اہلِ اسلام بستے ہیں، ان کی حفاظت فرما...... خاص طور پر وطنِ عزیز کی سلامتی برقرار رہے...... پاکستان کے اندرونی معاملات جو نہایت ابتری کا شکار ہیں۔ سیاسی نظام سے لے کر عدالتی نظام کی ٹوٹ پھوٹ کو پائیدار...... باضمیر ہاتھوں میں منتقل فرما۔ اس ماہِ مبارک میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ماضی پر نظر ڈالیں تو کل کی سی بات لگتی ہے...... جس وقت محمد علی جناح برطانیہ میں مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے میں مصروف تھے۔ اسی وقت ہندوستان کے شہر الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال ہندوستان کے اندر ایک مسلم ریاست کے قیام کی بات کر رہے تھے۔ کانگریس اور انگریز سرکار کے رویّوں نے مسلمانوں کو باور کرا دیا تھا کہ انہیں اس ملک میں اکثریت کے تابع ہو کر رہنا پڑے گا۔ اس طرزِ عمل کا ایک ہی جواب تھا...... مسلمانوں کو منظم کیا جائے۔ 22 مارچ 1940ء میں مسلم لیگ نے لاہور کے منٹو پارک میں تاریخی جلسہ کیا۔ یہی وہ تاریخی اور یادگار جلسہ تھا جہاں قراردادِ پاکستان کا اعلان کیا گیا۔ 23ء مارچ کی تاریخ ہر سال یاد دلاتی ہے کہ ارضِ پاکستان کو حاصل کرنے میں ہزارہا مسلمانوں نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ جان و مال کی اَن گنت قربانیوں کے بعد وطن کی مٹی نصیب ہوئی تھی۔ ہر سال ان باتوں کو دہرایا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ ہم اس کی قدر کریں۔ دل و جان سے اس کی سلامتی کو برقرار رکھنے میں اپنا مثبت کردار ادا کریں۔ جاتے جاتے آپ سب کو ہماری جانب سے عید کی ڈھیروں مبارکبادیں۔ اللہ کرے سب کے چہروں پر مسکراہٹ ہو، چاند کی چمک ہو...... خوشیوں کی بہار ہو...... ہر گھر میں ہنسی کی پکار ہو...... سب کے لیے یہ عید یادگار رہو۔

قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ روز بروز بڑھتی ہوشربا مہنگائی کے پیشِ نظر ادارے کے معاملات چلانا مشکل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا آئندہ ماہ اپریل سے پاکیزہ، سرگزشت، سسپنس اور جاسوسی کی قیمت 250 روپے مقرر کی گئی ہے۔ اس بارِ گراں پر قارئین سے معذرت......

کہروڑ پکا ضلع لودھراں سے دانیال حسن چغتائی تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ”امید ہے کہ جاسوسی کے پڑھنے والے اور ادارتی عملہ سب خیریت سے ہوں گے۔ کچھ غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر بزم میں حاضر ہوں۔ جاسوسی ڈائجسٹ کے فروری 2026ء کے شمارے کا سرورق فنکارانہ ترتیب اور رنگوں کے انتخاب سے پُراسرار کہانی کا منظر پیش کرتا نظر آیا۔ سرورق کے بالائی حصہ پر فکرمند مرد کا چہرہ دکھایا گیا ہے جس کے تاثرات گہری سوچ اور چھپے ہوئے راز کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ درمیانی حصے میں پُرکشش خاتون کا چہرہ اور ساتھ جلتی ہوئی موم بتی جو محبت، انتظار یا کسی سلگتے ہوئے سسپنس کی علامت معلوم ہوتی ہے۔ زیریں حصے میں لکڑیوں کے ڈھیر یا تباہ شدہ عمارت کا ملبا دکھایا گیا ہے جو ممکنہ طور پر کہانی میں آنے والے کسی حادثے یا مہم جوئی کا پیش خیمہ ہے۔ خطوط کی دنیا کی بات کی جائے تو مختصر اداریہ میں رمضان المبارک کی آمد اور دنیا میں ہونے والے واقعات کے حوالے سے مختصر تجزیہ پڑھنے کو ملا۔ محمد اقبال، شاہدہ مختار، حنا عمران اور رفعت مقصود کے خطوط بہت دلچسپ رہے۔ اِک طلسمِ خوش جمال جاسوسی گروپ آف پبلی کیشن کے بانی معراج رسول صاحب کی وفات حسرت آیات کے حوالے سے مختلف لوگوں کی آرا کا سلسلہ رہا۔ وہ جو شمع جلا کر گئے ہیں وہ ان کے درجات کی بلندی کا سبب رہے گی۔ سرکتے لمحے امجد رئیس کی فوجی پس منظر کی ترجمہ تحریر کہ جس میں وقت کی تیز رفتاری کو موضوعِ بحث بنایا گیا۔ موقع پرستی شاید ایسے ہی ہوتی ہے یا کام نکلنے کے بعد بھی لوگ ایسے ہی پھینک دیے جاتے ہیں۔ لی چائلڈ کے 61 گھنٹے میں بھی وقت سرک رہا تھا۔ برف پوش وادی میں ریچر کے لیے بھی زندگی اور موت کا لہو رنگ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ سنسنی خیزی پر مبنی طویل تحریر رہی۔ ایمان فروش اسما نوشین کی یومِ کشمیر کے پس منظر میں لکھی تحریر کہ اپنے ہی لوگ جب غداری کرتے ہیں تو پھر مبین ملک جیسے لوگ پھانسی کے پھندے پر چڑھ جاتے ہیں لیکن ظلم کی حد ہوتی ہے اور یہ طویل رات بھی ختم ہوگی اور کشمیر آخرکار آزاد ہو کر رہے گا۔ خونی اضطراب، مظہر سلیم ہاشمی کی خوفناک تحریر، فالکنر اور ایشر کے درمیان تو اعتماد کا رشتہ قائم تھا لیکن اس کے باوجود ماضی کا جرم جب سامنے آیا تو ایشر کو اتنی سخت سزا ملی جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ سحر طراز عائشہ نصیر کی ترجمہ تحریر کہ انجان لوگوں کی مدد کے لیے بہت کم لوگ تیار ہوتے ہیں۔ آری کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا جو اپنی ہپناٹزم کی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ سربکف طاہر جاوید مغل

کی طویل تحریر کا گیارہواں حصہ بھی اس شمارے کی زینت بنا نظر آیا چونکہ پچھلی اقساط کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے تو اس پر بات کرنا مناسب
نہیں سمجھتا۔ مکمل ہونے کے بعد ان شاء اللہ اکٹھا پڑھوں گا۔ امید فیضان مسعود کی سائنسی درس کی کہانی کہ جس میں تجربات ایک کے بعد ایک
حیرت زدہ کرتے چلے گئے۔ تحریر کا پلاٹ تو اچھا رہا لیکن یہ سمجھ نہیں آسکی کہ طبع زاد ہے یا ترجمہ ہے کیونکہ بہت سی جگہوں پر ربط بہت کمزور نظر
آیا۔ بہرحال لکھنے کا ہنر بہت اچھا جانتے ہیں۔ امید ہے کہ مستقبل میں جو بھی کہانی لکھیں گے وہ اس سے قدرے بہتر ہوگی۔ ذہنی رو، جاوید بسام
کی ترجمہ تحریر جس میں اس بات کا اظہار رہا کہ ہر شعبے میں ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں اور یہی پھر دشمنی میں بدل جاتا ہے۔ زندگی کے
ہنگاموں میں مشکل ترین کاموں سے واسطہ پڑتا ہے اور خود کو بچانا بھی ضروری ہوتا ہے مگر کچھ لوگ شیزل رائس کی طرح مشکل پسند ہوتے ہیں جو
کسی کو رعایت دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ رائس کی عادت کو سمجھنا مشکل تھا۔ اس کی ذہنی صلاحیت اسے دوسروں سے جدا رکھتی تھی۔ قسط وار سلسلوں
میں دوسری تحریر حسام بٹ کی دہر رہی۔ اس سلسلے کی یہ چوالیسویں قسط رہی۔ پچھلے واقعات کا علم نہ ہونے کی بنیاد پر اس پر بھی بات کرنا مناسب
نہیں۔ بدلہ عمران قریشی کی گھریلو طرزِ زندگی کی تحریر کہ جس میں طیبہ اور حمزہ دونوں ہی سخت جذبات کے حامل تھے۔ ازدواجی زندگی میں کسی ایک
کو قربانی دینا پڑتی ہے تب گاڑی چلتی ہے۔ دونوں تلخ جذبات کے ساتھ اخلاقی علت میں بھی مبتلا تھے، پھر درمیان میں نشا آگئی اور یوں یہ
جذبات گھر ٹوٹنے پر منتج ہوئے۔ خلیل جبار کی کہانی عزت کی زندگی مجرم کے ضمیر کی بیداری اور جرم کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی جستجو کا خوب
صورت سفر تھی۔ مصنف نے ڈیوڈ کے کردار کے ذریعے یہ پیغام دیا ہے کہ اگر انسان سچے دل سے تائب ہونا چاہے تو قدرت خود اس کے لیے
راستے بنا دیتی ہے۔ مظہر حسین کی تحریر قاتل ڈاکٹر جرم و سزا اور انسانی نفسیات کے گرد گھومتی بہترین کہانی ہے۔ ڈاکٹر پال لینگ کے کردار کے
ذریعے یہ دکھایا ہے کہ مجرم کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو، قدرت کا انتقام اس سے کہیں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ پیشہ ور قاتل اپنی ہی ہوشیاری کے جال میں
پھنس جاتا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی یعقوب بھٹی کی کہانی نیلگری سنسنی خیز، پُراسرار اور جذباتی طور پر مہم جوئی کی داستان۔ نانگا پربت کے برفانی
ویرانوں میں کھوئی ہوئی پرانی، پوشیدہ وادی اور اس کی پُراسرار مخلوق نیلگری کے گرد گھومتی تحریر۔ مقامی لوک داستانوں، ہمالیائی بلندیوں کی
وحشت، انسانی لالچ، خوف، امید اور باپ بیٹے کے رشتے کو بڑی خوب صورتی سے ملایا گیا ہے۔ مقامی ثقافت، زبان، جڑی بوٹیوں کی روایات
اور برفانی تیندووں کی تصویر کشی میں بہت عمدہ مہارت دکھائی ہے۔ شجاع سد پارہ، وارث، کیرولینا اور یادو نا قابلِ یقین محسوس ہوتے ہیں۔
سرورق کی دوسری کہانی جسے عبدالرب بھٹی نے تحریر کیا ہے۔ آثارِ قدیمہ، زیرِ زمین سرنگیں، قدیم خزانے، بھوت پریت، لالچ اور پُراسرار حسینہ کی
روح کو ایک ہی ڈور میں پرو دیا گیا ہے۔ مستونگ کے خشک، سفید چٹانوں والے، سرد راتوں والے منظر بہت مؤثر طریقے سے پیش کیے گئے
ہیں۔ چیخوں کی بازگشت، چمکیلے فاسفورس ذرات، سرکٹی عورت کا ڈراما، تاریک سرنگیں، پوٹالا محل کی راہداریاں سب مل کر خوف اور تجسس پیدا کرنے
میں کامیاب رہے۔ یانگ شوکی روح کو خوبصورتی، اداسی اور خطرے سے جوڑا گیا ہے۔ یہ اسی طرز کی کہانی ہے جسے پڑھ کر رات کو بجلی چلی جائے
تو روشنی جلانے سے پہلے ایک لمحے کو ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور شاید یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ تبصرہ تمام ہوا۔ ایک دو تحریریں جاسوسی
کے لیے ارسال کی ہیں۔ امید ہے کہ آنے والے مہینوں میں جاسوسی میں اشاعت پذیر ہوں گی۔''

کراچی سے محمد اقبال اپنی پسند، ناپسند کا اظہار کرتے ہیں ''ماہ فروری کا ڈائجسٹ اپنے وقتِ مقررہ پر حاصل ہوگیا۔ ٹائٹل دیکھ کر ایسا لگ
رہا ہے کہ تین مختلف ٹائٹلو کو یکجا کر دیا گیا ہو۔ بہرحال اچھا لگ رہا ہے۔ فہرست کا انداز بھی عمدہ ہے۔ یعقوب بھٹی کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس بار
اداریے نے افسردہ کر دیا۔ سانحہ گل پلازا نے بہت تکلیف پہنچائی۔ کتنی ہی انسانی جانوں کا زیاں ہوا، لوگوں کے کاروبار تباہ ہوئے، سیکڑوں
گھروں کے چولھے بجھ گئے، اللہ سے دعا ہے کہ مرحومین کے درجات بلند فرمائے، اور لواحقین کو اس کا بہترین بدل عطا ہو، آمین۔ خطوط کی محفل
میں محمد حسنین اپنے تیکھے جملے اور حملے کے باعث چھائے ہوئے ہیں اور ماشاء اللہ پہلے نمبر پر موجود ہیں مبارکاں جی۔ باقی تمام ممبران کے تبصرے
بھی عمدہ رہے۔ اِک طلسم خوش جمال میں معراج رسول (مرحوم) کے بارے میں رائٹرز کے خیالات سے معراج صاحب کی شخصیت کے مختلف
پہلوؤں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ امجد رئیس کی سرکتے لمحے واقعی اپنے نام کی طرح عمدہ ترجمہ کہانی رہی۔ جاسوسی کے مزاج کے
حساب سے اپنے اندر بھرپور سسپنس اور تھرل لیے ہوئے تھی۔ برف پوش وادی میں خونی کھیل جاری تھا۔ آخر تک کہانی میں دلچسپی برقرار رہی،
ویلڈن امجد رئیس۔ عمران قریشی کی تحریر بدلہ ہمارے معاشرے کی بدصورتی کو اجاگر کرتی ہوئی اپنے انجام کو پہنچی۔ سبق یہی ہے کہ اللہ کے بنائے
ہوئے قواعد کی پاسداری کرتے ہوئے میاں بیوی ایک دوسرے کا احترام کریں۔ زبردستی کے رشتے کو چلانے کی کوشش نہ کریں۔ جس کا ایسا انجام
بھی ہوسکتا ہے۔ طیبہ اور حمزہ دونوں زندگی کے کس موڑ پر پہنچ گئے۔ یعقوب بھٹی نیلگری کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت عمدہ تحریر۔ نانگا پربت کے
برفانی پہاڑوں پر گامزن مہم جوؤں کی سنسنی خیز رُوداد بہت عمدگی سے بیان کی گئی۔ تلاشِ راہ، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تلاشِ راہ میں پہاڑوں کے
پُراسرار خزانے کی تلاش و جستجو کا احوال بھی عمدگی سے پیش کیا گیا۔ مظہر حسین قاتل ڈاکٹر لے کر موجود ہیں۔ ایک سنسنی خیز تحریر پڑھنے کو ملی جس میں
ڈاکٹر پال لینگ کی چال بازیاں دکھائی ہیں مگر خونِ ناحق رائگاں نہیں جاتا بالآخر جرم ثابت ہو ہی جاتا ہے۔ مظہر سلیم ہاشمی کی خونی اضطراب بھی ایک
اچھی تحریر تھی۔ عائشہ نصیر کی سحر طراز بھی ایک متاثر کن تحریر رہی۔ فیضان مسعود کی امید بس مناسب ہی لگی۔ کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔ طاہر جاوید مغل

کی سربکف کی اس قسط کو پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ کہانی میں بھرپور ایکشن دیکھنے کو ملا، نئے نئے انکشافات ہوئے۔ بالآخر تابش اور شاہ زیب نے دشمنوں پر ہلّا بول دیا۔ جہاں نئی پارٹی نے درمیان میں آکر مزید سنسنی پیدا کردی، بھرپور ایکشن ہوا۔ خون خرابا ہوا لیکن تابش اور شاہ زیب کا ان کاؤنٹر اسپیشلسٹ سے براہِ راست ٹاکرا نہ ہوسکا۔ قسطینا کی انٹری بھی اچھی لگی۔ دوسری جانب عمران نے سب کو حیران کردیا۔ یہ قسط بہت شاندار رہی۔ دہر کی چوالیسویں قسط کے ساتھ حسام بٹ حاضر ہیں۔ کہانی عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ پاکٹ سائز ساکورا کی مدد سے جاسم کو کافی آسانی ہوگئی دشمنوں سے نمٹنے میں۔ اب تو بس ڈینئل کاری اور اس کے خاص الخاص براخا کے بھائی اکمل تھیوڈور سے جاسم کے سامنے کا انتظار ہے۔ آخر میں تمام مسلمانوں کو ماہِ رمضان کی مبارک باد قبول ہو۔“

ملتان سے محمد حسنین کے سوالات وابہام ”جاسوسی ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ پانچ فروری کو ملا۔ یوم کشمیر کے حوالے سے تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن ٹائٹل دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس مرتبہ ٹیڑھے میڑھے کارٹون نہیں تھے اور نہ ہی حسینہ کے نام پر ایک چڑیل مجھے گھور رہی تھی۔ (اچھا تو تمہیں چڑیلیں گھورتی ہیں......) ٹائٹل کچھ دیکھا دیکھا تھا جیسے بچپن میں کہیں دیکھا ہو (بس بچپن تک محدود رہو پچپن تک نہ جانا) لیکن بہرحال خوب صورتی کمال کی تھی۔ اداریہ لاجواب تھا نئے سال کی آمد کے ساتھ ہی ایک بہت بڑے سانحے کے اوپر دل کھول کر باتیں کی گئی تھیں اور یہ حقیقت ہے کہ سانحہ گل پلازا پر ہر پاکستانی کی آنکھ نم ہے۔ چینی نکتہ چینی میں خود کو پہلے نمبر پر دیکھ کر جو خوشی ہوئی، اس کو الفاظ میں بیان بالکل بھی نہیں کیا جاسکتا (پھر کس میں کیا جاسکتا ہے؟ مرضی ہے۔ مٹھائی میں کردو......اور......) بس یہی کہہ سکتا ہوں آپ کا شکریہ۔ کراچی سے محمد اقبال کی توجہ طلب بات پڑھنے کے بعد خوشی ہوئی کہ وہ اتنی توجہ سے کہانیاں پڑھتے ہیں اور اس کے بعد پھر اتنا دلچسپ تبصرہ بھی لکھ بھیجتے ہیں۔ (کوئی شک ہے؟) کراچی کی ہی شاہدہ مختار کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ غوث محمد کی جاسوسی سے محبت پڑھ کر دل خوش ہوجاتا ہے کہ آج کے دور میں بھی اتنی توجہ محنت اور کوشش سے جاسوسی کو حاصل کرنے والے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں۔ (جی بالکل) اسلام آباد کی حنا عمران کی نپی تلی گفتگو لاجواب تھی مزہ آیا لیکن کون سے زمینی حقائق کی بات کررہی ہیں جن کو میں نے نظر انداز کردیا؟ کامران اور رفعت مقصود کی باتیں بھی پسند آئیں۔ رفعت مقصود سے یہی کہنا چاہوں گا کہ تبصرہ تو آپ خوب کرتی ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ تھوڑا طویل کیا کریں۔ ایڈیٹر لبنیٰ خیال کی بہترین کاوش اِک طلسم خوش جمال پڑھ کر دل بیک وقت اداس اور خوش ہوگیا۔ اداس اس لیے کہ اب معراج رسول جیسی ہمہ صفت شخصیت ہم میں موجود نہیں رہی۔ اور خوشی اس بات کی تھی کہ عذرا رسول صاحبہ ان کی کاوش کو آگے بڑھا رہی ہیں اور معراج رسول کے رائٹرزان کے بارے میں کتنے اچھے انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ بہترین انداز میں...... معراج رسول کی شاندار شخصیت کو نئے پرانے رائٹرز کا دلکش انداز میں...... دیا گیا خراجِ تحسین زبردست رہا۔ آپ کی انہی کاوشوں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اپنے محسنوں کو آپ بالکل بھی نہیں بھولتے۔ لی چائلڈ کے شہرہ آفاق کردار جیک ریچر کو امجد رئیس نے سرکتے لمحے میں خوبی سے پیش کیا۔ سنسنی خیز کہانی نے کئی موڑ لیے ہیں اور آخر میں کامیابی جیک کو ہی ملی۔ امجد رئیس کو ہر ماہ لکھنا چاہیے۔ کشمیر کے حوالے سے اسماء نوشین کی ایمان فروش ایک اچھی کاوش کہی جاسکتی ہے۔ کہانی پسند آئی اور پڑھنے میں بھی مزہ آیا۔ (شکریہ) مظہر سلیم ہاشمی نے خونی اضطراب میں خوب سسپنس والا ماحول بنایا۔ فالکنر سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ محبت میں اس حد تک بڑھ جائے گا۔ (پھر کس حد تک بڑھنا چاہیے تھا، وضاحت) عائشہ نصیر نے سحر طراز لکھ کر پچھلے ماہ کی کسر نکال دی۔ کہانی بھی بہترین تھی اور ترجمہ بھی نہایت خوبی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ پچھلے ماہ کے مقابلے میں بات کریں تو سربکف کی قسط بھی ہر لحاظ سے لاجواب رہی۔ طاہر جاوید مغل صاحب نے کہانی میں اتنے ٹوئسٹ اور موڑ شامل کیے اور رفتار اتنی تیز رکھی کہ جیسے ہمیں سانس لینے کا موقع بھی نہیں دینا چاہ رہے تھے۔ ماہین اور اشفاق والا معاملہ یقیناً کوئی غلط فہمی ہے لیکن عمران کی جانب سے اتنا جذباتی اور بے وقوفانہ ردِعمل سمجھ سے باہر ہے۔ قسطینا کی آمد نے دل خوش کردیا۔ آتے ساتھ ہی اسے زبردستی ایکشن میں بھی شامل ہونا پڑا جو کہ میرے لیے خوشی کا سبب تھا۔ (کیوں؟) کالا جانور تو جیسا مرضی کردار ہو لیکن قسط کے اختتام پر پروفیسر کی تابش کے فون نمبر پر اچانک کال اور پیشگوئیاں پڑھ کر سنسنی سی جسم میں دوڑ گئی۔ فیضان مسعود کو پہلی مرتبہ پڑھا اچھی کوشش تھی۔ جاوید بسام نے ذہنی رو میں ٹیلی پیتھی کے حوالے سے کچھ واقعات کو بیان کیا جو کہ کافی دلچسپ رہے۔ کچھ گنجلک پن کم ہوتا تو بہتر رہتا۔ (وہ ان کی شخصیت میں رچا بسا ہے) حسام بٹ نے دہر کی تازہ قسط میں تھوڑی اسپیڈ بہتر رکھی تو اچھا لگا۔ ساکورا کو بھی حسبِ توقع جاسم سے محبت ہوگئی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ اس نئی ہیروئن کی موت کس طرح سے ہوگی۔ ٹیلی پورٹیشن سے محروم ہونے کے باوجود جاسم کیسے سوالبار سے نکلتا ہے، یہ دیکھنے سے تعلق رکھے گا۔ عمران قریشی کی بدلہ کافی سینس لیس قسم کی کہانی تھی۔ کہانی کا بیانیہ اور واقعات انتہائی کمزور پلاٹ پر بُنے گئے تھے جو کہ انتہائی غیر حقیقی لگے۔ اختتام اچھا تھا لیکن اگر اس کا پہلا حصہ بھی بہتر ہوتا تو کہانی پڑھنے میں لطف آتا۔ خلیل جبار نے عزت کی زندگی لکھ کر اس مرتبہ مایوس کیا۔ یہ بہت اچھا لکھ سکتے ہیں پتا نہیں کیوں ایسی کہانی پیش کی۔ مظہر حسین نے قاتل ڈاکٹر میں ایک پرانے واقعے کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ کہانی میں سسپنس کی بھی کمی تھی اور وہ اتنی اچھی بھی نہیں لگی۔ سرورق کی کہانیوں میں اس مرتبہ بھٹی صاحبان کا راج ہے۔ دونوں اپنے اپنے انداز میں لکھتے ہیں اور امید ہے اس بار بھی ویسا ہی لکھا ہوگا جیسا وہ ہر بار لکھتے ہیں۔ رمضان کی مصروفیات کی وجہ سے ابھی تک کہانیاں نہیں پڑھ پایا امید ہے اگر پڑھوں گا تو پھر ان کے اوپر بھی ضرور اپنی رائے دوں گا۔ آپ کو رمضان مبارک اور ساتھ ساتھ عید کی بھی ایڈوانس مبارکباد۔ مارچ کے شمارے کا خصوصی انتظار رہے گا۔“

قیدی مبشر امیر پشاور سینٹرل جیل سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہیں "السلام علیکم ماہ فروری کا شمارہ 10 تاریخ کو ہی مل گیا تھا ٹائٹل اچھا تھا شوگر ڈاٹ شوگر میں گل پلازا کے حوالے سے تبصرہ کیا گیا تھا لیکن میں ایک اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ سیاست دانوں اور حکمرانوں کو ہر چیز کے لیے ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ ہر سانحے پر انہیں ہی الزام دیتے ہیں لیکن مجھے کوئی یہ بتادے کہ کیا یہ پلازا اتھارٹی یا ہر حق میں چل رہا تھا یا گورنمنٹ کی تحویل میں کام کر رہا تھا یا اس پلازے میں سرکاری دفاتر تھے۔ میرا خیال ہے بالکل بھی نہیں بلکہ یہ صرف اور صرف عوام کی ہی پراپرٹی تھی۔ حکومت سے زیادہ ہم خود ہی ذمے دار ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جہاں اس پلازے سے نکلنے کے راستے تھے وہاں پر گورنمنٹ نے نہیں بلکہ عوام نے دکانیں بنائی ہوئی تھیں۔ اب اگلا اسلامی مبارک مہینہ رمضان المبارک کا ہے جس میں ہم خصوصاً تاجر حضرات تمام ضروری اشیا کو اسٹاک کرلیں گے اور 100 روپے والی چیز کم سے کم 400 روپے میں بھی مشکل سے ملے گی۔ یہ تو حالت ہے ہماری اور ہم ہیں کہ حکومت کو ہی گالیاں دیتے رہتے ہیں (اگر قانون کی عمل داری ہو تو کوئی اشیا مہنگے داموں فروخت نہ ہو) میری باتوں سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو ان سے پیشگی معذرت کرتا ہوں خیر پچھلے مہینے تبصرہ نہ کرسکا جس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ پاک نے مجھ سے میرا سب کچھ واپس لے لیا یعنی میری والدہ میری جنت کو اپنے پاس بلا لیا۔ اللہ میری والدہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور میری والدہ کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے باغ بنائے، (آمین)۔ ملتان سے محمد حسنین کو کرسیِ صدارت سنبھالنے پر بہت بہت مبارک۔ ان کی مایوسی بھری باتیں تو پڑھیں لیکن شاید اس میں ادارے کا قصور کم ہی ہے کیونکہ مہنگائی ہی بہت ہے اس وجہ سے کاغذ کی کوالٹی میں فرق آجاتا ہے باقی کانٹ چھانٹ والی بات بھی صحیح کہی کہ بڑے بڑے ڈائجسٹوں میں اتنا تو چلتا ہی ہے۔ تمام کہانیوں پر بہت ہی شاندار تبصرہ تھا لیکن بھائی صاحب نے تبصروں پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ کراچی سے محمد اقبال کا بھی شکریہ جنھوں نے میری آمد پر خوش آمدید بھی کہا، باقی ان کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ کراچی ہی سے شاہدہ صاحبہ کا بھی خوش آمدید کہنے پر شکریہ۔ غوث بخش صاحب آپ کا بھی شکریہ بلکہ باقی تمام لوگوں سے کچھ زیادہ ہی شکریہ کیونکہ آپ وہ واحد ہیں جنھوں نے تحریر کے ذریعے بھی مجھے دعائیں دیں شکریہ بھائی اور آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار ہی تھا۔ اسلام آباد سے حنا عمران صاحبہ کی مہربانی جنھوں نے اس قابل سمجھا کہ میں نے بھی ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ باقی تمام کہانیوں پر ان کا تبصرہ بھی بہترین تھا۔ حیدر آباد سے عاتکہ صاحبہ اور سیالکوٹ سے رفعت صاحبہ کا تبصرہ بھی شاندار تھا اور آخر میں وہ نام بھی پڑھے جن بے چاروں کو محفل میں شامل ہونے کا شرف نہ مل سکا لیکن ایڈیٹر نے ان کے لیے محبت نامے کا لفظ لکھ کر بے چاروں کے زخموں پر مرہم ضرور رکھا ہے میرے جیسے پڑھنے والے جو معراج صاحب کی شخصیت کے کچھ پہلو سے ناواقف تھے، وہ سب بتا کر نوازش فرمادی۔ بہترین کاوش تھی۔ آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں باقی ابھی تک صرف دو کہانیاں ہی پڑھی ہیں۔ سب سے پہلے تو دہر پڑھی۔ وہ تو ماشاء اللہ اپنے مکمل جوش اور جوبن پر جاری وساری ہے جاسم نے دنیا کے ٹھنڈے ترین علاقے میں دشمن کو ناکوں چنے چبوا ڈالے لیکن ایک دکھ بھی ہے کہ ہمارے ہیرو سے ٹیلی پورٹ کی صلاحیت چھین لی گئی ہے۔ جاپانی لڑکی کمال کی ثابت ہوئی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ جاپانی لوگوں میں منافقت بالکل بھی نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ وعدوں کے سچے ہوتے ہیں۔ ٹائم کے پابند ہوتے ہیں اور جھوٹ سے بہت دور رہتے ہیں۔ خیر کہانی آگے بھی اسی طرح جاری رہے گی اس کے بعد بدلہ پڑھی۔ بدلے میں بے چارے مظلوم اور معصوم شوہر کا حشر پڑھ کر دکھ بھی ہوا اور ترس بھی آیا لیکن میرے خیال میں کچھ قصور گھر والوں کا بھی ہوتا ہے کیونکہ انہی کی شہ پر لڑکے یا لڑکیاں اپنے ہمسفر کو تگنی کا ناچ نچاتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ اس طرح ہم کسی پہ حکمرانی کرسکتے ہیں۔ اختتام ایسا ہی ہونا تھا۔ بہترین اختتام ہوا ہے باقی شمارہ ابھی تک نہیں پڑھا۔ امید ہے ایسی ہی بہترین کہانیاں ہوں گی۔ ایک دفعہ پھر سے آپ سب سے التماس ہے کہ میری مرحومہ والدہ محترمہ کے لیے دعائے خیر فرمایئے گا اللہ آپ سب کے والدین کا سایہ آپ سب کے سروں پر ہمیشہ قائم ودائم رکھے امین ثم آمین۔" (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت اور آپ کو صبر عطا فرمائے)

کراچی سے شاہدہ مختار کی دلچسپی "فروری کا شمارہ اس بار کچھ دیر سے ملا۔ ٹائٹل خوب صورت لگ رہا ہے اور کچھ منفرد بھی۔ ایک صاحب گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں تو دوسری جانب خوب صورت حسینہ ٹائٹل موم بتی کو ترچھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹیلی پیتھی کی کوئی مشق کر رہی ہو۔ تیسرے حصے میں کسی خوب صورت وادی کا منظر پیش کیا گیا۔ تمام قارئین کو رمضان... مبارک ہو۔ اللہ پاک سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم سب ماہِ رمضان میں بھرپور عبادت کریں اور اللہ کو راضی کریں، آمین۔ محفل اپنے عروج پر ہے۔ محمد حسنین کا تبصرہ پڑھ کر ہمیشہ اچھا لگتا ہے، مبارکاں جی پہلے نمبر پر موجود ہونے پر۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے ہیں۔ اِک طلسم خوش جمال پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ معراج رسول صاحب کی شخصیت کے بارے میں مختلف آرا پڑھنے کو ملیں۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی سربکف پڑھی۔ اس قسط میں کہانی اپنے عروج پر نظر آئی۔ سسپنس، بھرپور ایکشن سب کچھ پڑھنے کو ملا۔ عمران کی عجیب حالت سمجھ سے باہر ہے، وہ ایسا کیوں کر رہا ہے ماہین کے ساتھ۔ ان کاؤنٹر اسپیشلسٹ ولن کی آمد سے کہانی میں اور زیادہ تھرل پیدا ہوگیا ہے۔ تابش اور شاہ زیب کے ایکشن سے زیادہ ساد گروپ نے تھرتھلی ڈال دی اس قسط میں۔ دوسرے نمبر پر دہر پڑھی۔ حسام بٹ بھی خوب سرد ترین وادیوں میں گھما رہے ہیں قارئین کو۔ جہاں جاسم کو ایک اور ہیروئن مل گئی ہے جسے اچھا نام دیا حسام بٹ نے پاکٹ سائز۔ ساکورا بھی جاسم سے متاثر ہے، اور بھرپور طریقے

سے اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ ڈینئل کارمی اپنی جگہ مطمئن ہے کہ وہ تھیوڈور کے ذریعے جاسم پر قابو پالے گا۔ اب آگے کیا پڑھنے کو ملتا ہے۔ یعقوب بھٹی کی تحریر نیلگری اپنے نام کی طرح خوب صورت تحریر رہی۔ اس میں سب کچھ تھا، ثقافت، روایتی جڑی بوٹیوں کے بارے میں اور برفانی تیندوؤں کا خوب صورتی سے ذکر کیا گیا ہے۔ ویلڈن یعقوب بھٹی صاحب۔ عبدالرب بھٹی کی تلاشِ راہ بھی عمدہ تحریر تھی۔ مجھے اس طرح کی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں۔ جس میں پُراسراریت، خوف ناک واقعات اور خزانوں کے بارے میں ذکر ہو۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔“

کوٹری سے حمیرا رفیق کے دعائیہ کلمات ”فروری کا جاسوسی ڈائجسٹ اس بار بھی بھائی کاشف کی بدولت وقت پر مل گیا۔ ٹائٹل بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ٹائٹل کے تینوں پارٹ اپنی اپنی جگہ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ فہرست مناسب لگی۔ اور یعقوب بھٹی کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اداریہ پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ سانحہ گل پلازا نے بہت دکھی کر دیا۔ اللہ پاک خیر کے معاملات فرمائے، ایسے سانحات سے بچنے کی توفیق دے، آمین۔ معراج رسول کی برسی کے حوالے سے اِک طلسمِ خوش جمال عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا۔ رائٹرز نے اپنے اپنے انداز میں معراج رسول صاحب (مرحوم) کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ عذرا رسول صاحبہ، معراج رسول (مرحوم) کے مشن کو اچھے طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں، اللہ پاک انہیں صحت والی زندگی عطا فرمائے، آمین۔ امجد رئیس کا نام فہرست میں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ سر کٹے لمحے کے نام سے بہترین ترجمہ تحریر پڑھنے کو ملی۔ تمام تر کرداروں کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا۔ حالات و واقعات کو خوب صورتی سے پیش کیا گیا، ویلڈن امجد رئیس صاحب۔ یعقوب بھٹی کی نیلگری دوسرے نمبر پر پڑھی۔ کہانی کا ٹیمپو بہت عمدہ تھا۔ نانگا پربت کے برفانی پہاڑوں پر گامزن مہم جوؤں کی سنسنی خیز رُوداد نے واقعی بہت مزہ دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تلاشِ راہ بھی بہت عمدہ تھی پُراسرار خزانے کی تلاش و جستجو کا احوال پڑھ کر مزہ آ گیا، زبردست تحریر رہی۔ عمران قریشی کی بدلہ بھی اچھی لگی۔ اسانوشین کی یوم کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی تحریر ایمان فروش بھی بہت پسند آئی۔ خونی اضطراب مظہر سلیم ہاشمی کی تحریر نے تو ہلا کر رکھ دیا۔ عائشہ نصیر کی سحر طراز بھی پسند آئی۔ طاہر جاوید مغل کی سربکف کی کیا بات ہے۔ اس قسط میں شاہ زیب کی بیوی قسطینا بھی شامل ہو گئی ہے اور اچھے انداز میں ہوئی۔ عمران اور ماہین کے درمیان جو حالات چل رہے ہیں اسے پڑھ کر افسوس ہوا۔ نئے ولن کے آنے سے کہانی میں سنسنی بڑھ گئی ہے۔ دیکھیں اب شاہ زیب اور تابش موت کے درندے سے کیسے بچتے ہیں۔ حسام بٹ کی دہر بھی اچھی چل رہی ہے، جاسم کی ٹیلی پورٹیشن کی صلاحیت ختم ہونے سے اس کے لیے کچھ مسائل تو ہوں گے۔ مگر جی ہیرو ہے کہانی کا کچھ نہ کچھ حل نکال ہی لے گا۔ جاسم کی نئی ساتھی ساکورا بھی کسی سے کم نہیں ہے، اس نے ابھی تک جاسم کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ ڈینئل کارمی کی ہر ٹیم جاسم کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اب تھیوڈور اور ڈینئل کارمی گروپ کی مکمل تباہی کا انتظار ہے۔ تمام جاسوسی پبلی کیشنز اور تمام مسلمانوں کو ماہِ رمضان مبارک ہو، اللہ پاک ہم سب کو اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ دل لگا کر عبادت کرنے اور مکمل روزے رکھنے کی توفیق دے، آمین۔“

سیالکوٹ سے رفعت مقصود کی گتھیاں ”فروری کا جاسوسی ملا۔ جاسوسی پبلی کیشن کے فروری کے دو ڈائجسٹ میں میرا خط نہیں تھا، سوچا کہ شاید اس بار جاسوسی میں بھی خط نہ آئے۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جاسوسی ڈائجسٹ اپنے قارئین کی آرا کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ سرورق کی لڑکی امید کی شمع روشن کر کے کچھ امید افزا باتیں سوچ رہی تھی۔ مرد جاسوس سراغ رسانی کی کچھ گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ ایک طرف کچھ تباہی کے منظر نے سانحہ گل پلازا کی یاد دلا دی۔ اداریہ گل پلازا کے سانحے اور امریکا کی پھنّے خانی کے متعلق تشویشناک تھا۔ محمد حسنین کے تبصرے میں کارٹونی انداز کے لفظ نے ہنسا دیا۔ تبصرے کی پسندیدگی کے لیے محمد اقبال، غوث بخش اور حنا عمران کا شکریہ۔ اِک طلسمِ خوش جمال میں کچھ مصنفوں کی بانی معراج رسول صاحب کی تعریفوں کے گلدستے نے قوتِ شامہ کو معطر کر دیا۔ امجد رئیس کے ناول سر کٹے لمحے کی آخری قسط اچھی رہی۔ اسانوشین کی ایمان فروش نے دکھی کر دیا۔ کشمیری اتنے سال سے آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں، اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں پھر بھی آزادی نہیں مل رہی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی کہانی خونی اضطراب قتل کے عجیب طریقے کی کہانی تھی۔ پاگل تو قاتل بھی تھا جس نے کھوپڑی کو خوش کرنے کے لیے قتل کیا۔ (ہے.....کیا؟) عائشہ نصیر کی کہانی سحر طراز نے کچھ سوچ کی گتھیاں الجھا دی ہیں۔ نینا دوسروں کی مدد کرتی تو اس کی اپنی ٹیم اس کے خلاف ہو جاتی۔ سربکف میں ماہین اور شاہ زیب نے بُرے لوگوں کو پکڑوانے کی بہت کوشش کی لیکن پھر طاقتور بُرے لوگ جیت گئے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ جاوید بسام کی کہانی ذہنی رو میں جب شیزل نے ونٹ کو ذہنی رو سے بھٹکایا اور اس کی جان چھوٹی تو بہت لطف آیا۔ حسام بٹ کے ناول دہر کی اس قسط میں بھی جاسم دشمنوں سے نبرد آزما تھا۔ عمران قریشی کی کہانی بدلہ میں بہت جھگڑالو میاں بیوی تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو تکلیف دینے میں لگے ہوتے تھے۔ طیبہ تو بہت بُری بیوی تھی۔ خلیل جبار کی عزت کی زندگی میں ڈیوڈ کو اسمتھ کی زندگی بچانے کی وجہ سے نوکری مل گئی۔ سرورق کا پہلا رنگ یعقوب بھٹی کی کہانی نیلگری تو عفریت تھی جو ہر مرد کو نگل لیتی تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی تلاشِ راہ ماورائی اور موت کی کہانی تھی، پسند آئی۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

شاہدہ مختار، کراچی۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ زرین خان، پشاور۔ وقار احمد، میرپور خاص۔

# کمین گاہ

پروین زبیر

جذبہ... فطری... قدرتی اور بے اختیار ہوتا ہے... جب لوگ سول سروس میں آتے ہیں تو اُن کے دل میں عوام کی خدمت کا جذبہ شدت سے بھرا ہوتا ہے... ان کے ذہن میں کئی منصوبے ہوتے ہیں اور دل میں پہاڑ جیسی استقامت ہوتی ہے... لیکن ہمارا بیوروکریٹک نظام ایک افسر کو مشینی اندازِ فکر اور کاغذی پیراہن میں ڈھالنا چاہتا ہے... اس کے باوجود جذبۂ بے اختیار کے مالک اس سسٹم میں رہ کر سسٹم کی زنجیروں کو توڑنے کی کوششِ سعی میں لگے رہتے ہیں... لیکن عام لوگوں کی بھلائی کے لیے تو کبھی سکونِ قلب کے لیے تاکہ دل پتھر نہ ہو جائے... کچھ کرپٹ افسر ایسے بھی ہیں... جو اپنے فرائضِ منصبی کامیابی سے کبھی ادا نہیں کرسکے... عوام کے دکھوں اور مسائل کا مداوا نہ کرسکے... سرکاری رفاقت میں شاہانہ زندگی بسر کرتے رہے... انہی در و بام کی غلام گردشوں میں گھومتی... بہتی کہانی کے وہ سربستہ راز جو طشت ازبام نہ ہوسکے...

خوابوں سے کنارہ کش ہوجانے والوں کی آخری خاموش قربانیاں......

گھرے اندھیرے میں یکبارگی آسمانی بجلیوں کے جال سے آسمان جیسے بھر سا گیا۔ تیز روشنی کے کوندوں نے لمحے بھر کو ماحول روشن کیا تو وہ غیرارادی طور پر اس راستے کا نشان دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جسے سڑک کہا جاتا ہے۔ لیکن کہاں؟ پوری زمین پر جیسے سیلاب اُمڈ آیا تھا، سڑک اس میں کہیں کھو گئی تھی۔ پھر ایک کان پھاڑ دینے والی گرج نے اس کے دل کو دھڑکا دیا۔ وہ توازن کھو کر پانی میں گرا۔ اس کے پاس مہلت نہیں تھی کہ رکتا۔ دھواں دار اور طوفانی بارش نے ہر طرف پانی کے پردے سے تان دیے تھے، لیکن وہ جانتا تھا کہ کچھ بھی ہو، قاتل اس کے پیچھے ہیں اور وہ اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اسے کسی بھی طرح بستی تک پہنچنا تھا۔ شاید پھر وہ اپنی جان بچا پاتا۔ وہ بمشکل اٹھا اور ہمت کرکے اس طوفانی بارش کے پانی کو پھلانگتا ہوا، پھسلواں راستوں پر سے گرتا پڑتا آگے ہی آگے بھاگتا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ زندگی اور موت کی آنکھ مچولی ہے۔ اس میں چھپنا اور بھاگنا لازمی ہے۔ ورنہ زندگی کا کھیل ختم ہوجاتا۔ اسے اپنے پیچھے موت کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں اور اس کی ساری زندگی اس کے ذہن کے پردے پر فلم کی طرح چل رہی تھی۔ خاص طور پر پچھلا ایک مہینہ، جو اس کی زندگی میں بڑے بڑے بھونچال لے کر آیا اور اس کے نتیجے میں وہ آج اس چوہا بلی دوڑ میں دوڑ رہا تھا۔

''ولی! اِدھر آؤ۔ بیٹھ کر ناشتا کرو۔'' عبداللہ ہاشم نے اخبار پر نظریں جمائے ہوئے تیزی سے باہر بھاگتے ولی کو آواز دے کر بلایا، تو وہ چونک کر اپنا بیگ کندھے پر ڈالتا ہوا ان کے نزدیک آیا۔

''السلام علیکم بابا جی! آج سورج کہاں سے نکلا ہے کہ آپ مجھے ناشتے پر مدعو کر رہے ہیں۔ سب خیریت ہے نا۔'' وہ ان کے نزدیک آ کر پوچھ رہا تھا۔

''بکواس مت کرو۔ بیٹھ کر ناشتا کرو۔''

''اچ..... چھا.....'' وہ سامنے بیٹھی اپنی سوتیلی ماں اور دونوں سوتیلے بھائی بہنوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو سوتیلی ماں بُرا سا منہ بنا کر اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''تمہاری یونیورسٹی ختم ہوئے بہت دن ہوگئے۔ اب تو ڈگری بھی مل گئی ہے۔ پھر اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟''

''ویری پرسنل۔ پھر بھی بتا دیتا ہوں۔ سارہ کے پاس جا رہا ہوں۔ اُس کا ریسرچ ورک چل رہا ہے، سوچا تھوڑی مدد کروا دوں۔''

''ہاں دوسروں کے لیے ہی کرتے رہنا سب کچھ۔ اپنے لیے بھی اب کچھ کرلو۔ باپ کب تک کما کما کر تمہیں پالتا رہے گا۔''

''مائی اسٹیپ مام میڈم شیما..... میرا باپ تو آپ کو اور آپ کے بچوں کو بھی پال رہا ہے۔ یہ بچے ہیں، پر آپ تو جوان ہیں۔ کب تک میرے باپ پر بوجھ بنی رہیں گی؟ روشن آپا! میرا ناشتا تو ہوگیا۔ مجھے ایک کپ چائے لا دیں۔''

اس نے گھر کی میڈ کو آواز دے کر کہا تو وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی آئی اور جھجکتے ہوئے اسے بتایا کہ چائے کے لیے دودھ نہیں ہے تو اس نے چھوٹے بھائی پانچ سالہ عفان اور تین سالہ زویا کے سامنے رکھے دودھ کے بھرے ہوئے گلاسوں پر ایک نظر ڈالی۔ آنکھوں میں شرارت کی ایک ہلکی سی جھلک لہرائی، اور اس نے عفان کے سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''کوئی بات نہیں۔ آج دودھ سے ہی گزارہ کر لیتا ہوں۔ کل سے چائے کے لیے بچا کر رکھنا۔'' اس کی اس حرکت پر شیما غصے سے چلاتی رہی لیکن اس نے سنی اَن سنی کر دی۔ گلاس خالی کر کے رکھا، اور پھر اٹھ کر جانے لگا تو باپ نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے دیا۔

''تم نے جس امریکن یونیورسٹی میں اسکالرشپ کے لیے اپلائی کیا تھا، وہ منظور ہوگیا ہے اور ایڈمیشن بھی ہوگیا ہے۔ اگلے ماہ کے آخری ہفتے تمہیں جانا ہے۔''

''اچھا..... واؤ۔'' اس نے لفافہ پھاڑ کر لیٹر نکالا۔ خوشی کے آثار چہرے پر نمودار ہوئے۔ جھک کر کاغذ شیما کے سامنے لہراتے ہوئے شریر انداز میں اسے گھورا۔

''خوش ہو جائیں..... آپ کی جان چھوٹنے والی ہے مجھ سے۔ مٹھائی کھلایئے گا سب کو۔ واپسی میں مجھے بھی۔'' وہ ہنسا۔

''زہر نہ کھلا دوں۔ جان چھوٹے بھی.....'' شیما نے غصے میں اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''ٹکٹ کے پیسے تمہیں مل جائیں گے۔ تیاری کر لو۔ بہت مشکل سے ملا ہے یہ اسکالرشپ۔ یونیورسٹی کے ایڈمن ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ کر کے کلاسز کے بارے میں انفارمیشن لے لو اور جانے کی تاریخ بتاؤ تاکہ میں ٹکٹ لے سکوں۔''

''اب امریکا کا ٹکٹ بھی تم ہی اسے لے کر دو گے۔ یہ خود کیوں نہیں کرتا رقم کا انتظام۔ کچھ نہ کچھ تو کرتا ہی رہتا ہے۔ پیسے ہوں گے اس کے پاس۔ خواہ مخواہ اتنے پیسے بھی اس کے اوپر برباد کرنا۔ عفان کا ایڈمیشن بھی کروانا ہے۔ بڑا اسکول ہے۔ داخلے میں بہت خرچ ہوگا۔ اس کے بارے میں بھی سوچا ہے کچھ، کہ کیسے ہوگا؟''

''ارے اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ ماشاءاللہ آپ کے اور آپ کی اولادوں کے اتنے اخراجات ہیں کہ وہ حلال کی کمائی سے تو پورے ہو ہی نہیں سکتے۔ تو بابا کو ھٰذا من فضلِ ربّی کی عادت تو ڈال ہی دی ہے آپ نے۔ ایک بڑا ہاتھ ماریں گے اور ساری فرمائشیں پوری ہو جائیں گی، فکر نہ کیا کریں، بس ذکر کیا کریں۔ ایک ہاتھ مارنے کی دیر ہوگی۔ سب کچھ ٹھیک ہے نا بابا؟'' اس نے ہنستے ہوئے بابا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے آنکھوں میں ہی تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کرو۔ اور جاؤ۔''

''او کے باس!'' وہ اباؤٹ ٹرن ہوا اور گنگناتا ہوا باہر مڑ گیا۔

☆☆☆

ریسرچ لیبارٹری کے خاموش اور خنک ماحول میں وہ مائیکرواسکوپ پر آنکھ رکھے کوئی سلائڈ دیکھ رہی تھی۔

سارہ چند ماہ پہلے ہی امریکا کی ایک اچھی یونیورسٹی سے اپنی ڈگری مکمل کر کے آئی تھی۔ اب یہاں ایم فل کے

ساتھ ساتھ کچھ اہم ریسرچ ورک بھی کر رہی تھی۔ اس خاموش اور پُرسکون ماحول کو اچانک ایک چھوٹی سی دستک نے توڑا۔ اس کے سامنے والی بڑی سی کھڑکی کے شیشے کو کسی نے ہاتھ سے بجایا تھا۔ اس نے نظر اٹھائی تو دوسری جانب اسے ولی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ شیشے پر اپنی ناک کو چپکائے اسے دیکھ رہا تھا اور ناک چپٹی ہو کر شیشے پر کچھ عجیب سی شکل بنا رہی تھی۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

اسے ہنستے دیکھ کر ولی نے اندر آنے کا اشارہ کیا تو سارہ نے اسے روکا اور خود باہر آنے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔

''ایک تو مجھے تمہاری یہ عجیب و غریب قسم کی ریسرچ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ بھلا پانی پر کیا تحقیق کرنا۔ وہ تو بس پانی ہے۔ اور ہر صورت میں پانی ہی رہے گا۔ تمہاری تحقیق اسے پیٹرول تو بنانے سے رہی.....''

''پانی ہماری زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ ہمارے دریاؤں میں کب اور کتنا پانی آئے گا، اسے محفوظ کرنا، پھر آبادیوں میں سپلائی کرنا، اور سب سے زیادہ اس کا اہتمام کہ اس سپلائی کیے جانے والے پانی کی کوالٹی کیسی ہے۔ مون سون میں صورتِ حال کیا ہو گی۔ گلیشیئرز کس ٹیمپریچر پر کتنا پانی دریاؤں میں ڈالیں گے۔ اسے میج کرنا اور مسلسل مانیٹر کرنا۔ یہ ہے میری ریسرچ۔ اور یہ تمہارے جیسے بدھو کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس لیے اپنے ننھے منّے سے دماغ پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ یہ بتاؤ! آج صبح صبح آمد کیسے ہوئی؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟''

کیوں.....؟ کوئی خاص بات ہو تب ہی میں تم سے ملنے آ سکتا ہوں۔ عام حالات میں نہیں۔ کیوں بھئی؟ پہلے تو تم امریکا میں تھیں، تو میں نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ اب آ گئی ہو تو میں کہیں کے لیے بھی نکلوں۔ سارے راستے تمہاری ہی طرف آتے ہیں اور میں تمہارے پاس پہنچ جاتا ہوں۔''

''بس۔ شروع ہو گئی لفاظی۔ تمہیں پتا ہے کہ میں اس وقت لیب میں ہوتی ہوں پھر اتنی صبح آنا۔ کچھ مشکوک لگتا ہے۔ ضرور کچھ خاص ہوا ہے۔ ہے نا؟''

''صبح صبح بیگم ہاشم سے پنگا ہو گیا۔ میں نے ان کے لاڈلے کے سامنے سے دودھ کا گلاس اٹھا کر پی لیا۔ بس جی آ گئی قیامت۔ اُن کے منہ سے الفاظ کی شکل میں کلاشنکوف کا پورا برسٹ فائر ہوا۔ اور لفظوں کی گولیاں میرے جگر کے آر پار ہو گئیں۔ انہی کی کڑوی کسیلی باتوں کا ناشتا کر کے آ رہا ہوں اگر پیسے ہوں تو ناشتا کروا دو۔ ورنہ میں یہیں سو جاؤں گا سمجھوں گا کہ ابھی صبح نہیں ہوئی ہے۔''

اس کی بات سن کر سارہ ہنسی۔ ''تم بھی کیا چیز ہو۔ ان بے چاری کا جینا حرام کر دیتے ہو۔ آخر وہ تمہاری ماں ہیں۔ سوتیلی ہیں تو کیا ہوا؟''

''نو......نو......نو...... بالکل نہیں۔ ماں بس ایک ہی ہوتی ہے۔ باقی صرف باپ کی بیویاں ہوتی ہیں۔''

''لگتا ہے زیادہ ہی دل جلا ہوا ہے۔ بھوک نے جذبات کو اور بھی بھڑکا رکھا ہے۔ تمہارے لیے کلب سینڈوچ منگوالیا ہے۔ میں ناشتا کر چکی ہوں۔ صرف چائے میں تمہارا ساتھ دے سکوں گی۔ اب بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔ کچھ تمہارے اندر اُبل رہا ہے جو تم مجھے بتانا چاہتے ہو۔ اور ابھی تک نہیں بتایا ہے۔ بتاؤ؟''

''یار مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میرے اندر اتنی گہرائی تک جھانکی کیسے مار لیتی ہو۔ کیسے پتا چل جاتا ہے کہ میرے پاس کچھ ہے جو میں نے تمہارے ساتھ شیئر نہیں کیا ہے۔ آنکھیں ہیں یا جذبات کی ایکسرے مشین۔ بتاؤ۔''

سارہ زور سے ہنسی۔ ''ہم شاید ففتھ اسٹینڈرڈ سے ساتھ ہیں۔ اتنی طویل رفاقت میں، اتنا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔''

''لیکن مجھے کیوں نہیں ہوتا۔ میں بھی تو تب سے ہی تمہارے ساتھ ہوں۔''

''اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ تم میرے لیے دنیا کے پہلے اور آخری مرد ہو۔ ساری زندگی کے لیے۔ تم شاید ابھی مختلف آپشنز پر غور کر رہے ہو اس لیے بات یہاں تک نہیں پہنچی۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ شرم کرو اتنا سفید جھوٹ بولتے ہوئے۔ تم نے تو پہلے لفٹ ہی نہیں کروائی تھی مجھے۔ وہ تو جب میں نے پرپوز کیا، تب بھی ہزار نخروں کے بعد ہاں کہا تھا۔ اور اب نشانِ امتیاز اپنے گلے میں ڈال رہی ہو۔''

''اچھا مسٹر امتیاز......یعنی کہ ولی صاحب! بتائیے۔ کیا کچھ نیا ہے آپ کے پاس کہنے کو۔''

''ہاں نیا......ایک تو تم باتیں اتنی کرتی ہو کہ اتنی اہم بات ہی مجھے بھلا دی تھی۔ خیر نئی بات یہ ہے کہ میں نے جس اسکالرشپ کے لیے امریکن یونیورسٹی میں اپلائی کیا تھا۔ وہاں مجھے ایڈمیشن مل گیا ہے۔ دو مہینے کے بعد کلاسز شروع ہو جائیں گی۔ اور مابدولت اسپیس ٹیکنالوجی کی ڈگری لے کر، دو سال کے بعد واپس آ جائیں گے۔ تم اپنے پاس ہی کہیں میرے لیے جاب کا بندوبست کر کے رکھنا۔''

"دو سال...... ولی! دو سال ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ تم ڈگری کے ساتھ اگر کوئی گوری بھی لے آئے تو میں کیا کروں گی؟"

"ہاں...... یہ مسئلہ تو ہے۔ تم ایسا کرنا کہ اس گوری کو گولی مار دینا۔ بس۔ پھر میں تمہارا۔ چلے گا؟"

"ہاں۔ اور میں قتل کے الزام میں پھانسی پر چڑھ کر لٹکی...... تمہارے لیے تیسری کا راستہ صاف۔ پلان تو اچھا ہے لیکن میں صرف اسے نہیں تمہیں بھی گولی مار کر اس کے پاس پہنچا دوں گی۔ لکھ کر رکھ لو۔ او کے۔" وہ اٹھ کر ریب کی جانب چل دی اور وہ مسکرا کر اسے آخیر تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"کیا مسئلہ ہے برو!"

ولی نے رکشا ویٹنگ پر روکا ہوا تھا کیونکہ سارا کی یونیورسٹی شہر سے باہر تھی۔ اور اس ویرانے میں کسی سواری کا ملنا تقریباً ناممکن ہی ہوتا تھا۔ وہ واپس آیا تو دو پولیس والے رکشے والے سے کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ رکشے والا غصے میں انہیں کچھ جواب دے رہا تھا۔

"مسئلہ...... مسئلہ مجھے نہیں ہے، انہیں ہے۔ وہی ہمیشہ کی حرام خوری کا۔ بھتا مانگ رہے ہیں اور کیوں مانگ رہے ہیں۔ اس کا کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں۔ پوچھ لو ان سے۔"

"کیا بات ہے سویٹ ہارٹ؟ اس غریب سے کیا خطا ہو گئی سرکار؟" اس نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے ایک پولیس والے سے پوچھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"اس کے کاغذ پورے نہیں ہیں۔ دکھانے کو بولا تو الٹا ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔ اس سے کہو کاغذ دکھائے، نہیں تو تھانے چلے۔"

"تھانے؟...... وہ بھی کاغذ نہ ہونے کے جرم میں۔ ارے یار!...... یہ تو زیادتی ہے۔ کیا بات ہے برو...... کاغذات نہیں ہیں کیا؟ یا گھر بھول آئے ہو؟"

"کاغذ ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں بارش میں پورا رکشا پانی میں ڈوب گیا تھا۔ تو کاغذ بھی سارے خراب ہو گئے۔ اب فرصت ملے گی تو دوسری کاپی بنواؤں گا۔"

"سن لیا سویٹ ہارٹ! اب یہ ان کی کاپی بنوا کر رکھے گا تو تم دیکھ لینا۔ میں اکثر آتا رہتا ہوں اس کے رکشے میں، کبھی بھی آ کر دیکھ لینا۔ چلو دوست! مجھے واپس پہنچا دو۔ باس میری جان کو رو رہا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ دیر سے پہنچنے پر وہ مجھے کھڑے کھڑے فائر کر دے۔" ولی نے رکشے والے کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو ایک پولیس والے نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"ایسے کیسے جا سکتا ہے دوست؟ کاغذات نہیں ہیں تو جرمانہ تو دینا پڑے گا۔ یہاں دے دو تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو تھانے میں۔ اور وہاں لیا نہیں جاتا، وصولا جاتا ہے۔"

"کاغذات چیک کرنا تمہارا کام ہی نہیں ہے۔ یہ ٹریفک پولیس کی ذمّے داری ہے۔ اس لیے تم اپنے حصے کا بھتا اپنے جیسے لوگوں سے لو آخر ٹریفک پولیس کو بھی تو بھتا لینا ہوتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں سے۔ سب کچھ تم لے لوگے، تو ہم انہیں کیا دیں گے؟"

رکشے والے کے لہجے میں تلخی اور غصہ لبالب بھرا ہوا محسوس ہوا تو پولیس والے نے مغلظات بکتے ہوئے اس کا کالر پکڑ کر اسے نیچے کھینچنے کی کوشش کی۔ ولی پھر آڑے آیا۔

"رکو...... رکو...... رکو یار! ہاتھا پائی کرنا ضروری نہیں ہے، میں دے دیتا ہوں۔ برو! تم رکشا اسٹارٹ کرو، میں دان کرتا ہوں ایک عدد لال نوٹ۔"

رکشے والے نے بڑبڑاتے ہوئے رکشا اسٹارٹ کیا۔ ولی نے ایک لال نوٹ کی بتی بنا کر چپکے سے پولیس والے کی ہتھیلی میں چھپا دیا۔ رکشے والا غصے میں مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

"یہ ایسے ہی حرام خور ہیں۔ تم نے کیوں برباد کیے اپنے سو روپے؟ میں نمٹ لیتا ان سے۔"

"سو روپے......؟ کون سے سو روپے......؟ وہ لال نوٹ مانگ رہے تھے۔ میں نے دے دیا...... لال نوٹ۔ بیس روپے والا۔ کیسا؟"

"بیس روپے والا نوٹ...... نہیں کر یار! تم نے تو کچرا کر دیا ان کے سارے بھرم کا۔ اگر وہ اسی وقت نوٹ کھول کر دیکھ لیتا، تو میرے ساتھ تمہیں بھی تھانے کی سیر کروا دیتا...... لال نوٹ...... بیس روپے والا......"

رکشے والا بھی صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آہستہ سے ہنسا۔ اس کی ٹینشن کچھ کم ہو گئی تھی۔

"یار ایسے لوگوں کو سیریس لے کر اپنا بلڈ پریشر بڑھانے کے بجائے، ٹینشن انہیں دو۔ بس دعا کرو کہ دوبارہ ان سے سامنا نہ ہو۔ ورنہ وہ ساری کسر نکال لیں گے۔"

"ارے بھائی! یہ تو روز کے جھگڑے ہیں۔ یہ بتاؤ تمہیں کہاں چھوڑ دوں۔ وہیں، جہاں سے اٹھایا تھا۔ یا کہیں اور جانا ہے۔ یا پھر آفس، جہاں تمہارا باس تمہارے انتظار میں انگاروں پر ٹہل رہا ہو گا۔"

ولی زور سے ہنسا۔ "کون سا آفس...... اور کون سا

باس؟ وہ تو میں تمہیں وہاں اُن خون پینے والوں کے چنگل سے چھڑانا چاہتا تھا اس لیے چلا رہا تھا۔ تم چلتے رہو۔ میں اتنی دیر میں سوچتا ہوں کہ کہاں جاؤں۔''

''اچھا۔ کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ گھر چھوڑ دوں۔''

''گھر......؟ سوتیلی ماں ہر وقت تیر کمان پر چڑھائے میری منتظر رہتی ہے۔ وہ گھر نہیں۔ ٹارچر سیل ہے۔ کہیں اور چلا جاؤں گا۔ گھر نہیں جا رہا فی الحال۔''

رکشا اب شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک نیم پختہ بستی سے گزر رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر چائے کے ایک ڈھابے پر وہ رکا اور ولی سے پانچ منٹ کی اجازت لے کر آگے گیا۔ وہاں لکڑی کی بینچوں پر بیٹھے چار پانچ آدمی اس کی طرف بڑھے۔ درمیان میں وہ رک گئے اور کسی نہایت سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہوئی۔ ان سب کے کھنچے ہوئے چہرے اس بات کا مظہر تھے کہ کوئی بڑا مسئلہ ہے، اور وہ سب رکشے والے کو کچھ اپ ڈیٹس دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر ہوئی تو ولی کی چلبلی طبیعت نے اسے بھی ان کے پاس جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ چپ چاپ سینے پر دونوں ہاتھ باندھے خاموشی سے کھڑا ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا۔ صورت حال یہ تھی کہ وہ سب اس نیم پختہ بستی کے مکین تھے، جو شہر کے اس مضافاتی علاقے میں دریا کے نزدیک واقع تھی۔

''زاہد بھائی! کل شعیب بھائی گئے تھے ڈپٹی کمشنر کے دفتر۔ اپنے ساتھ میرے ابا اور دو چار اور محلے کے لوگوں کو بھی لے گئے تھے۔ لیکن اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ شعیب بھائی نے کہا کہ اگر تم لوگ ہمیں اس طرح بے گھر کر رہے ہو، تو کوئی دوسری جگہ تو دو۔ ہم اپنے اپنے خاندانوں کو لے کر کہاں جائیں گے؟ زاہد بھائی! میرے ابا بتا رہے تھے کہ اس نے جواب میں کہا، کہ اگر تم لوگوں کے پاس یہاں کی زمین کی ملکیت کے کاغذات ہیں تو لے کر آ جانا۔ تمہارے لیے متبادل جگہ کا بندوبست کروانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ لیکن جن کے پاس زمین کی ملکیت کے کاغذات نہیں ہیں، وہ اپنا بندوبست خود کریں۔ تم لوگوں نے ناجائز طور پر زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ چھوڑنا ہوگا۔ اب آپ خود بتائیں۔ ہم میں سے کسی کے بھی پاس ایسے کوئی کاغذ ہیں کیا؟ اب کیا کریں گے ہم؟''

''زاہد بھائی! آپ کو تو پتا ہے۔ میرے ابا بتاتے ہیں کہ ان کے ابا گھر والوں کے ساتھ دریا کے اُس پار سے یہاں آئے تھے۔ کیونکہ وہاں ان کی پوری بستی سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ وہ خود یہاں پیدا ہوئے تھے۔ ان سب نے تو یہاں پناہ لی تھی۔ جب سے یہاں ہیں۔ کاغذ کبھی بنے ہی نہیں۔ ابا نے ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا اب ان کے کاغذات نہیں بن سکتے۔ تو انہوں نے منع کر دیا اور کہا کہ ہر کام قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ کچی آبادیوں کی لیز کے لیے قانون سازی ابھی ہو رہی ہے۔ قانون بنا نہیں ہے۔''

''اب کیا ہوگا زاہد بھائی؟''

''کیا ہوگا؟ یا تو سب مل کر اجتماعی خودکشی کر لو۔ یا پھر ڈٹ کر کھڑے ہو جاؤ اس ظلم کے خلاف، تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے سوچ لو اور پھر مجھے بتاؤ۔'' زاہد واپس مڑا اور ولی کو اشارہ کرتا ہوا رکشے میں آ گیا۔ وہ پھر غصے میں بڑبڑا رہا تھا۔ ولی نے اسے مخاطب کیا۔

''یار! تھوڑے دن اور کھینچ لو اس مسئلے کو۔ کچھ ہی دنوں میں الیکشن ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے حکومت بدل جائے اور نئی آنے والی حکومت تمہارے اس مسئلے کو حل کر دے۔''

''کیا تم واقعی اتنے بھولے بھالے ہو، یا میرے جیسے آدمی کو لیڈروں کی طرح بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یار تم کہیں سیاست داں تو نہیں ہو؟ کس پارٹی کے ہمنوا ہو؟''

''لاحول ولاقوۃ، کیا بے کار بات کر رہے ہو۔ سیاسی لیڈر ہوتا، تو تمہارے رکشے میں سفر کر رہا ہوتا؟ باوردی ڈرائیور اور مسلح گارڈز کے ساتھ بلیک ڈالے کے ٹھنڈے خوشبودار کیبن میں بیٹھ کر کسی حسینہ سے ملنے جا رہا ہوتا۔ خیر میری چھوڑو۔ تم اپنے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ اگلی حکومت میں شاید کوئی وزیر، سفیر تمہارے کام آ ہی جائے۔''

''پھر وہی بات کہہ رہے ہو۔ کیا تم سچ مچ نہیں جانتے اپنے اس بدبودار سسٹم کو یا مجھے شعلوں کی لڑیاں پہنانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''بھائی! یہ گدھ اور بھیڑیے ہیں۔ جو آپس میں باریاں بدل بدل کر ہمارا لہو پینے اور ہمارا گوشت نوچ نوچ کر کھانے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ آج اگر گدھ حکومت کر رہے ہیں۔ تو کل الیکشن کے بعد بھیڑیے آ جائیں گے اور ہمیں دیکھو! ہم خود انہیں اپنے لیے منتخب کر کے لائیں گے۔''

''بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ لیکن یار! پھر قصور کس کا ہوا؟ انہیں لانے والوں کا نا۔ اور لانے والے کون ہیں۔ ہم ہی تو ہیں۔ صحیح لوگوں کو منتخب کرنا تو ہمارا ہی کام ہے نا۔ تو پھر شکوہ کیسا۔ ہاں......؟''

''باتوں سے تو پڑھے لکھے لگتے ہو؟''

''زیادہ تو نہیں۔ بس ماسٹرز کیا ہے۔ پولیٹیکل سائنس میں۔ وہ بھی بڑی مشکل سے۔ ماں باپ کا خیال تھا کہ اتنی

تعلیم کافی ہے میرے سرکاری افسر بننے کے لیے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ سول سروسز کا امتحان بھی پاس کر لے۔ ڈائریکٹ ڈپٹی کمشنر لگ جائے گا۔ بس میں ہی چوک گیا۔ ورنہ ابھی تم ڈی سی سے باتیں کر رہے ہوتے۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں اب بھی کسی ڈی سی سے ہی باتیں کر رہا ہوں۔"

"ہاں میرے دوستوں کی طرح تم بھی مجھے ڈفر۔ چڑ کنجو یعنی کہ ڈی سی سمجھ سکتے ہو۔"

"ڈفر...... چڑ کنجو...... ڈی سی۔" ولی نے زور کا قہقہہ لگایا تو زاہد کے ہونٹوں پر بھی ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور معدوم ہوگئی۔

"ہاں اُن کے خیال میں تو میں ڈی سی ہی ہوں جب ہی تو چانس مس کر دیا۔ تیاری کی تھی تو امتحان بھی دے ہی دیتا، کیا پتا کوئی جگاڑ لگ ہی جاتی۔"

"تیاری کے باوجود امتحان نہیں دیا۔ وجہ؟"

"کیونکہ میں اس سسٹم کی حقیقت جان گیا تھا۔ بڑے دھوکے ہیں اس راہ میں۔ بابو جی دھیرے چلنا...... اب تو بتا دو...... کہ جانا کہاں ہے۔"

"یار! تمہارے ساتھ باتیں کرنے میں بہت مزہ آ رہا ہے۔ کسی ڈھابے پر روک لو۔ بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانا وانا کھاتے ہیں۔ اور گپ شپ بھی۔ ٹائم تو ہوگا نا تمہارے پاس؟"

"بھائی صاحب! رکشے والا ہوں۔ رکشا چلے گا تو گھر کا خرچہ چلے گا۔ کھڑا رہا تو دو وقت کا کھانا ذرا مشکل ہو جائے گا۔"

"نہیں...... نہیں...... تم ویٹنگ پر میرے ساتھ ہو۔ رکشا بے شک کھڑا رہے۔ پر تمہارا میٹر چلتا رہے گا۔ فکر نہ کرو۔"

"لگتا ہے کسی بڑے باپ کے بیٹے ہو اور ابا کی کمائی پر عیش کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے۔ چلو!"

☆☆☆

"ابے یار تین بائیکوں پر تین تین بیٹھ گئے ہیں۔ اب یہ بچ جانے والا چوتھا کیسے آئے گا؟" تین بائیکس تھیں ان کے پاس۔ تین تین ایک ایک بائیک پر بیٹھ گئے۔ پھر بھی ایک بچ گیا۔

"ارے یار یہ ایک بچ گیا۔ یہ کیسے آئے گا؟"

"کوئی بات نہیں یار! تم لوگ چلو۔ میں پیدل آ جاؤں گا۔"

"تو جب تک پیدل چلتا ہوا وہاں پہنچے گا، پولنگ کا ٹائم ختم ہو جائے گا۔ تیرا ووٹ رہ جائے گا۔"

"ارے یار! یہ ثاقب کی بائیک پر تینوں پتلے بیٹھے ہیں۔ تو اس کے پیچھے لٹک جا۔ ٹھیک سے پکڑ لینا۔ خودا کیلے مت گرنا۔ انہیں ساتھ لے کر گرنا۔ چل آ جا آ جا......"

وہ بھی ایک بائیک پر پیچھے سچ مچ ہی لٹک کر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں زمین پر رگڑ کھا رہی تھیں، اور بائیک گدھا گاڑی کی چال چل رہی تھی۔ مگر وہ سب مست ملنگ ہلا گلا کرتے پولنگ اسٹیشن جا رہے تھے، جہاں انہیں ووٹ ڈالنا تھا۔ بڑا جوش و خروش تھا۔

پولنگ اسٹیشن سے بہت دور انہیں اپنی بائیک چھوڑ کر آگے پیدل جانا پڑا کیونکہ رش بہت تھا۔ وہ اندر پہنچ کر لائن میں لگ گئے۔ جگہ جگہ مختلف پارٹیوں کے کیمپس لگے ہوئے تھے جن پر ان کے جھنڈے لہرا رہے تھے اور بڑے اسپیکر پر پارٹی کے ترانے بج رہے تھے۔

لوگ ووٹ ڈال رہے تھے اور قطار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ سب بھی لائن میں لگے خوشگوار موڈ میں ہنس بول رہے تھے۔

ولی کی نظر برابر میں خواتین کی لائن پر گئی تو اسے اپنے گھر کی میڈ روشن آپا نظر آئیں۔

"ارے روشن آپا!...... آپ بھی ووٹ ڈالنے کے لیے آئی ہوئی ہیں۔"

"ہاں میاں۔ ووٹ کیوں نہ ڈالوں۔ آخر میں بھی تو پاکستانی ہوں۔ ووٹ کا حق تو مجھے بھی ہے نا۔"

"بالکل ہے خالہ! پر یہ تو بتائیں۔ ووٹ کسے دے رہی ہیں؟"

"دیکھو میاں! ویسے تو یہ سیکریٹ ہوتا ہے لیکن تم گھر کے بچے ہو تو بتائے دیتی ہوں کہ میں تو چار پارٹیوں کو ووٹ دے رہی ہوں۔"

"ہیں۔ روشن آپا! کیا جعلی ووٹ ڈالیں گی؟ پکڑی گئیں تو بہت بری ہو جائے گی۔ سوچ لیں۔"

"ارے نہیں میاں! میں نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں نہیں پکڑی جا سکتی۔ یہ جو پارٹیاں ہیں نا۔ جن کو میں ووٹ کا وعدہ کر کے آئی ہوں۔ اپنے ووٹر کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ارے واہ خالہ! اصل سیاست داں تو آپ ہی ہو۔ الیکشن میں کھڑی ہو جاؤ۔ پکی جیتی ہی جیتی۔ روشن آپا! یہ چار پارٹیوں کو ووٹ ڈالنے کا وعدہ کر کے آئی ہو۔ لیکن ووٹ دو گی کس کو؟"

''ووٹ تو میں اپنی پسند کی پارٹی کو ہی دوں گی۔''

''اچھا۔ تو ووٹ اس پارٹی کو دینا ہے جس سے وعدہ نہیں کیا ہے۔ واہ خالہ واہ۔'' ولی نے مزے لیتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا تو جن سے وعدہ کیا ہے۔ انہوں نے تمہارے وعدے کا اعتبار کرلیا؟''

''ارے میاں! روشن اعتبار علی ہوں میں۔ میرے وعدے کوئی ہلکے نہیں ہوتے۔ پانچ ہزار کا ایک وعدہ ہوتا ہے۔ لوگ اعتبار کرتے ہیں تب ہی تو بلاتے ہیں مجھے۔ ابھی تم سب تو آئے ہو گے اپنی اپنی پھٹ پھٹیوں پر۔ مجھے ایک پارٹی نے یہ بڑی سی گاڑی بھیجی تھی لینے کے لیے۔ ٹھنڈی ٹخ۔ اندر گانے چل رہے تھے پارٹی کے۔ میں نے بھی آواز میں آواز ملا کر زور زور سے گائے گانے۔''

''اللہ اللہ روشن آپا! ایک وعدہ پانچ ہزار کا۔ تو چار پارٹیوں سے آپ نے جو ووٹ کے وعدے کیے۔ وہ ہو گئے ٹوٹل بیس ہزار کے۔ اُف۔''

''اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ووٹ نہیں دے رہی ہیں۔ ووٹ اس کو دے رہی ہیں جس سے پانچ ہزار نہیں وصولے۔ اپنی مرضی سے۔ کیوں خالہ؟''

''دیکھو میاں! دل تو خالہ کا بھی ہے نا۔ ووٹ تو میں اپنے ضمیر کے مطابق دے رہی ہوں۔ دل ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ساتھ یہ پاپی پیٹ بھی تو لگا ہوا ہے۔ تو اگر وعدوں کے پیسے مل رہے ہیں۔ تو کیوں نہ وصولے جائیں۔ یہ کون سی اُن کی محنت کی کمائی ہے۔ ہم ہی لوگوں کا لوٹا ہوا مال ہے۔ تھوڑے بہت ہی لیے نا۔ ناجائز نہیں کیا؟''

''جائز ہیں خالہ۔ جائز ہیں۔ لگے رہو مُنّا بھائی۔''

اسی دوران لائن کھسکتی رہی اور ولی کا نمبر آ گیا۔ پولنگ بوتھ میں جا کر اس نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ تاکہ اسے بیلٹ پیپر دیا جائے۔ تو پولنگ افسر نے ایک مرتبہ دیکھا۔ پھر دوسری مرتبہ ذرا اور غور سے دیکھا۔ پھر نظر اٹھا کر ولی کو دیکھا اور اعلان کر دیا کہ اس کا ووٹ تو ڈالا جا چکا ہے۔

''آپ تو ووٹ ڈال کر جا چکے ہو۔ دوسری مرتبہ پھر آ گئے ہو۔''

''کیا؟ میں نے تو ووٹ نہیں ڈالا۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں ووٹ ڈال کر جا چکا ہوں۔ یہ میرے دونوں انگوٹھے دیکھیں۔ ان پر نیلی سیاہی کا مارک کہیں نظر آ رہا ہے آپ کو؟ دو گھنٹے لائن میں لگ کر یہاں تک پہنچا ہوں اپنا ووٹ ڈالنے کے لیے۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں ووٹ ڈال چکا ہوں۔''

''ہمارے پاس اندراج ہے۔ آپ کے نام سے بیلٹ پیپر ایشو ہوا ہے۔ اس بک پر دیکھیے۔ آپ کے انگوٹھے کا نشان ہے۔ آپ کا ووٹ ڈل چکا ہے۔ آپ باہر جائیں۔ دوسروں کو آنے دیں۔ بہت رش ہے۔''

میں نے ووٹ نہیں ڈالا۔ یہ میرے انگوٹھے کا نشان نہیں ہے۔ یہاں میرے نام سے جعلی ووٹ ڈالا گیا ہے۔ میں یہاں سے ووٹ ڈالے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

''دیکھیے۔ آپ بلاوجہ شور ہنگامہ نہ کریں۔ ورنہ مجھے سیکیورٹی کو بلانا پڑے گا۔''

''آپ سیکیورٹی نہیں۔ اس کے باپ کو بلا لیجیے۔ میرے نام سے جعلی ووٹ ڈلوانے پر میں آپ کے خلاف کمپلین کر دوں گا۔ اور سب کو بتا رہا ہوں کہ یہاں پر جعلی ووٹنگ ہو رہی ہے۔ اس لیے اندر آ کر ذرا آپ سے جواب طلب کریں۔ سن لیا دوستو! یہ...... یہ جو بیٹھے ہوئے ہیں نا۔ یہ بکے ہوئے لوگ ہیں۔ پیسے لے کر جعلی ووٹ ڈلوا رہے ہیں۔ اس بات پر احتجاج ہمارا حق بنتا ہے کہ نہیں؟''

اندر ولی اور اس کے دوست ہی تھے۔ انہوں نے مل کر شیم شیم چلّانا شروع کیا۔ تو پولنگ افسر نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

''آپ لوگ آخر چاہتے کیا ہیں؟ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان سب چیزوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں کچھ کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر اسے بلاؤ جو ان سب کا ذمے دار ہے۔ اور کچھ کر سکتا ہے۔ یہاں کے آر او، یعنی ریٹرننگ افسر کو بلاؤ۔ اور ہاں۔ اس سے بات کیے بغیر ہم سب یہاں سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔'' ولی اپنی بات کہہ کر وہیں ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ تو باقی سب بھی وہیں کھڑے ہو گئے تھوڑی دیر میں آر او کی اینٹری ہوئی۔ ولی نے پلٹ کر دیکھا تو وہ عبداللہ ہاشم، یعنی اس کے والد تھے۔ ایک زہریلی سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر اُبھری۔

''اوہ...... عبداللہ ہاشم صاحب! آپ ہیں یہاں کے آر او۔ پھر تو ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہو گا یہاں۔ غرض ہے کہ یہاں پر جعلی ووٹنگ ہو رہی ہے۔ میرا ووٹ یہاں پہلے ہی ڈالا جا چکا ہے، جبکہ میں ابھی آیا ہوں۔ تو کیا کرنا چاہیے پیچ اس مسئلے کے۔ آر او صاحب؟'' ولی نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا تو انہوں نے ایک لمحے کو غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر دوسری نظر وہاں جمع ہو جانے والے دوسرے برگشتہ ووٹروں پر ڈالی۔ ولی کو اشارہ کیا۔

"میرے آفس میں چلو۔ اور اپنی کمپلین درج کرواؤ۔ چلو۔" انہوں نے اس کی آنکھوں میں بغاوت کے آثار دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے آفس میں لے گئے۔ ولی بڑا حیران ہوا جب اس نے دیکھا کہ حکومتی پارٹی کا ایک بڑا لیڈر وہاں ایک آرام کرسی میں دھنسا سگار کا دھواں اپنے منہ سے نکال رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر باپ کو دیکھا اور اس لیڈر کی جانب ایک سوالیہ اشارہ کیا۔ ہاشم نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آراو صاحب! میں نے ان صاحب کو ٹی وی پر اکثر دیکھا ہے۔ یہ صوبائی وزیر تھے۔ اور اب پھر یہ پارٹی کے امیدوار ہیں۔ اور اسی حلقے سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔ الیکشن کے قوانین کے مطابق ان کا یہاں ہونا غیر قانونی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی امیدوار جس حلقے سے الیکشن لڑ رہا ہو، اسے پولنگ اسٹیشن کی ایک مخصوص حد سے اندر نہیں آنا چاہیے۔ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ بات کسی اور سے پوچھنے کے بجائے مجھ سے پوچھو۔ ہاں۔ میں یہاں ہوں، کیونکہ یہ میری مرضی ہے۔ مجھے اگر کوئی روک سکتا ہے تو روک کر دکھا دے۔ نکال سکتا ہے تو نکال کر دکھائے۔ میں یہاں ہوں کیونکہ میں پولنگ کے پروسیس کی مانیٹرنگ کر رہا ہوں۔"

"مانیٹرنگ۔ یا دھاندلی۔ جعلی ووٹ ڈلوا رہے ہو اور دادا گیری بھی کر رہے ہو۔" ولی نے تپے لہجے میں کہا۔

وہ غصے میں دہاڑا۔ "ہاں۔ کر رہا ہوں۔ وہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ جو کرنا لازمی ہے۔ تمہارا باپ نہیں روک سکا، تم میرا کیا بگاڑ لوگے۔ مجھے ہر صورت جیتنا ہے اور اس جیت کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ دادا گیری بھی۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم اور تمہارے جیسے لوگ جو اس سسٹم کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ تم جیسے لوگوں نے ہی تباہ کیا ہے اس ملک کو، اس قوم اور اس کے مستقبل کو۔ اپنے گالوں کی سرخی قائم رکھنے کے لیے لہو نچوڑ کر پی رہے ہو عوام کا۔ اور یہ لہو کا چسکا ہی ہے۔ جس کے سبب تم اور تمہارے جیسے دوسرے اس بدبودار سسٹم کو بدلنے نہیں دیتے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ جو سسٹم تحفظ دیتا ہو، اسے کوئی کیوں بدلے گا۔ اور تمہارے جیسے جوشیلے لوگ جو صرف نعروں سے بہلنے والے ہوں، ان سے کسی کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ تم بھی ابھی یہاں سے باہر جاؤ گے۔ اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان جا کر ہمیں گالیاں دو گے۔ نعرے لگاؤ گے پھر تھک کر کان لپیٹ کر سو جاؤ گے۔ اس سے نہ تو ہمیں کوئی خطرہ ہے، اور نہ ہی سسٹم پر کوئی ضرب پڑنے والی ہے۔ تم بھی بلاوجہ کیوں اپنی توانائیاں ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"کیا تم نے تاریخ نہیں پڑھی۔ عوامی طاقت کے بارے میں نہیں جانتے۔ جب قوم اپنے حق کے لیے کھڑی ہو جائے تو انقلاب آ جاتا ہے اور تمہارے جیسے لوگ ہوا میں کاغذ کی طرح اڑ جاتے ہیں۔ تم بھی اس وقت کا انتظار کرو۔ سسٹم بدلے گا اور ضرور بدلے گا۔"

"انقلاب قومیں لاتی ہیں۔ ہم قوم بننے ہی نہیں دیتے۔ ہمارے پاس ایک ایسی جادو کی چھڑی ہے جو عوامی طاقت کو جمع ہونے سے پہلے ہی، کاٹ کر ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ ایسا کچھ بھی کرو گے، تو کسی اور کا نہیں۔ نقصان صرف اور صرف تمہارا ہوگا۔"

"نقصان؟ نقصان تو ہو رہا ہے۔ صرف میرا نہیں، پوری قوم کا، بلکہ نسلوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔ کچھ تو کریں گے نا۔" ولی اسے دوبدو جواب پکڑا رہا تھا۔ لیڈر نے تضحیک آمیز انداز میں اسے دیکھا۔

"تمہیں فلبرائٹ اسکالرشپ ملا ہے۔ ایک امریکن یونیورسٹی میں تمہارا ایڈمیشن بھی ہو گیا ہے۔ تمہارے سارے کورس کی مکمل فیس اور تمہارے جانے آنے کا ٹکٹ۔ سب کچھ مکمل ہے۔ تمہیں اگلے ماہ جانا ہے، کیونکہ اگلے ماہ سے کلاسز شروع ہو رہی ہیں۔ بہتر ہے کہ ان سب فضولیات میں پڑنے کے بجائے جانے کی تیاری کرو۔ آرام سے وہاں پڑھو۔ دو سال بعد جب ڈگری لے کر آؤ گے تو یہاں ایک بہت اچھی جاب تمہاری منتظر ہوگی۔ جاب کرنا، شادی کرنا اور ایک مزے کی لائف گزارنا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"یہ...... یہ سب تفصیل تمہیں کیسے معلوم؟"

"ہاشم عبداللہ سے ہماری پرانی نیازمندی ہے۔ یہ تمہارے مستقبل کی طرف سے کچھ پریشان تھے۔ تو ہم نے ان کی پریشانی دور کر دی۔"

"اور اس کے نتیجے میں تم یہاں بیٹھ کر، بقول تمہارے مانیٹرنگ اور میرے حساب سے دھاندلی کر رہے ہو۔ یعنی یہ حلقہ میرے باپ کی وجہ سے تم کو ہتھیلی پر رکھ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے بدلے میں میرے باپ نے تم سے میرا مستقبل خریدا ہے۔ لعنت ہے ایسے مستقبل پر۔"

"زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ اسی طرح چلتا ہے۔ یہی ہمارا سسٹم ہے۔ اور جس سسٹم کو تم گالیاں دے رہے ہو، جذباتی انداز میں نعرہ بازی

کر کے بُرا بھلا کہہ رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اس سے کچھ بگاڑ پاؤ گے۔ اگر تمہیں اسے بدلنے کی اتنی ہی تمنا ہے تو ایک مشورہ ہے تمہارے لیے۔ اس سسٹم کے اندر آؤ۔ اور اسے سدھارنے کی کوشش کرو۔ دانتوں... پسینہ آجائے گا۔ خالی خولی گالیاں دینے کے بجائے عملی تدبیر کرو۔ باہر سے ہاتھ پاؤں چلا کر تم اس جال کو نہیں توڑ سکتے۔ اسے صرف اندر سے توڑا جاسکتا ہے۔ اس لیے میرے مشورے پر غور کرنا۔"

"ٹو ہیل ود یور مشورہ۔" ولی غصے میں کھولتا، پکتا، سر کے بالوں کو انگلیوں سے کھینچتا ہوا کمرے سے تو کیا، اس علاقے سے ہی باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"دو تین میئیور گزار چکی ہے یہ پارٹی اقتدار کے ایوانوں میں۔ اور حالات کیا ہیں۔ وہی حالات ہیں فقیروں کے۔ دن پھرے فقط امیروں کے جناب اسپیکر! اس غریب ملک کی حکومت میں پہلے ہی کابینہ کے وزرا کی تعداد ماشاء اللہ ریکارڈ توڑ تو ہے ہی۔ اب غریب عوام کی ٹوٹتی ہوئی کمر پر مزید ان کی عیاشیوں کا بوجھ لاد دیا گیا۔ اور اس چاچے تائے مامے والی اسمبلی نے منٹوں میں اس بل کو پاس کردیا۔ اپوزیشن کو موقع ہی نہیں دیا گیا، کہ وہ اس پر کچھ کہہ سکتی، تنخواہوں میں 200 فیصد اضافہ سب کو ایک ایک بلٹ پروف گاڑی جس میں ایک کی قیمت کروڑوں میں ہے۔ فری پیٹرول، بجلی، باہر کے سال میں بارہ ٹکٹ وہ بھی فیملی کے ساتھ۔ اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ اور عوام...... عوام پر مہنگائی، لاقانونیت، بوسیدہ انفرا اسٹرکچر، صحت اور تعلیم کی ناکافی سہولیات اور......"

"واہ یار! کیا بات ہے۔ یہ دبنگ عورت ہے۔ جو مردوں سے بھرے ایوانوں میں عوام کی بات کرتی ہے۔ ایسی ایسی سناتی ہے کہ کانوں سے دھواں نکلنے لگے۔ مگر ان ڈھیٹوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

"وہ اپوزیشن لیڈر ہے۔ اکیلی بول کر کیا بگاڑ لے گی ایسے لوگوں کا۔ اس کے اپنے لوگ اسمبلی میں سوائے ڈیسک بجانے کے اور کیا کرتے ہیں۔ اس کی آواز میں آواز ملانے تک کی زحمت نہیں کرتے۔"

"اس لیے نہیں کرتے کہ ان سے وہ حرام کے لقمے نہ چھن جائیں، جو وقتاً فوقتاً ان کے منہ میں رشوت کے طور پر ٹھونسے جاتے ہیں۔"

"اوپر سے پھر بطور ایم این اے جو سہولتیں حکومتی ارکان کو مل رہی ہیں، وہ انہیں بھی دی جارہی ہیں۔ کس کو بُرے لگتے ہیں یہ اللے تللے۔ اس لیے وہ بھی چپ چاپ کان دبا کر بیٹھے رہتے ہیں۔"

ولی، زاہد رکشے والا اور اس کے پانچوں دوست اپنے مخصوص چائے کے ڈھابے پر بیٹھے، ولی کے فون پر میڈم علینہ کی آج اسمبلی میں تقریر کی کلپس دیکھ رہے تھے۔ تقریر بہت اچھی تھی اور انہیں لگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ انہی کے دل کی آواز ہے۔

"یار ولی! ایک بات بتا۔ کیا ہم اپنے مسئلے کے بارے میں ان سے بات کرسکتے ہیں۔ وہ ہماری کچھ مدد کرسکتی ہیں۔ ڈی سی کی دی ہوئی مہلت میں اب صرف ایک مہینہ باقی رہ گیا ہے۔ یہ مدت ختم ہوتے ہی وہ ہماری ساری بستی کو بلڈوز کردیں گے۔ یہ بہت بڑی تباہی ہے ہمارے لیے۔ ناقابلِ برداشت۔"

"بات کرنا تو چاہیے۔ اب وہ کیا کرسکتی ہیں، یہ تو ان سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔"

"زاہد بھائی! میڈم کے جو ابا تھے نا۔ بڑے ہی زبردست اور دبنگ لیڈر تھے وہ۔ اس وقت وہ ان حکومتی لوگوں کی ناک میں نکیل ڈالے رکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی اپنے ابا کے جیسی ہی ہوں۔"

"ان کے ابا مر گئے کیا؟" ولی نے پوچھا۔

"مرے تو نہیں۔ ایک ایکسیڈنٹ میں بُری طرح زخمی ہوئے تھے۔ اور اب سنا ہے کہ معذور ہوگئے ہیں۔"

"ولی! یار ایسا ہوسکتا ہے کہ تو ان سے ملنے کا وقت لے کر مل لے۔ اور ہمارا مسئلہ حل کروانے کی کوشش کرلے۔ کیونکہ ہم میں سے تو کسی میں بھی اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی عورت کے سامنے کچھ ڈھنگ سے بول سکیں۔"

"کوشش کرلیتا ہوں۔"

"اوواؤ۔ ٹھیک ہے تو پھر کل ہی مل لے بھائی! وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔"

"کل کیوں؟ آج کیوں نہیں؟"

"اوئے ہوئے۔ بلائیں لے لوں تیری اسی بات پر۔ کیا بات ہے یار! تجھ سے اس لیے دل کے تار کچھ جڑ سے گئے ہیں تو ہم میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی اپنا اپنا سا لگنے لگا ہے۔ ٹھیک ہے پھر۔ بول کہاں چھوڑ دوں تجھے۔" زاہد نے ہنستے ہوئے اس کی بلائیں لینے کی اداکاری کی تو اس کے باقی سب دوست بھی ہنسنے لگے۔

"ڈیفنس میں رہتی ہیں۔ وہیں چھوڑ دے بھائی!" اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی جب وہ گھر میں داخل ہوا۔ سارے دن کی خواری کے بعد بھوک بھی اپنے عروج پر تھی۔

''روشن آپا! زبردست بھوک لگی ہے۔ جو کچھ ہے فوری طور پر لا دیں۔'' وہ حسبِ معمول تیز تیز قدموں سے اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف مڑا تو اس کی نظر اپنی سوتیلی ماں شیما پر پڑی۔ وہ کچھ پریشان سی صوفے پر بیٹھی فون میں لگی ہوئی تھیں وہ کچھ سوچ کر واپس مڑا۔ ان کے پاس آیا۔

''کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے نا۔ ورنہ آپ اور اتنی شانت۔ میرے آنے پر بھی کوئی چنگاری نہیں اُڑی آپ کی طرف سے۔ خیریت تو ہے نا؟''

''بکواس بند کرو۔ تمہارے باپ کی طرف سے فکر ہو رہی ہے۔ دو گھنٹے لیٹ ہو چکے ہیں۔ اور میرے بار بار فون کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں۔ فون بند ہونے کا میسج چل رہا ہے۔ ایسا کبھی ہوا نہیں اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔''

''اوہ واؤ! واقعی پریشانی کی بات تو ہے۔ آپ کی کال اٹینڈ نہیں کر رہے۔ حالانکہ وہ تو آپ کی کال کھڑے ہو کر ریسیو کرتے ہیں۔ یہ تو پریشانی والی بات ہے۔ بالکل ہے۔''

''بک بک کیے جاتے ہو۔ وہ تمہارا بھی باپ ہے۔ اور وہ بھی سگا۔ اپنے فون سے کال کرو شاید بات ہو سکے۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

ولی نے ایک نظر اُن کے چہرے پر ڈالی۔ وہ واقعی پریشان محسوس ہوئیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں تسلی دی اور اپنے فون سے کال ملانے لگا۔ لیکن عبداللہ ہاشم کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے کئی دفعہ کوششیں کیں لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔

''یہ تو واقعی کوئی مسئلہ ہے۔ اچھا پریشان نہ ہوں۔ میں ان کے دوستوں اور کولیگ سے پتا کرتا ہوں۔ امید ہے معلوم ہو جائے گا کہ بابا کہاں ہیں۔ ابھی معلوم کرتا ہوں۔''

وہ انہیں تسلی دیتا ہوا بار بار مختلف جگہوں پر کالز کرتا رہا۔ لیکن ہر جگہ سے یہی سننے کو ملا کہ چھٹی تک تو وہ آفس میں ہی تھے۔ اکثر کوئی کام ضروری ہوتا تو وہ دیر تک رک کر بھی اس کام کو پورا کر کے ہی نکلتے تھے۔ شاید آج بھی کوئی ضروری کام آ گیا ہو۔ اور وہ آفس میں بزی ہوں۔''

اب وہ بھی کچھ پریشان ہوا۔ اس نے آفس کے فون پر بھی کال ملائی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

''دیکھیے! فون پر کچھ معلوم نہیں ہو رہا ہے۔ بابا اکثر دیر تک بھی آفس میں رک جاتے ہیں۔ فون کا معلوم نہیں کیا مسئلہ ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آفس سے معلوم کرتا ہوں بلکہ بابا کو ساتھ لے کر ہی آ جاتا ہوں۔'' اس نے شیما کو مناسب الفاظ میں تسلی دی کیونکہ اب اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔

''اب تو بہت رات ہو گئی ہے۔ شاید بارہ بجنے والے ہیں۔ آفس تو کب کا بند ہو چکا۔ اندر کوئی نہیں ہے۔ سب جا چکے ہیں۔ آپ دیکھ لو۔ اندھیرا پڑا ہوا ہے۔'' گارڈ اور چوکیدار اسے اطلاع دے رہے تھے۔

''تم نے بابا کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟ ان سے تمہاری کوئی بات ہوئی تھی کیا؟'' ولی نے پوچھا تو ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''ہاں دیکھا تو تھا۔ وہ تھوڑا دیر سے نکلے تھے۔ سات بجے کے قریب۔ میں گاؤں گیا تھا تو ان کے لیے سوغات کے طور پر میوے والا گڑ لے کر آیا تھا۔ میں وہ تھیلا لے کر ان کے پاس گیا کہ گھر جا رہے ہیں۔ لے جائیں گے۔ پر انہوں نے نہیں لیا۔ کہنے لگے میں گھر نہیں کہیں اور جا رہا ہوں۔ اسے ابھی اپنے پاس رکھو، کل لے جاؤں گا۔''

''کچھ بتایا نہیں کہ کہاں جا رہے ہیں؟''

''نہیں۔ یہ تو نہیں بتایا۔''

''میں نے فون پر بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ کسی سے کہہ رہے تھے کہ کسی نے انہیں میٹنگ کے لیے بلایا ہے۔ اور وہ اس سے ملنے جا رہے ہیں۔ شاید دیر ہو جائے۔ تو بعد میں بات کروں گا۔''

''میٹنگ؟ میٹنگ کس کے ساتھ ہے۔ کس نے بلایا تھا انہیں؟''

''یہ تو پتا نہیں چل سکا صاحب! ویسے کچھ پریشان سے بھی دکھ رہے تھے ہاشم صاحب۔ پتا نہیں کس کے ساتھ میٹنگ کے لیے جانا پڑا انہیں۔'' گارڈ کی بات سن کر ولی کی پیشانی پر کچھ پریشانی کی لکیریں اُبھریں۔ وہ سر ہلاتا ہوا واپسی کے لیے مڑا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ان کے سیکریٹری کو ضرور اس میٹنگ کے بارے میں معلوم ہوگا۔ اس نے جلدی جلدی اس کا نمبر ڈھونڈا۔ کال ملائی تو دوسری جانب سے ایک نیم خوابیدہ سی آواز سنائی دی۔ ولی نے عبداللہ ہاشم کے بارے میں پوچھا، تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''میٹنگ؟ آج ان کی کوئی بھی میٹنگ آفس ٹائم کے بعد طے تو نہیں تھی۔ کوئی ایمرجنسی آ گئی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں جا سکتے ہیں؟ کوئی بات

ہوئی ہو کسی کا تذکرہ ہوا ہو۔ کوئی بھی ٹپ۔ کوئی ہنٹ۔ کچھ بھی نہیں ہے کیا؟"

"آئی ایم سو سوری۔ سرکاری افسر ہیں وہ۔ تمہیں تو معلوم ہے نا کہ سرکاری افسر چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ کوئی ایمرجنسی آ گئی ہو گی اس لیے دیر ہو گئی ہے۔ پریشان نہ ہو۔ آ جائیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کم از کم فون پر اطلاع تو دے سکتے تھے۔ بتا سکتے تھے کہ میں اس جگہ مصروف ہوں۔ ان کا تو فون ہی بند جا رہا ہے کئی گھنٹوں سے اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے فون میں کوئی پرابلم ہو گئی ہو۔ سب ٹھیک ہو گا ان شاء اللہ۔ پریشان نہ ہو میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ ان سے رابطہ ہو سکے اگر ہو گیا تو میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔ او کے۔"

اب ان کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ شیما صوفے پر بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی، اور ولی لاؤنج کے طول و عرض میں مسلسل چکر کاٹ رہا تھا۔ ہر اس جگہ فون کر رہا تھا جہاں سے کچھ بھی معلوم ہونے کی امید ہو سکتی تھی۔

گھڑی کی سوئی دو پر آئی تو وہ رک گیا۔ گیٹ کھلنے اور گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی۔ وہ تیز قدمی سے باہر نکلا اور شیما بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے آئی۔ ہاشم عبداللہ تھکے تھکے قدموں سے گاڑی سے اتر رہے تھے۔ شیما بھاگتی ہوئی ان سے جا کر لپٹ گئی اور رونے لگی۔ ولی نے غور سے بابا کا چہرہ دیکھا تو اس کا دل دہل گیا۔ چہرے پر کچھ ایسے نشان تھے جیسے ان پر تشدد کیا گیا ہو۔ وہ ان کے چہرے پر پھیلی خاموش سنگینی کو محسوس کر سکتا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے ہاشم! تم نے تو مجھے دہلا دیا۔ میری آدھی جان نکل گئی تھی۔" شیما نے پوچھا۔

"میں کہیں نہیں گیا تھا۔ مجھے کچھ لوگوں نے کڈنیپ کر لیا تھا۔"

"کڈنیپ؟ وہ کیوں؟" شیما کچھ حیران ہوئی۔

"کڈنیپ کیوں کیا جاتا ہے؟ پیسوں کی ڈیمانڈ تھی۔ وہ گاڑی میں مجھے گھماتے رہے۔ اور میں مختلف اے ٹی ایم سے پیسے نکلوا کر انہیں دیتا رہا۔ جب میرا اکاؤنٹ خالی ہو گیا تو انہیں غصہ آ گیا مار پیٹ کی، فون تو وہ پہلے ہی لے چکے تھے۔ باقی جو کچھ تھا وہ لے کر مجھے ہائی وے پر دھکا دے کر پھینک گئے۔ وہاں سے پیدل بہت دور تک چل کر گاڑی تک پہنچا اور گھر آ گیا۔ دیر تو ہونا ہی تھی۔"

ولی غور سے انہیں دیکھ رہا تھا اور اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ بابا کہہ رہے ہیں۔ وہ صاف طور پر گھڑا ہوا جھوٹ ہے۔ اصل معاملہ کچھ اور ہے۔ لیکن وہ کچھ بولا نہیں، خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

☆☆☆

بارش نے پھر سے زور پکڑ لیا تھا۔ وہ سارہ کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا بھیگ گیا۔

"ہائیں۔ اتنی بارش میں بھی چین سے نہیں بیٹھا جاتا ہے تم سے۔ کیا ضرورت تھی بھیگنے کی۔" سارہ نے تولیا اسے پکڑاتے ہوئے جھاڑ پلائی تو وہ مسکرایا اور دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی جانب جھکتے ہوئے میلوڈراما پیش کیا۔

"سات سمندر پار میں تیرے پیچھے پیچھے آ گیا۔ یہ تو معمولی بارش ہے سارہ ڈیئر! تمہارے لیے تو میں سمندر پار اتر جاؤں گا۔ حالانکہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ لیکن میں تمہاری محبت کے چپو چلا کر پہنچ جاؤں گا۔ جب چاہو آزما لینا۔ ہائی داوے ایسی ٹکیے والی سرکاری نوکری میں چھٹی کی کوئی گنجائش ہوتی ہے کیا۔ تم اپنے ریسرچ سینٹر میں نہیں تھیں اس لیے مجھے گھر آنا پڑا۔"

"اچھا بکواس بند کرو۔ بابا آ رہے ہیں۔ سن لیا تو تمہیں کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیں گے۔ کان پکڑ کر۔"

"مکرم صاحب سے میری تم سے زیادہ اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ تم جانتی ہو۔"

وہ اندر پہنچے اور سارہ کے بابا سے گپ شپ شروع ہو گئی۔ وہ بھی ایک زندہ دل آدمی تھے۔ شاید اسی لیے ان کی ولی سے بڑی اچھی بنتی تھی۔ کچھ دیر وہ چائے میں ان کے ساتھ شریک رہے۔ پھر اٹھ کر چلے گئے تو ولی نے سارہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ چھٹی پر ہو آج۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ ٹھیک ہے بھی، اور نہیں بھی۔ ایسے ہی کچھ سستی اور بیزاری سی طاری ہے۔ پچھلے دنوں میں بہت زیادہ مصروف رہی۔ شاید تھکن ہو گئی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تھوڑا بریک لے لینا چاہیے۔" سارہ نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا تو ولی نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اسے بھی اس کے چہرے پر کچھ تھکن تو نظر آئی، لیکن آنکھوں میں کسی پریشانی کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔ وہ اسے بچپن سے جانتا تھا۔ اس کی ہر ادا سے واقف تھا۔ وہ کب کس موڈ میں ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اسے لگا کہ کچھ ایسا ہے جو

اسے پریشان کر رہا ہے۔
"ہم...... مم...... بہت اچھا کیا جو بریک لیا۔ ورنہ تم تو کبھی چھٹی کرتی ہی نہیں ہو۔ لیکن اب اصل بات بتاؤ۔ کیا چیز ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے؟"
"میں نے کب کہا کہ کوئی چیز مجھے پریشان کر رہی ہے۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہے۔"
"ہمیشہ کی طرح تم مجھ سے کوئی بھی بات چھپانے کی کوشش کرو تو میں تمہیں تین سو تیرہ مرتبہ بتا چکا ہوں کہ تم مجھ سے کوئی بات چھپا نہیں سکتی ہو۔ میں تمہارے دل کے اندر چھپی ہر بات کو اچھی طرح جان جاتا ہوں۔ اور یہ بات تمہیں بھی معلوم ہے۔ اس لیے ٹالنے کے بجائے وہ بات بتاؤ، جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔"
"اُفوہ ولی! تم بھی کیا چیز ہو۔ تم سے تو کچھ بھی چھپانا کتنا مشکل ہے۔ کیسے سمجھ جاتے ہو؟"
"پتا ہے نا؟ اس لیے ایسی کوئی کوشش کیا ہی مت کرو۔ بتاؤ! کیا مسئلہ ہے؟"
"مسئلہ یہ ہے کہ تم میرے کام کے بارے میں جانتے ہو نا۔ پانی، بارش، دریا، گلیشیئرز، ان سب کو مانیٹر کرنا اور غیر معمولی حالات میں انہیں کنٹرول کرنا بلکہ مینیج کرنا۔ یہ ہے میرے کام کا حصہ۔ میں براہِ راست وزارتِ زراعت میں آبی امور سے وابستہ ہوں۔ اپنی رپورٹس انہی کو بھیجتی ہوں۔ اس سال مون سون کا موسم ابھی شروع ہوا ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ کتنی بارشیں ہو رہی ہیں۔ میری ریسرچ کہتی ہے کہ اس دفعہ ہمیشہ سے زیادہ بارشیں ہوں گی۔ جبکہ غیر معمولی طور پر گرم موسم کے سبب گلیشیئرز پہلے ہی پگھل کر بہت زیادہ پانی دریاؤں میں ڈال چکے ہیں۔ اب شدید بارشیں ان دریاؤں کو وائلڈ کر دیں گی۔ ڈیم بھر کر شدید تر سیلابوں کا سبب بنیں گے۔ اس لیے ہمیں پہلے ہی احتیاطی تدابیر کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ بے حساب فصلیں بہہ جائیں گی۔ اور نہ جانے کتنی بستیاں نیست و نابود ہو جائیں گی۔ ہمارا شہر بھی ایک بڑے ڈیم کے پاس، دریا کے کنارے آباد ہے۔ ایسے سیلابوں میں ہو سکتا ہے کہ اس کا بھی نام و نشان پانی میں بہہ جائے...... یہی رپورٹ میں نے اپنی وزارت کو بھیجی تھی۔ تاکہ وہ بچاؤ کے لیے کچھ ضروری اقدامات کر سکیں۔ لیکن معلوم ہے کیا ہوا؟"
"کیا...... کیا ہوا؟" ولی جو پوری توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا، اچانک سوال پر کچھ ہڑبڑا سا گیا۔
"ہوا یہ کہ میری رپورٹ وزارت تک پہنچی ہی نہیں۔ درمیان سے ہی کہیں غائب ہو گئی۔ اور نہ جانے کن لوگوں کے ہاتھ لگ گئی۔ کل رات تو مجھے ایک نامعلوم نمبر سے کال آئی۔ اس میں کسی نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ تمہاری کوئی رپورٹ اوپر نہیں جانا چاہیے۔ خاص طور پر ایسی رپورٹ جس میں بند کو پیچھے سے توڑنے کی بات کی گئی ہو۔ بہتر ہے کہ تم اب ریسرچ کے کام سے تھوڑا بریک لو اور آرام کرو۔"
"کیا مطلب ہے۔ اگر ڈیم بھرتا ہے اور آس پاس کسی کو خطرہ ہوتا ہے۔ تو بند کو توڑنا تو پڑے گا۔"
"ہاں۔ یہی اصل وجہ ہے۔ دیکھو اگر ڈیم بھرا، تو سارے اسپل وے کھولنے پڑیں گے اور پانی کا سیلاب باہر آیا تو دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو میلوں تک کھڑی ہوئی فصلیں بہہ جائیں گی۔ یا پھر فصلیں بچانا ہیں تو ڈیم توڑنا پڑے گا۔ اگر ڈیم سامنے کے رخ سے توڑا گیا تو دریا کنارے والی نہ جانے کتنی بستیاں نیست و نابود ہو جائیں گی۔ سیلاب بڑا ظالم ہوتا ہے کسی کو نہیں چھوڑتا۔ انسان جانور اور چیزیں تو کیا، وہ تو سارے مکان تک بہا کر لے جاتا ہے اگر ایسا ہوا تو بہت بڑی تعداد میں لوگ مارے جائیں گے۔ اور اگر ڈیم کو پچھلی جانب سے شگاف لگا دیا جائے، تو سیلابی پانی میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو تباہ کر دے گا۔ وہاں تو اگلے سال پھر فصل ہو جائے گی۔ لیکن بستیاں بہہ گئیں، تو اس نقصان کی کوئی بھرپائی بھی نہیں ہو سکے گی۔"
"یہ تو ایک معقول بات تھی۔ دھمکیاں کس نے دی ہیں اور تمہاری رپورٹ سے نقصان کس کا ہو سکتا ہے؟"
"تمہیں معلوم ہے کہ ڈیم کے ساتھ اور آگے دور تک یہ زمینیں کس کی ہیں؟"
"ہاں! کون نہیں جانتا۔ یہ ساری زمینیں شمشیر خان اور اس کے بھائی دل شیر خان کی ہیں۔ زرخیز زمین ہے، بے حساب پیداوار ہوتی ہے۔ ہزاروں ایکڑ زمین ہے جو سونا اگلتی ہیں۔"
"او۔ میں سمجھ گیا۔ اگر بند اس طرف سے توڑا گیا، تو اس کی ساری زمینیں زیرِ آب آ جائیں گی اور کھڑی فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔ یہ بات اسے کسی قیمت پر قبول نہیں ہو گی۔ رائٹ رائٹ رائٹ۔"
"اب سوچو۔ دوسرا آپشن کیا ہو سکتا ہے؟ یہی نا کہ بند کو سامنے والے رخ سے توڑ دیا جائے اور اس کے نتیجے میں کیا ہو گا؟"

"دریا کنارے کی ساری بستیاں بہہ جائیں گی۔ بہت بڑی تباہی ہوگی۔"

"شاید کہیں یہ فیصلے ہو رہے ہیں کہ کچھ بھی ہوجائے۔ زمینوں اور ان کی فصلوں کو بچانا ہے۔ ہزاروں لوگ مرتے ہیں، تباہ و برباد ہوتے ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کیڑے مکوڑوں جیسے انسانوں سے فصلیں زیادہ قیمتی ہیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تب ہی اس خدا کی بستی میں لوگوں کو گھر خالی کرنے کے نوٹس بھیجے گئے ہیں۔ وہ بھی تو دریا کے کنارے ہے۔ اس کا مطلب ہے، وہ لوگ ٹھیک پریشان ہیں۔ او مائی گاڈ! انسانوں کی زندگی کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔ اب تم کیا کرو گی؟"

"کرنا کیا ہے؟ میں ہزاروں انسانوں کو قتل ہونے سے بچانے کی پوری کوشش کروں گی۔ دوبارہ رپورٹ بنا کر ایمرجنسی ایس او ایس کے ساتھ بھیجوں گی۔ کچھ سوشل میڈیا والوں کو بھی یہ ایشو عام کرنے کی ٹپ دوں گی۔"

"واہ شیر کی بچی! ضرور کرو۔ لیکن اپنے آپ کو چھپا کر۔ بچا کر۔ کبھی سامنے آنے کی کوشش مت کرنا۔ خود پیچھے رہ کر اس سلسلے میں جو کچھ کرسکتی ہو ضرور کرو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ جہاں میری مدد کی ضرورت ہو، ضرور بتانا۔"

"اور تم کیا کرو گے؟"

"میں...... میں پہاڑوں میں جاؤں گا اور ایک تیشے کی مدد سے دودھ کی ایک نہر کھود دوں گا۔ اسے کھودتے کھودتے تمہارے گھر تک لاؤں گا۔ تاکہ تمہارے گھر میں مجھے دودھ پتی پینے کو ملے۔ یہ کالا قہوہ نہیں۔"

"بس۔ اتر گئے پٹری سے۔"

"ویسے تو پٹری پر ہی رہتا ہوں۔ تم سامنے ہوتی ہو تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کب پٹری سے اتر گیا۔ لیکن تم فوراً پکڑ لیتی ہو۔ خیر بی کیئر فل انکل کو سلام کہہ دینا۔ وہ شاید مسجد چلے گئے ہیں۔"

☆☆☆

"یہ آپ ہی کی تقریروں کے کلپ ہیں نا۔ یہ میں نے اور میرے دوستوں نے کئی کئی بار سنے ہیں۔ اسمبلی کے فلور پر تو آپ ایسے بولتی ہیں، جیسے لفظوں کی گولا باری کر کے آپ حکومتی ایوانوں میں زلزلے برپا کر دینے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ہر ایک کے بخیے اُدھیڑتی رہتی ہیں۔" ولی، میڈم علینہ کے لان میں، ان کے سامنے بیٹھا ان سے بات کر رہا تھا۔

"میں کچھ غلط تو نہیں کہتی۔ جو حقائق ہیں، انہی پر بات کرتی ہوں۔ فیگر اینڈ فیکٹس کے ساتھ۔ اب اس میں کسی کے بخیے اُدھڑتے ہیں تو وہ نہ کرے کرپشن۔ نہ کرے غلط کام۔ مجھ میں کم از کم اتنی ہمت تو ہے کہ ان کے کرتوت ان کے سامنے رکھ سکوں۔ اور تو سب چپ چاپ بیٹھ کر صرف ڈیسک بجانے کا کام کرتے ہیں۔"

"ہم بھی یہی سمجھتے ہیں اسی لیے سب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ اسمبلی کے اجلاس میں ہمارا یہ مسئلہ اٹھائیں۔ یہ جو دریا کے کناروں پر بستیاں آباد ہیں۔ کچی پکی آبادیاں ہیں۔ وہاں ان کی تین نسلیں گزر گئی ہیں۔ اب انہیں وہاں سے ہٹائے جانے کے نوٹسز دیے گئے ہیں کہ تین ماہ میں یہ علاقہ خالی کردیں۔ انہیں کوئی متبادل بھی نہیں دیا جا رہا ہے۔ جب انہوں نے احتجاج کیا تو ان سے وہاں کی زمین کی ملکیت کے کاغذات مانگ لیے گئے۔ پینتیس چالیس سال پہلے ان کے باپ دادا بھی سیلابوں سے تباہی کے بعد، وہاں آکر پناہ گزین ہوئے تھے۔ مالکانہ حقوق تو آج تک نہیں ملے کسی کو بھی۔ وہ کہاں سے لائیں۔"

"تم تو اس علاقے میں نہیں رہتے۔ تم کیوں پریشان ہو۔ عبداللہ ہاشم کے بیٹے ہو۔ وہ اچھے خاصے سینئر سرکاری افسر ہیں۔ یہ تمہارے مسئلے تو ہیں ہی نہیں۔"

"کسی کے تو مسئلے ہیں نا اور وہ بھی زندگی اور موت کے۔ وہ بے چارے غریب لوگ ہیں۔ کوئی ان کی آواز سنتا ہی نہیں ہے۔ اسی لیے انہوں نے آپ سے ایک چھوٹی سی امید وابستہ کرلی ہے کہ شاید آپ ان کی آواز حکومتی ایوانوں تک پہنچا سکیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اس اقدام کو روک سکوں گی؟"

"کیوں نہیں۔ آخر آپ اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر ہیں۔ کچھ تو آپ کی بھی اہمیت ہوگی۔ آپ کے والد بھی ہمیشہ سے پارٹی کے بڑے دبنگ لیڈر رہے ہیں۔ ان کی عوام دوست کارکردگی کے سبب، آج بھی لوگ ان کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ وہ بڑے ایکٹو انسان تھے۔ ابھی بھی ان کی کارکردگی کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ آج بھی لوگ ان کو عوامی بہتری کے اقدامات کے سبب بہت اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ آپ بھی تو انہی کی بیٹی ہیں۔ انہوں نے ہی آپ کی تربیت کی ہوگی۔ آپ میں بھی تو ایسی ہی خصوصیات ہونا چاہئیں۔ وہ حادثے کے نتیجے میں جسمانی طور پر معذور ہوئے ہیں۔ لیکن زندہ تو ہیں۔ آپ ان سے راہنمائی کیوں حاصل نہیں کرسکتیں۔ وہ راہنمائی جس کے ذریعے انہوں نے عملی طور پر عوام کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ آپ بھی صرف حکومتی پروٹوکول اور

عیاشیوں کو انجوائے کرنا چاہتی ہیں۔ زبانی کلامی لمبی لمبی تقریریں جھاڑ کر سیدھی سادی عوام میں اپنی واہ واہ کروا کر، آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کی ذمے داری پوری ہوگئی۔ تو میں بتا دوں کہ ایسا نہیں ہے۔ بتایئے! آپ ان لوگوں کا مسئلہ حل کر رہی ہیں، یا میں انہیں جا کر بتا دوں کہ وہ سب مصیبت زدہ لوگ آپ کو بھی ان ہی گدھوں اور بھیڑیوں کے گروپ میں شامل کر دیں اور کوئی امید نہ رکھیں۔'' ولی نے جلتے ہوئے لہجے میں اپنی بات ختم کی تو میڈم علینہ کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیلنے لگی۔

''میں نہ بھیڑیوں میں ہوں اور نہ ہی گدھوں میں۔ میرے والد نے ان بھیڑیوں اور گدھوں سے لڑتے ہوئے جس طرح عوام کو ان کا جائز حق دلانے کی کوششیں کیں، اس کی کیا قیمت ادا کی ہے۔ دیکھنا چاہتے ہو؟ آؤ! میں دکھاتی ہوں۔''

انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ ایک ظالم قسم کی گرفت تھی۔ وہ اسے کھینچتی ہوئی اندر کی جانب لے گئیں اور لے جا کر ایک کمرے کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ کمرے میں کھڑکی کے سامنے وہیل چیئر پر ایک بوڑھا شخص سر ہنہوڑائے پڑا ہوا تھا۔ اس کی ظاہری حالت انتہائی کسمپرسی ظاہر کر رہی تھی۔

''دیکھو...... دیکھو! یہ قیمت ادا کی ہے اس دبنگ شخص نے ان گدھوں اور بھیڑیوں کے چنگل سے نکلنے، اور عوام سے جڑنے کی۔ سچ کی راہ پر چلنے کی۔ وہ سامنے کی دیوار پر جو بڑی سی تصویر لگی ہوئی ہے، اس سے یہ شخص کتنا میل کھاتا ہے، تم بتا سکتے ہو؟''

ولی نے نظر گھما کر دیوار پر نظر ڈالی جہاں ایک نہایت شاندار انسان اپنی جاندار مسکراہٹ، وجاہت، دل آویز شخصیت اور دوستانہ انداز لیے ایک بڑے سے فوٹو فریم میں سے جھانک رہا تھا۔ ولی نے دوبارہ ایک نظر وہیل چیئر پر بیٹھے شخص اور تصویر والے کا موازنہ کرنے کی کوشش کی۔ کوئی میل ہی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں تاسف تھا۔

''یہ...... یہ کیسے ہوا؟''

''یہ ایسے ہوا کہ پاپا کے فلاحی کاموں کی وجہ سے عوام میں ان کی مقبولیت جب بہت بڑھنے لگی، تو طاقتور حلقوں کی جانب سے انہیں وارننگز ملنا شروع ہوگئیں۔ یہ ان کے سسٹم میں کسی بھی طرح فٹ نہیں ہو پا رہے تھے۔ وہ عوام کی بے پناہ پذیرائی حاصل کر کے ایک طاقتور لیڈر بننے کی طرف گامزن تھے۔ میں بھی پاپا کی اس جدوجہد میں ان کے ساتھ تھی۔ اور یہ بات اوپر والوں کو بالکل پسند نہیں تھی۔

اس لیے آئے دن ہمیں وارننگ، دھمکیاں دی جانے لگیں۔ چھوٹے موٹے نقصانات بھی پہنچائے گئے لیکن یہ نہیں مانے۔ انہیں اسی بدبودار سسٹم کا حصہ بنائے رکھنے کے لیے یہ سب کچھ برداشت نہیں کیا گیا اور سزا دے دی گئی۔''

''سزا؟ کیسی سزا......؟ سر تو ٹریفک حادثے کا شکار ہوئے تھے۔''

''ہم......مم...... بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے کہ وہ گاڑی، جس میں پاپا۔ میں اور میرا بڑا بیٹا جا رہے تھے، اچانک ہی بے قابو ہوگئی۔ ڈرائیور نے حادثے سے بچانے کے لیے جان توڑ جدوجہد کی۔ جس سے اس کی اسپیڈ تھوڑی کم تو ہوئی۔ لیکن پھر بھی وہ سڑک کے کنارے لگے درختوں سے ٹکراتی ہوئی، پل کی ریلنگ توڑتی ہوئی نیچے گری۔ ہم سب زخمی تو ہوئے لیکن زندہ تھے اور اس گاڑی سے باہر نکلنے کی کوششوں میں مصروف تھے کہ کچھ لوگ، جو اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فائرنگ کر دی۔ نشانہ ہم ہی تھے۔ پاپا کو ریڑھ کی ہڈی میں، مجھے بازو میں اور میرے بیٹے کو سینے میں گولیاں لگیں۔ وہ...... وہ اسی وقت ختم ہوگیا۔ پاپا اور میں بے ہوش ہو گئے۔ اور اب ہم جس حال میں ہیں۔ تمہارے سامنے ہیں۔''

''اوہ! بہت افسوسناک ہے میڈم! سو سوری...... کیا سیاست میں اس حد تک بھی جایا جا سکتا ہے؟''

''ہاں۔ سیاست ایک تارِ عنکبوت ہے۔ مکڑی کا جالا۔ اس میں جو پھنس جائے، وہ اپنی مرضی سے اس سے باہر نہیں آسکتا۔ جتنا نکلنے کے لیے پھڑپھڑائے گا، اتنا ہی نقصان اٹھائے گا۔''

''لیکن آپ تو اسمبلی میں حکومت کا ناک میں دم کیے رکھتی ہیں۔ ان کی کرپشن اور بے ایمانیوں کے پول کھولتی رہتی ہیں۔ کیا اس پر آپ کو دھمکیاں نہیں ملتیں۔''

''میرے دو ہی بیٹے ہیں۔ ایک کے چلے جانے کے بعد اب میرا دوسرا بیٹا اُن کی نظروں میں ہے۔ اگرچہ میں نے اسے لندن کے ایک اسکول میں داخل کروا رکھا ہے۔ وہ وہاں ڈورم میں رہتا ہے، لیکن اس کی زندگی کی گارنٹی یہ ہے کہ میں ایسا کچھ نہ کروں، جس سے اس سسٹم کو کوئی دھچکا لگے۔ چاہے اپوزیشن میں ہوں۔ یا حکومتی بینچوں پر۔ اوپر سے جو احکامات دیے جائیں، مجھے، بلکہ ہم سب کو صرف انہی کو فالو کرنا ہے۔ ان سے انحراف بغاوت تصور کی جائے گی اور بغاوت کی سزا موت سے کم نہیں ہے۔ میرے گھر میں اس ایک بیٹے کی سزائے موت، میرے لیے بلیک

[illegible] مقرر کردہ حدود سے ذرا بھی تجاوز کیا، تو میرے بیٹے کی زندگی کی کوئی گارنٹی نہیں رہے گی۔ وہ کب، کہاں اور کس طرح مارا جائے گا، اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اب تم بتاؤ! کہ میں اپنے بچ جانے والے اکلوتے بیٹے کی زندگی کو داؤ پر لگانے کی ہمت کہاں سے لاؤں؟''

''یہ آپ کون سے نئے نئے دروازے کھول رہی ہیں۔ میرے ذہن کو ماؤف کر دینے والے۔ آپ یہ بتا رہی ہیں کہ صرف ہم عوام نہیں بلکہ آپ جیسے لوگ بھی اس سسٹم کے چنگل میں پھنس کر یرغمال بنے ہوئے ہیں۔ آپ چاہ کر بھی عام آدمی کی فلاح کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔'' ولی کے لہجے میں جلن تھی۔ میڈم علینہ چپ چاپ دیوار کو گھورتی رہیں۔

''اگر ایسا ہے تو آپ جو اسمبلی کے فلور پر ان کے خلاف چیختی چلاتی رہتی ہیں، ان کی کرپشن کے ثبوت دکھاتی رہتی ہیں تو وہ آپ کو کچھ نہیں کہتے؟''

''اس کی اجازت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں اس طرح حکومت کے خلاف بولتی رہوں گی، تو اسمبلی میں اپوزیشن کا... وجود نظر آتا رہے گا۔ تاکہ دنیا اس کیمو فلاج کو ہی اصل نظامِ حکومت سمجھتی رہے۔ جمہوری ملک ہے نا ہمارا جمہوری نظام بھی ہے۔ اپوزیشن نہ ہوئی، تو کون مانے گا۔ اس لیے مجھے حکم دیا گیا، کہ جتنا مرضی حکومت کے خلاف بول لو۔ بولنے سے تمہیں کبھی بھی روکا نہیں جائے گا۔ بس عملی طور پر ایسا کچھ بھی کرنے کی کوشش نہ کرنا جس سے ہماری مقررہ حدود سے باہر نکل جاؤ۔ تھوڑی توانا آواز ہوگی، تو حکومت بھی ذرا قابو میں رہے گی۔''

''کیا یہ سب کچھ سچ کہہ رہی ہیں آپ میڈم...... مجھے یقین کیوں نہیں آرہا ہے۔ کوئی کس طرح اپنے ہی پورے ملک کی عوام کو خود ہی غلام بنا سکتا ہے۔ اس وقت میں آپ کو بھی عوام میں شامل کر کے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ عوام کی اتنی بڑی تعداد، اگر ان کے خلاف نکل آئی۔ تو ان کا کیا حشر ہو گا۔ کیا اس کا اندازہ ہے انہیں؟''

''اگرچہ تمہاری اس بات پر مجھے ہنسنا چاہیے لیکن کیا کروں۔ میں نے مدتوں سے ہنسنا چھوڑ دیا ہے۔ تم عوام کی بات کر رہے ہو۔ کون سی عوام؟ چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے بک جانے والے لوگ، کبھی ایک مقصد کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں کیا؟ سو روپے کے ایک نوٹ پر۔ یا بریانی کی ایک پلیٹ پر وفاداریاں چٹکی بجاتے فروخت کر دیتے ہیں۔ اس عوام سے تم کیا توقع رکھتے ہو۔ زیادہ ٹرٹر کرنے والوں کو نامعلوم لوگ اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور تھوڑا سا ٹارچر کیا جاتا ہے تو ان کا سوفٹ ویئر فوراً اپ ڈیٹ ہو جاتا ہے۔''

''میں تو ان سب کی طرف سے بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔ لیکن آپ نے تو ان سب کا دھڑن تختہ کر دیا۔ اب مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں انہیں جا کر کیا بتاؤں؟''

''ولی! تم ایک پُرجوش نوجوان ہو۔ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ اپنے اور اپنے گھر والوں کے مستقبل کو داؤ پر لگانے کے بجائے یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہیں شاید علم نہ ہو، لیکن تمہارے باپ نے ایک بڑی قیمت ادا کر کے تمہارے لیے ایک بہتر مستقبل کا انتظام کیا ہے۔ آج کل کچھ بھی بغیر قیمت کے نہیں ملتا۔ چاہے وہ اسکالرشپ ہو، یا امریکن یونیورسٹی میں داخلہ۔ میری طرف سے اپنے لیے یہ ایک ٹپ سمجھ لو کہ ان دو چار دنوں میں ہی یہاں سے نکل جاؤ۔ ان سب جھمیلوں میں مت پڑو۔ یہ تمہارے لیے نہیں ہیں۔ نقصان کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

''شکریہ میڈم! آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور اب آنکھوں کے سامنے سے سارا گرے ایریا ہٹ گیا ہے۔ سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگا ہے۔ آپ کی ٹپ کا بھی بہت شکریہ۔ میں سوچوں گا۔ اجازت!'' وہ ہاتھ ہلا کر پیچھے ہٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ ایک بڑا سا آفس نما کمرا تھا۔ خوب صورت فرنیچر کے ساتھ کمرے کی خنک فضا ایک اچھے ایئر فریشنر کی مدھم خوشبو سے معطر تھی لیکن وہاں کا ماحول اتنا خنک نہیں تھا۔ شمشیر خان دونوں ہاتھ کمر پر باندھے دیوار پر لگی ساٹھ انچ کی ایل ای ڈی اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔

جس پر کسی چھوٹے سے جلسے سے زاہد خان دھواں دار تقریر کر رہا تھا۔ اور اس کے الفاظ بم کے گولوں کی طرح پھٹ رہے تھے۔ موضوع تھا شمشیر خان کی نئی ہاؤسنگ اسکیم، جو دریا کے کنارے بنانے کے لیے لانچ کی جارہی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی کلپس تھیں، جو جگہ جگہ مختلف اجتماعات سے لی گئی تھیں۔ اور سب میں اسے بُرا بھلا کہا جارہا تھا۔ اور لوگ بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر اس زاہد خان کا ساتھ دے رہے تھے۔ شمشیر خان کے چہرے پر ضبط کی سرخی بڑھتی جارہی تھی۔

''یہ زاہد خان ہے کون؟ اور کیا کرتا ہے؟''

''سر یہ خدا کی بستی کا رہائشی ہے۔ یہ دریا کنارے وہی بستی جہاں ہماری ہاؤسنگ اسکیم لانچ ہونے جارہی ہے،

رکشا چلاتا ہے۔‘‘
’’اوقات دو کوڑی کی ہے اور زبان کوڈیالے سانپ کے جیسی۔ اتنی بکواس کر کے دوسروں کو بھی اپنی راہ پر لگا لے گا۔ اس کا منہ بند کرنے کا انتظام کیوں نہیں کیا ابھی تک۔‘‘ شمشیر خان کے لہجے میں آگ کی لپٹیں تھیں۔
’’کوشش کی تھی سر! اس نے ایک سو بیس گز پر بنے بنگلے، اور بریڈ نیور کشے کی پیشکش کو اٹھا کر منہ پر مار دیا سر! کہنے لگا کہ میں ... ایک اکیلا اس بستی کا رہنے والا نہیں ہوں۔ تم تو پوری بستی اُجاڑ رہے ہو۔ ان سب کو بھی ایسے ہی گھر بنا کر دو تو میں بھی لے لوں گا۔ ورنہ میں آخری سانس تک اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتا رہوں گا۔‘‘
’’اچھا۔ تو پھر اس کی آخری سانس میں کتنا وقت باقی ہے؟ کوئی بتا سکتا ہے۔‘‘ شمشیر خان نے سرد لہجے میں سوال کیا۔
تو جواب ملا۔ ’’یہ وقت تو آپ ہی کو پتا ہوگا سر! بتائیے۔‘‘
’’وقت تو اس کا کب کا پورا ہو چکا ہے۔ اب تو یہ بونس میں جی رہا ہے۔ تم لوگوں کی نالائقی کی وجہ سے۔‘‘
’’آپ آرڈر کریں سر۔‘‘
’’او کے۔ لیکن خیال رہے۔ اسے اس کی اوقات کے حساب سے ہی ٹھکانے لگانا ہے۔ ہماری طرف کوئی انگلی تو کیا، آنکھ بھی نہ اٹھے۔‘‘
’’یس سر! ایسا ہی ہوگا۔‘‘
’’اور دوسرے کون ہیں جو زیادہ ہی بھونک رہے ہیں۔ ذرا اُن کے چہرے تو کرواؤ۔‘‘
وہ سب دوسری دیوار کی جانب مڑے جہاں چند تصویروں کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ان پر چند نوجوانوں کی تصویریں تھیں۔ پاسپورٹ سائز کی انلارج تصویروں میں چہروں کے خدوخال نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ شمشیر خان نے بغور ان سب کا جائزہ لیا اور ساتھ کھڑے آدمی سے ان کے کوائف پوچھتا رہا۔ کچھ دیر سوچ کر سر ہلایا، پھر ایک تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے آگے بڑھ کر سرخ مارکر سے اس تصویر پر ایک بڑا سا کراس لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد شمشیر خان کے اشارے پر ایک اور تصویر سرخ کراس کی زد میں آئی۔ آخر میں ان میں سے پانچ تصاویر ایسی تھیں جن پر سرخ کراس لگا دیے گئے۔ یہ وہ بدنصیب تھے جن کی موت کا فیصلہ شمشیر خان نے کھڑے کھڑے کر دیا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر کوئی شکن تک نہ تھی۔
’’اس بات کا خیال رہے کہ ان سب کو ان کی اوقات کے مطابق ٹھکانے لگایا جائے۔ ان میں سے کسی کی بھی موت کا شبہ ہماری طرف نہ آنے پائے۔ اگر ایسا ہوا، تو پھر سمجھ لینا کہ یہاں تمہاری تصویر لگائی جائے گی اور اس پر سرخ کراس میں اپنے ہاتھ سے لگاؤں گا۔‘‘ شمشیر خان سرد لہجے میں بولتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ بابا کی کال آئی۔ وہ اسے اسٹڈی میں بلا رہے تھے۔ اور اب وہ ان کے مقابل ٹیبل کی دوسری جانب بیٹھا انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کچھ نیل اور سوجن کے نشان تھے۔ اس سے زیادہ ان کے لہجے کی تھکن تھی۔ جیسے وہ کسی عذاب سے گزر کر آئے ہوں۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا، اور وہ شاید کچھ کہنے کے لیے ہمت جمع کر رہے تھے یا الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔
’’کل مجھے کسی نے کڈنیپ نہیں کیا تھا۔‘‘ انہوں نے زخمی سے لہجے میں کہا تو ولی نے سر ہلایا۔
’’میں جانتا ہوں۔ آپ نے صرف ہم لوگوں کی تسلی کے لیے جھوٹ بولا تھا۔‘‘
’’تمہیں کیسے معلوم؟‘‘
’’آپ کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی۔‘‘
’’شیما کو تو بالکل شبہ نہیں ہوا اس بات کا۔‘‘
’’وہ آپ کو صرف سات سال سے جانتی ہیں۔ میں آپ کو بچپن سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ میں آپ کی خاموشی کو بھی بولتا ہوا محسوس کر سکتا ہوں۔ آپ جو گنے چنے چند الفاظ بولتے ہیں نا، میں ان کے پیچھے چھپی طویل داستان کو بھی سمجھ لیتا ہوں۔ کہیے! کیا ہوا تھا؟‘‘
’’سیکریٹری داخلہ کے دفتر میں مجھے طلب کیا گیا تھا۔ وہاں شمشیر خان بھی تھا اور بہت غصے میں تھا۔ اس نے اپنی کسی نئی ہاؤسنگ اسکیم کے لیے ہائیر اتھارٹیز سے نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ لے لیا ہے۔ بہت بڑی رشوت دے کر۔ وہ جلد سے جلد اسے لانچ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ تم اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہو۔ لوگوں کو بھڑکا کر اس کے خلاف کوئی کمپین چلا رہے ہو۔ اس بات پر وہ شدید ناراض ہے۔‘‘
’’اوہ۔ تو اس نے پریشرائز کرنے کے لیے آپ کو ٹارچر کروایا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کی یہ ہاؤسنگ اسکیم کہاں واقع ہے؟‘‘
’’ہاں۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ کم از کم تمہارے گھر کے پاس نہیں ہے۔ تمہارا گھر اس کی اسکیم کی زد میں نہیں آ رہا ہے۔‘‘
’’لیکن بابا! وہاں ہزاروں لوگ رہتے ہیں، جن کے

گھر اس کی اسکیم کی زد میں آرہے ہیں۔ وہ ساری بستی کو نیست و نابود کر کے، ہزاروں لوگوں کی لاشوں پر اپنی یہ شاندار ہاؤسنگ اسکیم بنا رہا ہے۔ انہیں کوئی متبادل جگہ بھی نہیں دے رہا۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟''

''ولی! یہ طاقت وروں کے کھیل ہیں۔ اُن کے سامنے عام لوگ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اور ان عام لوگوں میں، تم اور میں بھی شامل ہیں۔ تمہارا مستقبل محفوظ بنانے کے لیے میں نے تمہارے باہر جانے کا بندوبست کروایا تھا۔ وہ بھی بڑی مشکلوں سے۔ اب تمہاری زندگی کی ضمانت لینے کے لیے مجھے یہ ذلت اور بے عزتی برداشت کرنی پڑی ہے۔ جس کے نشان تم میرے چہرے پر تو دیکھ سکتے ہو۔ لیکن روح پر لگنے والے زخم دکھائی نہیں دیں گے تمہیں۔ یہ سب جھیلنے کے بعد مجھے یہ ضمانت مل تو گئی ہے۔ لیکن یہ مشروط ہے تمہارے آئندہ کے رویے سے۔ تم اس کے خلاف بولنے سے باز آجاؤ گے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ان کے خونی پنجوں سے ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔ سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''

''بابا! مجھے کیا کرنا ہے سوائے اس کے کہ خاموش ہو کر، کان لپیٹ کر گھر میں پڑا رہوں۔''

''ہاں۔ اور جلد سے جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ اسی میں سب کی عافیت ہے۔'' عبداللہ ہاشم کی دل گرفتگی نے ولی کو افسردہ کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے بابا! میں پوری کوشش کروں گا کہ آئندہ آپ کو میری وجہ سے کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔''

وہ اس امریکن یونیورسٹی کا سمسٹر شیڈول چیک کر رہا تھا۔ جہاں اس کا ایڈمیشن ہوا تھا۔ اگلے ماہ کے پہلے ہفتے سے کلاسز شروع ہو رہی تھیں۔ وہ اسکرین اسکرول کرتا ہوا بیزاری سے مختلف چیزیں دیکھ رہا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ سارہ کا نام دیکھ کر ہلکی سی ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی۔

''ولی! مکرم صاحب کا خیال ہے کہ دنیا میں ان سے اچھی مٹن کڑاہی کوئی اور بنا ہی نہیں سکتا۔ اور کیونکہ آج وہ کڑاہی بنا رہے ہیں تو ان کے خیال میں کسی قدر دان کو کھلائیں گے۔ جو اس کی قدر و قیمت کو سراہے گا۔ میرے جیسے کھانے کے ساتھ ظلم کرنے والے، اس کے بارے میں کوئی ڈھنگ کی رائے نہیں دے سکتے۔ اس لیے اپنی کھٹارا پھٹپھٹی نکالو اور مکرم صاحب کی کڑاہی کھانے فوراً پہنچ جاؤ۔''

''ہاہاہا...... میں بھی بہت بور ہو رہا تھا۔ انکل سے کہو۔ بس میں اُڑ کر پہنچ رہا ہوں۔ اور ہاں۔ میری ون ٹو فائیو کو پھٹپھٹی اور وہ بھی کھٹارا کہنے کی گستاخی آئندہ کبھی مت کرنا۔ ورنہ وہ ناراض ہو جائے گی۔''

''وہ...... ناراض ہو جائے گی۔ وہ تمہاری محبوبہ ہے کیا؟'' سارہ ہلکے سے ہنسی۔

''اب اگر میں ہاں کہوں گا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔ اس لیے اس بحث کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ میں آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں بسنتی۔ میں......'' دونوں ہنس دیے۔ اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور سارہ کے گھر پہنچ گیا۔ سارہ کے والد مکرم صاحب ایپرن پہنے ہوئے کچن میں مصروف تھے۔ وہیں سے انہوں نے آواز لگائی تو وہ بھی وہیں پہنچ گیا۔

''واہ کیا زبردست خوشبو آرہی ہے۔ انکل کھانے کی ایسی زبردست خوشبو تو کسی سگھڑ بہو کے کچن سے آتی ہے۔ پر آپ تو کمال ہو بھئی!''

''ارے میاں! کبھی کبھار دو چار چیزیں ہی بناتا ہوں۔ لیکن ایسی لاجواب بناتا ہوں کہ لوگ اسے کھانے کے ساتھ ساتھ دو چار اپنی انگلیاں بھی چبا کر کھا جاتے ہیں۔ اور انہیں پتا بھی نہیں چلتا۔''

''اچھا۔ پھر میں ذرا سارہ کی انگلیاں گن کر آتا ہوں۔''

''ارے چھوڑو یار! وہ ایک نمبر کی بدذوق ہے کھانے کے معاملے میں۔ اس کے سامنے یہ لاجواب کڑاہی رکھ دو، یا کوئی گھاس پھونس وہ بس رسم پوری کرتی ہے کھانے کی۔ اسے کیا معلوم کہ میرے کھانوں کا ذائقہ ہوتا کیا ہے۔ اس کے لیے شریف کے پکائے ہوئے گھاس پھونس اور میرے مزیدار کھانوں میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ اسے چھوڑو اور تم یہ لے کر چلو ٹیبل پر۔ شریف بھی روٹیاں لے کر آتا ہی ہوگا۔ سارہ کو بھی آواز دے لو۔ میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔''

وہ آواز دینے کے بجائے اس کے کمرے میں ہی چلا گیا۔ وہ لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی، اور کچھ ڈاکیومنٹس کے پرنٹ آؤٹ نکال رہی تھی۔ کاغذات سرسراتے ہوئے پرنٹر سے باہر آرہے تھے۔ وہ پیچھے کھڑا دیکھتا رہا۔ کاغذات... پرنٹ ہونا بند ہو گئے تو اس نے آگے بڑھ کر انہیں نکالا اور دیکھنے لگا۔ یہ وہی رپورٹ تھی جو اس نے بارشوں، دریاؤں، ڈیموں اور سیلابوں کے بارے میں مرتب کی تھی۔ جگہ جگہ انہیں ہائی لائٹ کر کے زیادہ اور فوری توجہ طلب مسائل کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ اور آخر میں اپنا ایک وارننگ نوٹ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر فوری طور پر اس کی دی گئی

تجاویز کے مطابق اقدامات نہ کیے گئے، تو آنے والی تباہی کو سنبھالا نہیں جاسکے گا۔

سارہ نے ایک بڑے سائز کا سرکاری مہر والا لفافہ پیچھے مڑ کر اسے پکڑا دیا۔

”یہ پیپرز اس میں ڈالو ذرا۔ اسے بند کرو اور یہ اسٹیمپ ہے۔ اس کے جوڑ پر لگادو۔ میں ذرا ایک میل چیک کرلوں۔ تو پھر کام ختم ہو جائے گا۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔ اوکے!“ اس نے ولی کو تسلی دی۔

”اب یہ رپورٹ بھیجو گی کیسے۔ پہلے والی کی طرح یہ بھی کہیں غائب نہ کردی جائے۔“ ولی نے پیپرز کو لفافے میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”میں اسے بھیجوں گی نہیں۔ میں نے اپنی وزارت کے سیکریٹری سے ٹائم لیا ہوا ہے کل کا۔ میں خود ہی بائی ہینڈ اس کے حوالے کرکے، اس سے ریسیونگ لے لوں گی۔ کم ازکم ... میرا فرض تو پورا ہوجائے گا۔ باقی آگے کون کیا کرتا ہے، یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

”کیوں بھئی! تمہیں خود جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آفس سے کسی کلرک یا پیون کو بلالو۔ وہ لے جائے گا۔ اور ریسیونگ بھی لے آئے گا۔“

”یو آر رائٹ۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ خواہ مخواہ خود دوڑنے کی واقعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن وہ کیا ہے کہ بعض اوقات حالات بڑے خاص ہوجاتے ہیں۔ اور ایسے حالات میں کچھ اضافی ذمے داری کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک بہت بڑا سیلابی ریلا، ایک بہت بڑے خطرے کی شکل میں شہر کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اگر حفاظتی اقدامات فوری طور پر نہ کیے گئے تو پورا شہر خطرناک تباہی کی لپیٹ میں آنے والا ہے۔ اسی لیے میں نے پہلے بھیجی جانے والی رپورٹ کے کوڈ میں ایس او ایس لکھ دیا تھا۔ مگر تم نے اس کا حشر دیکھ لیا۔ درمیان سے ہی غائب کر دی گئی۔ یہ رپورٹ اسی طرح بھیجی، تو یہ بھی غائب کردی جائے گی۔ اور ہزاروں لوگ ہلاکتوں کی نذر ہوجائیں گے۔ انہیں بچانے کے لیے خود جارہی ہوں۔ آجاؤں گی دو ڈھائی گھنٹے میں۔“

”اوکے۔ یو آر رائٹ۔ ٹھیک ہے۔ پھر کل کب جاؤ گی؟“

”گیارہ بجے کا ٹائم ہے۔ تو دس بجے تک چلی جاؤں گی۔“ ولی نے لفافہ ایک طرف ڈالا اور برابر کی کرسی کو کھینچ کر پلٹا اور اس کی پشت گاہ پر ٹھوڑی جما کر اسے غور سے دیکھا تو اس نے بھی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب رخ کیا۔

”جی جناب! شاید کچھ کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟“ کہا۔

”ہر وقت آفس۔ باہر کی ذمے داریاں۔ اِدھر کا مسئلہ اُدھر کا مسئلہ۔ اتنی بزی رہتی ہو کہ ساتھ بیٹھنے کا وقت ہی نہیں ہوتا تمہارے پاس۔ تو یہ بتاؤ کہ میں ان سب میں تم سے کہاں ملوں؟ اور کب ملوں؟ میں ترس گیا ہوں تمہارے لیے یارا۔“

”ملیں گے نا۔ اپنے گھر میں۔ فرصت سے۔ پھر بہت سارا وقت ہوگا۔ دل بھر کر باتیں کریں گے۔ تمہاری ساری شکایتیں دور ہوجائیں گی۔“ وہ آہستگی سے ہنسی۔

”اور یہ اپنا گھر، کب بنے گا۔ جہاں ہم جی بھر کر فرصت سے باتیں کر پائیں گے۔“

”یہ تو تمہاری کوششوں پر ہے۔ کب اتنے پیسے جمع کر لوگے کہ گھر بنا سکو۔ گھر بناؤ گے۔ جب ہی تو وہ آباد ہوگا۔ میرا اور تمہارا گھر۔“

”عجیب منطق ہے بھئی۔ جہاں میں رہ رہا ہوں وہ بھی تو میرا ہی گھر ہے۔“

”نہیں۔ وہ تمہارے والد کا گھر ہے۔ ہمارا گھر تو ہم خود بنائیں گے نا۔“

”سارہ! میں بوڑھا ہو جاؤں گا پیسے جمع کرتے کرتے۔ گھر کوئی مٹھی بھر پیسوں میں بن جاتا ہے کیا؟ ہم بعد میں بنالیں گے اپنا گھر۔“ یہ کہتے ہی ولی کھڑا ہوگیا۔ کیونکہ مکرم صاحب کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔

ان تینوں نے ایک خوشگوار ماحول میں کڑاہی کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ کیونکہ کڑاہی واقعی مزے دار تھی۔

☆☆☆

”کیوں؟ کیوں نہیں کرسکتیں وہ کچھ۔ اچھی خاصی سیٹیں ہیں ان کی پارٹی کی اسمبلی میں۔ وہ اپوزیشن لیڈر ہیں ہمارے سارے مسائل جانتی ہیں۔ اور ان کے کرتوت بھی جانتی ہیں۔ اسمبلی میں انہیں ننگا بھی کرتی رہتی ہیں۔ لیکن عملی طور پر کچھ کرنے کو تیار نہیں ہیں کیوں؟ آخر کیوں؟“ زاہد غصے میں بولتا جارہا تھا۔

”ارے یار ایک انہی سے امید تھی کہ شاید کہیں شنوائی ہو جائے ہماری۔ ان کو متعلقہ لوگوں سے ان کی کوتاہی پر جواب طلب کرنے کا اختیار ہے۔ وہ چاہیں تو اسمبلی کے فلور پر ہی اس مسئلے کو اٹھائیں اور متعلقہ وزارت سے جواب بھی طلب کریں۔ وہ اتنا تو کرسکتی ہیں یارا!“

”یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ولی! تو کہے تو ہم سب بھی تیرے ساتھ چلیں ان کے پاس۔ ان سے

اصرار کریں تو شاید مان ہی جائیں۔ کچھ نہ کچھ تو کریں۔'' ایک دوسرے لڑکے بابر نے کہا۔

''تیرا کیا خیال ہے۔ مجھے تم لوگوں پر پڑنے والی اس مصیبت کا کوئی اندازہ نہیں ہے کیا؟ میں نے ان سے اصرار نہیں کیا ہوگا۔ میں نے تم لوگوں کا مقدمہ لڑنے میں اپنا سارا تقریری ہنر آزما لیا۔ لیکن انہوں نے بہت سی تکلیفیں بتا کر کہہ دیا کہ وہ بہت مجبور ہیں۔''

ولی نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو ان سب کے منہ بھی لٹک گئے۔ وہ اپنے مخصوص ڈھابے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لکڑی کی بینچوں اور ٹیبلوں پر کپڑا مارنے کے باوجود مکھیاں رقص کر رہی تھیں۔

پھر اچانک وہاں تالیاں بجانے کی آوازیں سن کر ان سب نے دیکھا، تو چھ سات خواجہ سرا رنگ برنگ، چیختے چلاتے رنگوں کے لباس میں گھٹیا ترین میک اپ کیے ہوئے وہاں آکر جمع ہو رہے تھے۔ وہ لمبے تڑنگے مردانہ جسم کے مالک تھے لیکن لباس انہوں نے عورتوں والے پہنے ہوئے تھے۔ وہ ان کے نزدیک ہی ایک چارپائی پر براجمان ہوئے اور تالیاں بجا بجا کر زاہد، اس کے دوستوں اور ولی کو بیہودہ اشارے کرنے لگے۔ کوئی توجہ نہ پا کر ڈھولکی بجانا شروع کی، پھر ایک نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا۔ اب بات برداشت سے باہر ہوگئی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ناچنے والے نے آکر زاہد کے گال پر پیار کر لیا۔ وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔

''ان بیہودہ لوگوں نے جینا حرام کر دیا ہے۔ کہیں بھی جا کر بیٹھو، یہ نازل ہو جاتے ہیں۔ جاؤ یہاں سے۔'' زاہد نے غصے میں پیار کرتے والے کو دھکا دے کر ہٹایا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے اس طرح دھکا دے کر ہٹانے سے باقی خسروں نے ہنگامہ کر دیا۔ انہوں نے ان سب کو گھیر لیا۔ اور تالیاں بجا بجا کر اسے کوسنے لگے۔ زاہد کے چہرے پر غصے کی سرخی بڑھنے لگی تو اس کے دوستوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

''چلو زاہد بھائی! یہ جگہ اب بیٹھنے کے قابل نہیں رہی۔ ہم کہیں اور چلتے ہیں۔'' وہ اس کو پکڑ کر دور لے جانے لگے تو ان میں سے ایک نے کہا۔

''آئے ہائے۔ ہمارے پیار کو ٹھکرانے والے بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ ہماری بددعا سے ڈرو جانو! ہم تو پیار کرتے ہیں۔ جہاں جاؤ گے ڈھونڈ لیں گے۔ یاد رکھنا ہم اپنے پیاروں کو چھوڑتے نہیں ہیں۔'' ان میں موجود گرو ٹائپ کے خسرے نے تالی بجاتے ہوئے یہ بات کہی تو ولی اسے غور سے دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسے اس کے لہجے اور الفاظ کے زیر و بم میں کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔ جس سے وہ ڈر سا گیا۔

''کاشف ٹھیک کہہ رہا ہے زاہد! چلو یہاں سے۔ ان لوگوں کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں تماشا بنا کر رکھ دیتے ہیں اچھے بھلے آدمی کو۔''

''بابر! شام کو آکر چاچا سے بات کریں گے۔ وہ ان فضول قسم کے لوگوں کو یہاں آنے سے روکتے کیوں نہیں۔ بلاوجہ گند پھیلاتے رہتے ہیں۔'' کاشف نے کہا تو زاہد نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

''چاچا اپنا بزنس کیوں خراب کرے گا۔ وہ بھی تو چاچا کے اس ڈھابے پر پیسے دے کر ہی کھاتے پیتے ہیں نا۔ تو اپنے گاہکوں کو وہ کیوں منع کرے گا۔''

''چاچا سے میں نے کہا تھا، تو انہوں نے کہا کہ ڈھابے کے پیچھے کی طرف جو فیملی والا پورشن بنا ہوا ہے، تم لوگ وہاں بیٹھ جایا کرو۔ میں ان کو کیسے منع کروں۔ روز آجاتے ہیں اور اچھا خاصا کھانا چائے وغیرہ پر خرچہ کرتے ہیں۔ تو اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔'' کاشف نے کہا۔ ''ٹھیک ہے یار! کل سے وہیں بیٹھ جایا کریں گے۔ ابھی تو گھروں کو چلتے ہیں۔ کچھ بڑوں سے بھی اس صورت حال پر ڈسکس کریں۔ شاید وہ کوئی راستہ سجھا دیں۔ یہ دیکھو بارش پھر شروع ہوگئی۔ اب ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کچھ کرنا ہے، تو ہمیں خود ہی کرنا ہے۔ کوئی ہماری مدد کو نہیں آئے گا۔ چلو!''

زاہد نے بولتے ہوئے ولی کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور وہ سب تیز ہوتی بارش سے بچنے کے لیے تیز قدموں سے اس لمبی سڑک پر چل دیے، جو سیدھی بستی کو جاتی تھی۔

وہ اپنی بائیک گھسیٹتا ہوا جب گھر میں داخل ہوا تو رات ہوگئی تھی۔ لاؤنج سے گزر کر اوپر اپنے کمرے میں جانے لگا تو دیکھا کہ سب گھر والے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ہاشم کی نظر اس پر پڑی تو انہوں نے اسے آواز دی۔

''ولی! ادھر آؤ۔ کھانا کھاؤ آکر۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہاتھ دھو کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ ٹیبل پر اس کی سوتیلی ماں اور دونوں بچے بھی موجود تھے۔ روشن آپا نے اس کے لیے پلیٹ لا کر رکھی اور اشارے سے پوچھ کر چاول اس کی پلیٹ میں ڈال دیے۔ وہ خاموشی سے کھا رہا تھا کہ ہاشم نے اسے مخاطب کیا۔

"کہاں تھے آج سارا دن؟ کہاں مصروف رہتے ہو۔ تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"وی آئی پی لوگوں سے بات کرنے کے لیے، پہلے سے وقت لینا پڑتا ہے۔" شیما نے اپنی پلیٹ پر جھکے جھکے طنزیہ جملہ اچھال ہی دیا۔ اس نے کچھ جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ہاشم نے آنکھ کے اشارے سے اسے روکا۔

"جی میں ادھر خدا کی بستی میں تھا۔ وہ لوگ بڑی مصیبت میں آگئے ہیں بابا! بارشیں تیز ہو رہی ہیں اور اب سیلابوں نے دریاؤں اور ڈیموں کو بھرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر ڈیم میں شگاف ڈالا تو سیلاب کے طوفانی ریلے پوری بستی کو بہا کر لے جائیں گے۔ ہزاروں لوگ مارے جائیں گے۔"

"ہاں تو ان لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں ہے کیا؟ وہ جگہ چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ پر کیوں نہیں چلے جاتے۔ کوئی عارضی بندوبست تو کر سکتے ہیں نا۔ سیلاب گزر جائے تو واپس آجائیں۔ کچے پکے گھر ہی ہوں گے نا۔ دوبارہ بنالیں... کم از کم جان تو بچ جائے گی۔" شیما نے جلدی جلدی پلیٹ میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا، تو ولی نے گھور کر اسے دیکھا۔

"ہزاروں لوگوں کے لیے عارضی رہائش کہاں سے آئے گی۔ اور پھر وہی ایک بستی تو نہیں ہے۔ دریا کے کنارے کتنی ساری بستیاں ہیں وہ سب لوگ کہاں جائیں گے۔ آپ کہیں تو میں انہیں آپ کے گھر کا ایڈریس دے دوں۔"

"میرا گھر کیوں؟ اور اتنے سارے لوگ ایک گھر میں کیسے آسکتے ہیں۔ سوچ کر تو بولا کرو۔"

"سوچ کر ہی بول رہا ہوں۔ اور وہ بھی بابا سے، کہ اگر یہ کچھ کر سکتے ہیں، تو کر دیں ان مصیبت کے ماروں کے لیے۔ ورنہ زندگی بھر یہ پچھتاوا ستاتا رہے گا کہ ہزاروں لوگ صرف اس لیے مارے گئے کہ انہوں نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا۔ خون ناحق کا ملبا ان کے سر پر بھی آئے گا۔"

"تمہیں اگر ان سے اتنی ہمدردی ہے، تو خود کچھ کیوں نہیں کرتے۔ باپ کے سر پر پہلے پریشانیاں کم ہیں کیا۔ جو ان کی جان کھانے کے سو طریقے ڈھونڈتے رہتے ہو۔"

"میں خود ہی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے ان سے مدد کی درخواست کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ اختیار رکھتے ہیں اور چاہیں تو یہ بلا ٹال سکتے ہیں آخر یہ سرکاری چاکری کب کام آئے گی؟ لیکن نہیں۔ ان کا مقصدِ زندگی تو اب صرف آپ کو اور آپ کی اولادوں کو پیمپرڈ کرنا رہ گیا ہے۔ دوسرے لوگوں کی بھلائی کا تو جب سوچیں، جب اپنوں سے فرصت ملے۔ آپ اور آپ کی اولادوں کے فرمائشی پروگرام ہی ختم نہیں ہوتے۔" اس نے تپے ہوئے لہجے میں کہا تو شیما نے اپنا کانٹا زور سے پلیٹ میں پھینکا۔

"میں اور میری اولادیں تو ہمیشہ ہی تمہاری نظر میں تنکا بن کر چبھتی رہتی ہیں۔ ابھی انہوں نے میرے ہی بیٹے کو تو امریکا کی ایک مہنگی یونیورسٹی میں داخلہ دلوایا ہے۔ پورے سمسٹر کی بھاری بھرکم فیس اور اتنا مہنگا ٹکٹ۔ یہ سب کچھ عفان، یعنی میرے بیٹے کے لیے ہی تو کیا ہے۔ تم تو اپنے باپ کا مضبوط بازو بن کر ان کے ساتھ کھڑے ہو۔ ہے نا؟" شیما چیں بہ چیں ہوکر چلائیں۔

"بس یہی تو مسئلہ ہے۔ یہی مسئلہ ہے کہ آپ یہ دیکھ ہی نہیں سکتیں کہ بابا میرے لیے کچھ بھی کریں۔ کیونکہ وہ تو صرف آپ کے شوہر اور آپ کے بچوں کے باپ ہیں...... اور ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد۔ اور مجھ ایسے اجنبی کے لیے یہ کچھ کریں۔ یہ آپ کو برداشت نہیں ہے۔"

"ہاشم دیکھ رہے ہیں۔ کتنی زبان چلا رہا ہے میرے سامنے۔ آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟" شیما کی توپوں کا رخ ہاشم کی طرف مڑ گیا۔

"روشن سالن اتنا ٹھنڈا کیوں ہے؟ ٹھیک سے گرم کر کے لاؤ۔ اور پانی بھی ٹھنڈا لے کر آؤ۔" انہوں نے بیوی کو کوئی جواب دینے کے بجائے گھر کی میڈ کو کام بتایا، تو شیما اور چڑ گئیں۔ اٹھ کر جانا چاہتی تھیں کہ ہاشم نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکا۔

"بیٹھ جاؤ۔ کھانا کھاؤ۔ اور بچوں کو بھی ٹھیک سے کھلاؤ۔ ورنہ یہ بھی بھوکے اٹھ جائیں گے۔ بیٹھو۔"

شیما ہاشم کو شکایتی نظروں سے دیکھتی ہوئی واپس بیٹھ گئیں۔

"ولی! تمہاری روانگی کب ہے؟" انہوں نے سوال ایسے کیا جیسے وہ بہت بے چینی سے اس کے جانے کے منتظر ہوں۔

"میں آپ سے فوری توجہ طلب مسئلے پر بات کر رہا ہوں اور آپ میرے جانے کا پوچھ رہے ہیں۔ بابا! خطرے کو سامنے دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے، نہ تو خطرات ٹلتے ہیں۔ اور نہ ہی مصیبتیں دور ہوتی ہیں۔ ان کے لیے عملی طور پر کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ آپ کر سکتے ہیں۔ لیکن...... شاید... آپ......" ولی بول ہی رہا تھا کہ فون کی رنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے جیب سے فون نکال کر دیکھا تو مکرم صاحب کا نام دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا، وہ وہاں سے اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

"السلام علیکم انکل! آپ اس وقت فون پر؟ سب خیریت۔ ہے نا؟"

''نہیں میاں۔ خیریت کہاں؟ سارہ کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔ صبح دس بجے کی نکلی ہوئی ہے۔ اور ابھی تک واپس نہیں ہوئی مجھے کہہ کر گئی تھی کہ وہ اپنی منسٹری آفس جارہی ہے۔ اس کی گیارہ بجے سیکریٹری سے میٹنگ ہے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں واپس آجائے گی۔ میں دوپہر سے اب تک اس کے فون پر پتا نہیں کتنی کالز کرچکا ہوں، بیل ہورہی ہے۔ لیکن وہ اٹینڈ نہیں کررہی ہے۔ اب اتنی رات بھی ہوچکی ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے ولی!''

''آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا انکل! خیر کوئی بات نہیں۔ میں آتا ہوں۔ پوری سچویشن کو سمجھ کر پھر ہم اسے تلاش کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ میرے لیے بھی یہ بہت بڑی پریشانی کی بات ہے۔ لیکن ہمیں اسے تلاش کرنا ہی ہے...... میں آرہا ہوں۔''

وہ فون کو جیب میں ٹھونستا ہوا تیزی سے اندر گیا۔ ڈائننگ ٹیبل کے کونے پر اس کی بائیک کی چابیاں پڑی تھیں۔ وہ اٹھا کر تیزی سے بیرونی دروازے کا رخ کررہا تھا کہ ہاشم نے پوچھ لیا۔

''کیا ہوا؟ اتنی تیزی میں کہاں جارہے ہو؟ سب خیریت ہے نا؟''

''نہیں۔ خیریت بالکل بھی نہیں ہے۔ سارہ کی طرف جارہا ہوں۔ وہ صبح دس بجے اپنی منسٹری کے ہیڈ کوارٹر گئی تھی، اور ابھی تک واپس نہیں لوٹی ہے۔ نہ ہی اس کے فون پر کوئی کانٹیکٹ ہورہا ہے۔ اسی کو تلاش کرنے جارہا ہوں۔''

''ٹھہرو ولی! سنو......'' عبداللہ ہاشم اسے پکارتے رہ گئے لیکن وہ اَن سنی کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد وہ دیوانوں کی طرح سارہ کی تلاش میں ہر اس جگہ گیا جہاں سے ایک فیصد بھی اس کے ملنے کی امید ہوسکتی تھی۔ مکرم صاحب اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ شدید بارش ہورہی تھی۔ ہر جگہ لائٹ گئی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں ٹمٹماتے ہوئے روشنی کے دیے سے نظر آتے، لیکن وہ اندھیرے کی مہیب چادر کو کاٹنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ مکرم صاحب کی گاڑی بھی پانی سے بھرے راستوں پر چلتے ہوئے کئی بار بند ہوئی لیکن ولی کی بے تابیاں پھر اس کو چلنے پر مجبور کردیتی تھیں۔ رات کے تین بجے تو اس کا حوصلہ بھی ٹوٹنے لگا۔ مکرم صاحب نے بھی اس کی دگرگوں حالت کو محسوس کیا اور ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا۔

''چلو میاں! پولیس اسٹیشن چلو۔ وہاں سارہ کی گمشدگی کی رپورٹ لکھواتے ہیں۔ تاکہ پولیس بھی اسے تلاش کرنے میں ہماری مدد کرے۔ شاید وہ ڈھونڈ نکالیں، چلو!'' اس نے اسٹیئرنگ پر رکھا ہوا سر اٹھایا اور روبوٹک انداز میں گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ اب اس کے وسوسے بھی اندیشوں میں بدل رہے تھے۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ سارہ کے ساتھ کچھ انہونی ہوچکی ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے خیر کی دعا مانگ رہا تھا۔ چھاجوں برستی بارش میں پولیس اسٹیشن کے ماتھے پر جلتا ہوا بلب بھی محدود دائرے میں کمزور سی روشنی فراہم کررہا تھا۔

''سرجی! آپ لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ چوبیس گھنٹوں سے پہلے نہیں لکھوا سکتے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی کے ساتھ چلی گئی ہو۔ اور آپ کو صبح ہوتے ہی فون آجائے کہ پاپا میں نے نکاح کرلیا ہے۔ اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ کل گیارہ بجے تک انتظار کرلیں۔''

ولی کو غصے میں بھڑکتا دیکھ کر مکرم صاحب نے ہلکے سے اس کے ہاتھ کو دبایا، اور ایس ایچ او سے کہا۔

''نہیں ایس ایچ او صاحب! میری بیٹی جس سے شادی کی خواہش مند ہے، وہ میرے ساتھ ہے۔ اور وہ کوئی ٹین ایجر نہیں ہے، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذمے دار سرکاری افسر ہے۔ اس لیے ایسا ممکن نہیں ہے۔ آپ پلیز ایک باپ کی پریشانی کو سمجھیں، اور میری بیٹی کی تلاش میں میری مدد کریں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اس کے ساتھ کوئی انہونی نہ ہوگئی ہو۔'' جملہ ختم ہونے سے پہلے ان کی آواز بھرا گئی۔

''اچھا اچھا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اپنے طور پر کوشش کرتا ہوں۔ لیکن باقاعدہ ایف آئی آر کل دن میں گیارہ بجے سے پہلے لکھ نہیں پاؤں گا۔ ویسے بھی موسم اتنا خراب ہے اور اسٹاف کی بہت کمی ہے۔ میں پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔ آپ گھر جائیں۔ کوئی اطلاع ملتی ہے، تو میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔''

وہ دونوں باہر آئے تو مایوسی کی شدید لہر نے ولی کو زور زور سے رونے پر مجبور کردیا۔ مکرم صاحب نے اسے گلے سے لگالیا۔ تسلی دینے کے لیے تو الفاظ تھے ہی نہیں ان کے پاس، بس خاموشی سے اسے بانہوں میں بھینچے ہوئے اس کی پیٹھ ہلکے ہلکے تھپتھپاتے رہے۔ ان کے اپنے آنسوؤں کو تو بارش دھو ہی رہی تھی۔ کچھ وقت لگا اس جوار بھاٹے سے نکلنے میں۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے لگے تو معلوم ہوا کہ گاڑی کے اندر بھی پانی بھر گیا ہے۔ وہ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ولی کو کچھ خیال آیا تو اس نے فون نکال کر زاہد کا نمبر ملایا۔ وہ نیند سے بیدار ہوا اور اونگھتی ہوئی

آواز میں ہیلو کہا، تو ولی کا دل پھر اُمڈ آیا۔

”اوئے ولی! تو رو رہا ہے؟ کیا ہوا ہے؟ دیکھ یارا میرا دل اس معاملے میں بڑا کمزور ہے۔ میں دوستوں کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ تُو تو جگر ہے۔ بتا کیا ہوا؟“

جواب میں ولی نے اسے پوری داستان سنا ڈالی۔ تو وہ غصے میں آ گیا۔

”یہ پولیس والے بھی ہمارے نہیں ہیں۔ یہ ہمارے مسئلوں میں پڑنا ہی نہیں چاہتے۔ کسی سیاست داں کے جوتے صاف کرنا ہوتے، تو ابھی سر کے بل جاتے۔ خیر تو پریشان نہ ہو۔ میں اپنے سب دوستوں کے ساتھ نکلتا ہوں۔ ہم مل کر سارہ کو تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ مل جائے گی۔ فکر نہ کر۔ ہم مل کر ڈھونڈ لیں گے اُسے۔ تو بتا۔ کہاں ہے اس وقت کہاں آنا ہے ہمیں؟“

”میرے ساتھ انکل ہیں۔ میں انہیں گھر چھوڑتا ہوں پھر تمہاری طرف آتا ہوں ــ تم لوگ ڈھابے کے پاس مل جاؤ۔ بستی تک پہنچنا میرے لیے مشکل ہو جائے گا۔ وہاں بھی سڑک دریا بنی ہوئی ہوگی۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ اوکے!“

پھر وہ زاہد اور اس کے دوستوں کے ساتھ مل کر صبح تک سارہ کو ڈھونڈتے رہے لیکن اسے نہ ملنا تھا، نہ وہ ملی۔ طلوع ہوتے سورج نے اسے مکمل طور پر مایوس کر دیا۔ اب اسے اس کی کوئی امید نہیں رہی تھی کہ سارہ اسے زندہ مل سکے گی۔ ڈھابے کے سامنے پہنچ کر اس نے جب گاڑی روکی تو دل شکستگی نے اسے بے حال کر دیا۔ وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگا تو زاہد نے اس کا کاندھا تھپک کر تسلی دی۔ اور وہ لوگ گاڑی سے اترنے لگے تو ولی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اچانک اس کی نظر چاچا کے ڈھابے پر پڑی تو وہاں چولھے جل گئے تھے پراٹھے پکنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسی وقت ولی نے خسروں کے اسی مخصوص ٹولے کو اس طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ چونکا پھر اس نے زاہد کو آواز دی۔

”زاہد! ان خسروں سے بہت ہوشیار رہنا۔ یہ خسرے نہیں۔ مرد ہیں سارے کے سارے۔ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تم ان سے پنگا مت لو۔ ہو سکتا ہے انہیں تمہارے پیچھے لگایا گیا ہو۔ تم لوگ جو بستی کو بچانے کی مہم چلا رہے ہو اور شمشیر کی ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ذریعے تم سب کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ اس لیے۔ بی کیئر فل اباؤٹ دیم۔“

”ارے چھوڑ یار! یہ کیا کر لیں گے۔ ویسے بھی میں کوئی اکیلا تو ہوں نہیں۔ میرے ساتھ یہ سب بھی ہیں۔ وہ کرنے کی کوشش انہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ ہم کوئی مہاں تو ہیں نہیں۔ دیکھ لیں گے۔ اچھا دیکھ! سارہ کے لیے جو کچھ بھی ہم کر سکتے ہوں۔ بتانا۔ ہم ہمیشہ تیرے ساتھ ہیں۔“

ولی نے سر ہلاتے ہوئے زاہد کے باقی دوستوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اس بڑے سے کانفرنس روم میں پریزنٹیشن چل رہی تھی۔ لمبی میز کے دونوں جانب دس بارہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ شمشیر خان اور دل شیر خان دونوں بھائی بھی وہاں بیٹھے پوری توجہ سے اس سول انجینئر کی طرف متوجہ تھے جو وائٹ اسکرین پر کسی رہائشی بستی کے بلیو پرنٹس دکھا رہا تھا۔ اس کے فیچرز کے بارے میں مناسب الفاظ میں وضاحتیں دے رہا تھا۔ وہ ایک جدید تعمیراتی منصوبہ تھا۔ جس میں نہ صرف سہولیات بلکہ خوب صورتیاں بھی رکھی گئی تھیں۔ مثلاً دریا کنارے گھروں کے پچھلے حصے میں دریا تک جانے کا راستہ بھی اس میں شامل تھا۔ گھر کے اگلے حصے میں گاڑی کے لیے گیراج، اور پچھلے حصے میں کوئی چھوٹی اسپیڈ بوٹ رکھنے کے لیے مختصر سی جیٹی سوسائٹی کے اندر... جھیل، پارکس اور کمرشل حصے بھی تھے۔ وہ ایک بہت خوب صورت رہائشی اسکیم تھی۔ پوری امید تھی کہ جیسے ہی اس کی لانچنگ ہو گی چند دنوں کے اندر اندر اس کی بکنگ مکمل ہو جائے گی۔ اور وعدے کے مطابق تین سال کے عرصے میں وہ مکان اور اپارٹمنٹس مکمل بنا کر پزیشن دے دیں گے۔

”پروجیکٹ نہیں، سونے کی کان ہے۔ کیوں بھائی جی! کیسا لگا۔ پوری اسکیم ہی لاجواب ہے نا؟“ شمشیر خان نے اپنے بڑے بھائی دل شیر خان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”ہاں شمشیرے! اسکیم تو بڑی اچھی ہے۔ پر زمین خالی کروا ان ملنگوں سے۔ انہوں نے بڑا شور ڈالا ہوا ہے۔ کہتے ہیں جان دے دیں گے، زمین نہیں دیں گے۔ نہ ہوئی خالی زمین، تو پھر۔ یہ سب بیکار ہو جائے گا۔“

”کیسی بات کرتے ہو بھائی جی! کروڑوں کی رشوت دی ہے میں نے۔ اور مزید کئی کروڑ کا خرچہ کر کے زمین تو لینا ہی ہے۔ ہیں جی! وہ جو کہتے ہیں نا کہ جان دے دیں گے۔ زمین نہیں۔ تو پھر جان ہی دے دیں تو ٹھیک ہو جائے گا۔ مر جائیں گے سارے۔ تو زمین تو آپ ہی خالی ہو جائے گی۔ کوئی للو پنجو نہیں ہوں کہ اتنا بھی نہ کر سکوں۔ ایم این اے ہوں۔ کوئی مذاق نہیں ہوں۔“

''اوئے! کوئی دو چار نہیں۔ ہزاروں ہیں اس ایک بستی میں۔ اور وہی ایک بستی نہیں ہے تجھے فیکٹری والی زمین بھی خالی کروانی ہے۔ اتنے لوگوں کو کیسے مارے گا؟''

''بھائی جی! میں مارنا نہیں چاہتا تھا ان سب کو۔ شرافت سے کب سے بول رہا ہوں کہ بستی خالی کردو۔ مانتے ہی نہیں۔ کیا کروں پھر زمین تو مجھے ہر صورت لینا ہے۔ اگر وہ وہاں سے بستی خالی کرکے نہیں گئے۔ تو مرنا ہی پڑے گا۔''

''اوئے! کیا بمباری کروائے گا اسرائیل کی طرح۔ مت ماری گئی ہے تیری شمشیرے!'' دل شیر حیران ہوا۔

''ارے نہیں بھائی جی! بس ایک بھیانک سیلاب لانا پڑے گا۔ آخر آپ کی زمینیں بھی تو بچانا ہیں.... کنک تیار کھڑی ہے۔ چاول بھی تھوڑے عرصے میں تیار ہونے والا ہے۔ پھر باغ بھی سارے تباہ ہوجائیں گے۔ کتنا نقصان ہوجائے گا آپ کا۔ اگر سیلاب نے آپ کی زمینیں ڈبو دیں۔ کیا کریں گے؟''

''سیلاب تو آنے ہی والا ہے۔ تو اسے کیسے روک سکتا ہے شمشیر؟ اور اگر جیسی خبریں ہیں، ایسا سیلاب آیا تو میری تو ساری فصلیں بھی تباہ ہوجائیں گی۔ میں تو ان کے ایکسپورٹ کے سودے بھی کرچکا ہوں۔ نہ رہی فصلیں، تو میں تو قرضوں میں ڈوب جاؤں گا۔ زمین ساری دلدلی ہوگئی تو پتا نہیں اگلی فصل بھی ہو کہ نہ ہو۔ میں تو اسی پریشانی میں ہوں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا بھائی جی! آپ کی فصلیں ڈوبنے نہیں دوں گا۔ بس اتنا کرنا ہوگا کہ بند کے اگلے حصے میں شگاف ڈلوا دوں گا۔ چیختا چنگھاڑتا سیلاب کا سارا پانی ان بستیوں کو بہا کرلے جائے گا۔ اور زمین صاف ہوجائے گی۔ لو جی! آپ کی فصلیں بھی بچ گئیں اور میری زمین بھی خالی ہو کر، دھل دھلا کر مجھے مل جائے گی۔ کیسا رہے گا بھائی جی!''

''کیا بات ہے تیری شمشیرے! بڑا دماغ تیز ہے تیرا۔ کیسے سوچ لیتا ہے یہ ساری باتیں۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آتیں۔''

''ارے بھائی جی! آپ اپنی زمینوں، فصلوں، ان کی ایکسپورٹ اور امپورٹ وغیرہ کے بارے میں کیسے سوچتے ہو۔ ان سے پیسہ کیسے کمانا ہے۔ ان سب پر تو اتھارٹی ہونا۔ مجھے یہ سب اتنا سمجھ میں نہیں آتا۔ بس مجھ سے تو تعمیر کروالو۔ مزدور آدمی ہوں میں۔''

''اور خیر ہو تیری مزدور! تیرے جیسے دو چار مزدور اور ہوجائیں تو بس پھر باقی سب کا اللہ ہی وارث ہے۔'' دونوں بھائی ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیے۔

☆☆☆

سورج اوپر آچکا تھا۔ ہوٹلوں پر ناشتے کے لیے بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اطراف پر ڈالی اور سوچ میں گم ہوگیا کہ لوگ کس قدر بےفکر ہیں۔ ان کی زندگی میں جیسے کوئی پریشانی ہی نہیں۔ سب حالات اور ان کے انجام سے بےخبر زندگی کے مزے میں گم ہیں۔ ایک وہ ہے کہ اس کی جان جن بکھیڑوں میں ایک بار الجھی ہے، تو نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ سارہ کی پریشانی دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ اب اسے واپس جانا تھا۔ انکل کا احوال معلوم کرنا تھا اور یہ مایوس کن خبر سنانا تھی کہ رات بھر کی تلاش کے بعد بھی ان کی بیٹی کو وہ ڈھونڈ نہیں پایا۔ اس نے مایوسی سے سر کو جھٹکتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی تو یکایک فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر مجبور کے نام سے کال آرہی تھی۔ اس نے تلخی کی لہر اپنے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ دراصل اس نے میڈم علینہ کا نام مجبور کے نام سے سیف کیا ہوا تھا۔ کیونکہ انہوں نے یہی کہا تھا کہ وہ بہت مجبور ہیں، کچھ نہیں کر سکتیں۔ اس وقت انہی کی کال آرہی تھی۔ اس نے بادلِ ناخواستہ کال ریسیو کی۔

''ہیلو! جی فرمایئے۔ نہیں۔ تمام رات کی تلاش کے باوجود اس کا کوئی پتا نشان نہیں مل رہا ہے۔ پولیس نے بھی سارہ کی گمشدگی کی رپورٹ لکھنے سے انکار کردیا ہے۔ نہیں۔ پوری رات میں اور میرے دوست اسے ہر ممکنہ جگہ پر ڈھونڈتے رہے، نہیں ملی۔ کیا بتاؤں اس قدر بارش ہورہی تھی کہ سڑکیں دریا بن گئی تھیں۔ اور پورے شہر میں لائٹ نہیں تھی۔ کیسے ڈھونڈتا۔ ابھی اس کے والد کی طرف جارہا ہوں۔ ان کا پتا نہیں کیا حال ہوگا۔ ان کی گاڑی ہے میرے پاس۔ اسے وہاں چھوڑ کر دوبارہ تلاش میں نکلوں گا۔ اب بارش نہیں ہے دن کا وقت بھی ہے۔ کچھ آسانی ہوجائے گی۔ شاید کوئی پتا نشان مل سکے۔'' وہ کچھ دیر دوسری جانب کی بات سنتا رہا، اس کے بعد فون بند کرکے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ سارہ کے گھر پہنچ کر اندر گیا تو مکرم صاحب صوفے پر نڈھال پڑے بری طرح رو رہے تھے۔ آواز تو کم تھی لیکن ان کا پورا وجود ہچکیوں اور سسکیوں کی زد میں بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔

وہ گھبرا گیا۔ ''انکل...... انکل...... کیا ہوا؟ رو کیوں رہے ہیں؟''

مکرم صاحب نے لبریز آنکھوں سے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ ٹی وی چل رہا تھا اور اس پر خبریں چل رہی تھیں۔ نیوز کاسٹر کے ساتھ ہی ایک

چھوٹی ونڈو میں سارہ کی تصویر دیکھ کر وہ پوری طرح اس طرف متوجہ ہوگیا۔ خبر اس کے بارے میں تھی اور بتایا جارہا تھا کہ کل کی شدید بارش میں ایک سرکاری افسر سارہ مکرم گاڑی سمیت پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے ڈوب کر ہلاک ہوگئیں۔ ان کی گاڑی انڈر پاس میں بھر جانے والے گہرے پانی میں ڈوبی اور پانی اندر بھر جانے کے سبب سارہ گاڑی سے باہر نہ نکل پائیں۔ پھیپھڑوں میں پانی بھر جانے کے سبب وہ دم گھٹنے سے انتقال کر گئیں۔ ان کی موت نے ملک میں سوگ کی فضا طاری کر دی اور بھی نیوز کاسٹر جانے کیا کیا کہہ رہی تھی لیکن ولی کے کانوں میں بہت تیز سائیں سائیں کی صدائیں گونج رہی تھیں اور اس کا وجود جیسے پتھر ہوگیا۔ ہر صدا، ہر حرکت اور ہر سماعت منجمد ہوگئی۔ اس کے لیے دنیا چلتے چلتے یکلخت رک گئی تھی۔ اور وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

وہ ایک ایسے ٹروما میں آگیا تھا کہ اس کے سارے احساسات منجمد ہوگئے تھے۔ سارہ کی لاش اسپتال میں تھی۔ کب اس کا پوسٹ مارٹم ہوا، کب اس کی لاش کو گھر لایا گیا۔ کب اس کے وجود کو خوشبو میں بسا کر لحد کی سنگین خنکی میں اتارا گیا اور کب اس نے اس کے نازک وجود کو مٹی کے ڈھیر میں دبا دیا۔ وہ ایک روبوٹ کی طرح یہ سب کرتا رہا اور گھر آکر بھی اسی طرح بیٹھا رہا۔ کھانا پینا سونا بے معنی سی مصروفیات تھیں۔ وہ تمام رات بستر پر بیٹھا اندھیروں میں گھورتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اس کی سرخ سوجی ہوئی آنکھیں اندر کی تباہی کو چھپانے میں ناکام تھیں۔ نہ جانے کس وقت زاہد اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اسے آواز دی تو اس نے اجنبیوں کی طرح اسے دیکھا۔

''اس طرح کیا دیکھ رہا ہے۔ میں زاہد ہوں۔ تیری فکر میں مجھے بھی ساری رات نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی یہاں تیرے گھر پہنچا۔ تو تیرے بابا نے مجھے یہاں تیرے کمرے میں بھیج دیا۔ چل اٹھ! ابھی بہت کام ہے۔ سارہ کا سوئم ہے۔ مکرم صاحب بہت اکیلے اور بہت غمزدہ ہیں۔ میں باقی سب کو وہاں چھوڑ کر تجھے لینے آیا ہوں۔ چل اٹھ! منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لے پھر چلتے ہیں۔''

اس نے ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا تو وہ تب بھی روبوٹ کی طرح اس کے کہنے پر عمل کرتا رہا۔ اتنے میں روشن آپا اس کے لیے ناشتا لے آئیں۔ زاہد نے ناشتے کی طرف اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ روشن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''ارے میاں! تم اسے ساتھ لے کر بیٹھو۔ خود بھی کچھ کھالو اور اسے بھی اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔ کل رات بھی ادھورا کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے تھے یہ۔ اور جب سے اب تک پانی بھی نہیں پیا ہے۔ بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

سارہ کے سوم میں کئی ایم این اے اور کئی ایم پی اے بھی آئے تھے۔ آفس کا اسٹاف بھی موجود تھا۔ سارہ کے ریسرچ سینٹر کے ساتھی۔ سب سارہ کی قابلیت اور اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کو سراہنے کے ساتھ افسوس کا اظہار بھی کرتے رہے۔ علاقہ پولیس افسر بھی آیا تھا۔ وہی جس کے پاس وہ سارہ کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے کے لیے گئے تھے۔

وہ ولی کے پاس آکر بیٹھا۔ اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے بہت غیر محسوس انداز میں اس کے کان میں ایک صور پھونک گیا۔

''میرے پاس تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔ کل کسی وقت آکر مجھ سے ملو۔'' ولی نے کچھ حیران ہوکر دیکھا لیکن وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اب ولی کے اندر کچھ برف پگھلنا شروع ہوئی اور اس نے افسر کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی اطلاع دینا چاہ رہا تھا۔ یقیناً کوئی بات تھی، جو سارہ سے متعلق تھی۔ اسے بے چینی سی ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دور بیٹھے ہوئے مکرم صاحب کو دیکھا۔ لوگ ان کے گرد بیٹھے اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ اور وہ صبر و برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ورنہ ان پر جو گزر رہی ہوگی، وہ ولی اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

کیا اطلاع ہوسکتی ہے۔ سارہ طوفانی بارش کا شکار ہوکر پانی میں ڈوب گئی۔ اس کے بارے میں کیا اطلاع ہوسکتی ہے۔ وہ سوچتا رہا لیکن کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ ذہن نے اس سے آگے کام کرنے سے انکار کر دیا تو گھر واپس آگیا۔ عجب بے حسی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ بستر پر نیم دراز ہوکر ٹی وی پر خبریں دیکھنے لگا۔

جگہ جگہ ہونے والے احتجاج کو ویڈیوز کے ذریعے دکھایا جارہا تھا۔ پھر ایک جگہ کیمرا آکر رکا تو اس نے دیکھا کہ زاہد، اس کے سارے دوست اور بستی کے بے شمار لوگ کچھ کاغذات جلا رہے ہیں اور حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔ ایک رپورٹر نے زاہد تک رسائی حاصل کی اور سوال پوچھے۔

''یہ آپ لوگ کس قسم کے کاغذات جلا رہے ہیں؟''

''یہ وہ نوٹس ہیں جو مقامی حکومت کی جانب سے ہمیں بھیجے گئے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ایک ماہ کے اندر اندر

اپنے گھر خالی کر کے اٹھ جانا ہے۔ ورنہ ہم لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ آپ بتائیں۔ ہماری بستی سالوں سے یہاں آباد ہے۔ ہم تیسری نسل ہیں جس نے یہیں جنم لیا اور یہیں پلے بڑھے ہیں۔ ہمیں کوئی یہاں سے کھڑے کھڑے نکال دے اور کوئی اور رہنے کی جگہ بھی نہ دے۔ تو ہم سب کہاں جائیں گے۔ کسی کو ہمیں ہمارے گھروں سے اس طرح نکال دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ دراصل ہمارا ایم پی اے اس زمین پر اپنی کوئی رہائشی اسکیم بنانا چاہتا ہے۔ اسے یہ جگہ ہر صورت خالی کروانا ہے لیکن ہم اپنے گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔''

''شمشیر خان مردہ باد...... شمشیر خان مردہ باد......'' یہ نعرے لگنا شروع ہوئے تو ان کی گونج دور دور تک سنائی دینے لگی۔ اور یہ نعرے لگوانے والا زاہد ہی تھا۔

ولی نے کئی چینل تبدیل کر کے دیکھا تقریباً سارے چینل یہی خبر لائیو چلا رہے تھے۔ ان خبروں میں زاہد ان سب کا لیڈر ہونے کی ترجمانی کر رہا تھا۔ وہ اپنے لوگوں کی بے بسی اور اُن پر ہونے والے اس ظلم کو بہت اچھے اور پُرجوش انداز میں دور دور تک پہنچا رہا تھا۔ اب وہ ان سب کا لیڈر بنتا جا رہا تھا۔ صرف سیاسی لیڈر ہی نہیں، بلکہ بعض این جی اوز اور دوسرے عوامی فلاحی اداروں کے کرتا دھرتا بھی اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس جگہ پہنچ جاتے تھے۔ سو وہ بھی ٹی وی پر نظر آنے لگے تھے۔ تو ایک طرح سے یہ ساری احتجاجی مہم زاہد نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ ولی بھی اس کی تقریریں سن کر بڑا متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے یہ سب دیکھ کر کل اس کے پاس جانے اور اس سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس بُرے وقت میں ولی نے اپنے غم کا سہارا لے کر اسے اور اس کے ساتھیوں کو تنہا چھوڑ دیا۔

پھر اسے یاد آیا کہ اسے پولیس افسر سے ملنے بھی جانا ہے، تو وہ اٹھ گیا۔ باہر نکل کر اپنی بائیک نکالی اور باہر نکل کر اسے اسٹارٹ کرنے کے لیے کک مارتا رہا لیکن وہ ناراض تھی۔ کئی کوششوں کے باوجود اس نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا تو وہ جھنجلا گیا۔ سوچ رہا تھا کہ اسے اسی طرح کھینچتے ہوئے مکینک کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ برابر والے گھر سے اس کا دوست ثاقب باہر نکلا۔

''ارے ولی بھائی! کیا ہوا؟ ناراض ہو گئی آپ کی بسنتی۔''

''ہاں یار! بُرا وقت چل رہا ہو تو سب کچھ ہی بُرا ہونے لگتا ہے۔ اب اتنا ضروری ایک جگہ جانا ہے، لیکن اس کی وجہ سے دو گھنٹے لیٹ ہو جاؤں گا۔''

''اسے چھوڑیں ولی بھائی! میں گاڑی لاتا ہوں۔ آپ کو جہاں جانا ہو مجھے بتائیے۔ میں آپ کو لے کر جاتا ہوں۔'' ثاقب اور وہ ابتدا سے محلے دار تھے۔ اس ناتے دوستی بھی اتنی ہی پرانی تھی۔ ثاقب جانتا تھا کہ آج کل وہ کن پریشانیوں سے گزر رہا ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ آسانیاں فراہم کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں یار! رہنے دے۔ تجھے یونیورسٹی نہیں جانا ہے کیا؟ خواہ مخواہ میرے ساتھ خوار ہوگا۔''

''کوئی خواری نہیں بھائی! یونیورسٹی آج بند ہے۔ بارش کی وجہ سے۔ میرے پاس سارا دن ہے۔ میں آپ کے ساتھ سارا دن رہ سکتا ہوں۔ آپ اسے واپس اندر رکھیں۔ میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔''

وہ ثاقب کے ساتھ پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔ لوگ، گاڑیاں اور نہ جانے کیا کیا، سب حرکت میں تھے۔ ولی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس شہر میں کتنے لوگ ہیں۔ بارش نے سارہ کو ہی کیوں چنا۔ کیسے وہ اس حادثے کا شکار ہوئی۔ اتنی غیر ذمے دار تو وہ تھی نہیں کہ سڑکوں پر بھرے پانی میں اپنی سمت کو پہچان نہیں سکی۔ اور ایک ایسے گڑھے میں گاڑی سمیت ڈوب کر ہلاک ہو گئی، جہاں اس کی موجودگی ہی ایک سوالیہ نشان تھی۔ وہ اس کا راستہ تھا ہی نہیں۔ پھر وہ اُدھر کیوں گئی تھی؟ ایک سوالیہ نشان ولی کے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں گم باہر کے مناظر کو بے دھیانی سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک خوفناک منظر پر پڑی۔

سڑک کے دوسری جانب وہ منظر دیکھ کر وہ چلا پڑا۔

''روک...... روک...... وہ دیکھ۔ وہ جو آدمی بھاگا جا رہا ہے۔ اس کی مدد کرنا ہے۔ سڑک کی دوسری جانب جانا ہے۔ جلدی کر۔''

''دوسری طرف۔ ولی بھائی! یوٹرن بہت دور ہے۔ وہاں سے آنے میں دیر لگے گی۔ اس کو کیا مسئلہ ہے۔ وہ تو خسروں سے بچ کر بھاگ رہا ہے۔ یہ تو ایسے ہی تنگ کرتے ہیں۔ کچھ دے دلا کر وہ جان چھڑا لے گا۔ آپ اس کے لیے اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟'' ثاقب نے کچھ حیران ہو کر ولی کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر حواس باختگی کے تاثر نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

''تجھے نہیں معلوم۔ یہ خسرے نہیں، مرد ہیں اور اس کی جان کو ان سے خطرہ ہے۔ وہ زاہد ہے۔ میرا دوست۔ اسے بچانا ہے یارا!''

"اچھا۔ تو پھر ایسا کرتا ہوں۔ میں تھوڑا آگے جا کر گاڑی سائڈ پر لگاتا ہوں۔ آپ اتر کر جاؤ اُس کے پاس۔ پھر میں یوٹرن لے کر آتا ہوں لیکن آپ اکیلے کیا کرو گے؟ کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے آپ کے پاس۔ اور وہ تعداد میں بھی پانچ چھ ہیں۔"

"کوئی بات نہیں ثاقب! گاڑی روک...... جلدی کر...... مجھے ہر صورت اُسے بچانا ہے۔"

ثاقب نے گاڑی سائڈ پر لگائی تو ولی اتر کر دیوانوں کی طرح سڑک کی دوسری جانب دوڑ پڑا، جہاں زاہد آگے آگے جان توڑ کر بھاگ رہا تھا اور وہی پانچ چھ خسروں کا گروہ اس کے پیچھے تھا، جن سے اس نے زاہد کو خبردار کیا تھا۔ آج انہوں نے زنانے کپڑوں اور میک اَپ کے ساتھ چہروں پر کچھ بہت ہی بھدے بنے ہوئے ماسک بھی لگا رکھے تھے۔ لیکن ان میں سے دو کے ہاتھوں میں زاہد نے لمبے خنجر یا کٹار ٹائپ کی چیزیں دیکھ لی تھیں۔ ولی چیختا ہوا زاہد کی طرف بھاگا۔ زاہد نے مڑ کر ولی کو آتے ہوئے دیکھا تو پیچھے آنے والے خسروں کی طرف اشارہ کیا اور دوڑتا ہی رہا۔ ولی نے ٹریفک کی پروا کیے بغیر دوڑتے ہوئے سڑک پار کی اور ان کے پیچھے دوڑا۔ گاڑیوں کے چیخنے والے بریکوں کی آواز سن کر بہت سے لوگ اس منظر کی طرف متوجہ ہوئے لیکن سوائے ویڈیوز بنانے کے اور کچھ نہیں کیا۔ صرف چند ہمت والے ایسے تھے جو ولی کے ساتھ میدان میں آئے۔

اتنے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر بھی ان خسروں کی رفتار میں کوئی کمی آئی اور نہ ہی ارادے بدلے۔ لوگ شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے آرہے تھے اور وہ زاہد کے نزدیک تر ہوتے جا رہے تھے۔ انہیں کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ لوگ انہیں روک لیں گے۔ یا کسی کے پاس گن ہوئی تو وہ گولی مار دے گا لیکن اس کے بجائے ان میں سے کسی نے ایک لمبا چاقو گھما کر پھینکا، جو سیدھا زاہد کے کاندھے کے نیچے لگا اور وہیں اٹک گیا۔ زاہد کی ایک ہچکی نکلی۔ اس کی رفتار کچھ کم ہوئی تو وہ خسرے اس کے اور نزدیک ہو گئے۔ ایک نے کٹار نما کوئی چیز زاہد کی طرف پھینکی جو اس کی پنڈلی میں پیوست ہو گئی۔ وہ چیخ کر ایک لمحے کو رکا، پھر اس سے دوڑا نہ گیا وہ وہیں رک کر آگے پیچھے جھول رہا تھا کہ نزدیک سے گزرتے ہوئے ان میں سے ایک نے لمبے پھل والے چاقو سے اس کی گردن کو نشانہ بنایا اور آگے دوڑتے چلے گئے۔ ولی نے بھی زور سے چیخ ماری اور وہیں پر رک گیا۔ پھر اس کے پاس گیا اور خون میں لت پت گرے ہوئے زاہد کے سر کو ہاتھوں پر اٹھایا تو اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک نظر ولی کو دیکھا اور ٹوٹتے ہوئے الفاظ میں بولا۔

"اچھا یار! اب ہم تو رخصت ہوتے ہیں۔ میں نے بستی کے لوگوں کو کہا تھا کہ وہ اس وقت تک بند پر دھرنا دے کر بیٹھیں، جب تک سیلاب گزر نہیں جاتا۔ اور اس دوران کسی کو بند کے نزدیک آنے کی اجازت نہ دیں کہ وہ اس میں شگاف ڈال سکیں۔ اب یہ تو دیکھ لینا اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرکے، بستی کو بچا لینا۔"

"نہیں۔ میں تجھے اسپتال لے جاتا ہوں۔ تو بچ جائے گا یار! ثاقب! ایمبولینس بلوا۔ نہیں تو اپنی گاڑی لے آ۔ اسے جلدی لے کر جانا ہے۔ اس کا خون بہت بہہ رہا ہے۔ جلدی کر۔"

"کوئی فائدہ نہیں ولی! بس تو وہ کر دینا، جو میں نے کہا ہے۔ بستی کے لوگوں کو بند کی حفاظت کے لیے وہاں بھیج دینا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں نہیں رہوں گا، لیکن میرے ساتھی، میرے دوست یقیناً تیرا ساتھ دیں گے۔ تو ان کا ساتھ دے گا نا؟"

ولی نے اپنے آنسوؤں کو روکا اور دور دوڑتے ہوئے خسروں کو دیکھا، تو وہ غصے کی شدت سے چیخ پڑا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر ان کے پیچھے بھاگا لیکن وہ تیز رفتار تھے۔ اس نے جھنجلا کر سڑک کے کنارے پڑا ایک بڑا پتھر اٹھا کر ان کے گرو کی طرف پھینک کر مارا لیکن وہ اس کی زد سے نکل گیا تھا۔ لوگ ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے، تاکہ پکڑ سکیں۔ آخر وہ ایک آدمی کو قتل کرکے بھاگ رہے تھے۔ لیکن اسی اثنا میں ایک سوزوکی وین جو پیچھے سے کھلی ہوئی تھی، ایک لمحے کو ان کے نزدیک آکر رکی اور وہ سب چھلانگ لگا لگا کر اس میں بیٹھ گئے۔ آخر میں گرو بیٹھا تھا اور اب وہ ولی کو بیہودہ سے اشارے کرتے ہوئے اس کی طرف فلائنگ کس اچھال رہا تھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لینے کا اشارہ کیا تو ولی کے تن بدن میں جلنے والی آگ اور بھی زیادہ فزوں ہو گئی۔ وہ دوڑتے دوڑتے رک گیا اور مڑ کر زاہد کی طرف واپس آیا۔ لوگ اس کے گرد جمع تھے اور بہت سے لوگ اس کی ویڈیوز بنا رہے تھے۔ اس نے ان میں سے کئی لوگوں کو دھکا دے کر ہٹایا اور دیکھا تو زاہد مر چکا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ لیکن اندر ہی اندر وہ گھٹ کر رہ گیا۔ زاہد جیسے لوگ بہت قیمتی ہوتے ہیں، جو کسی خاص مقصد کے لیے جیتے ہیں اور اسی کی خاطر جان بھی دے

دیتے ہیں۔ شاید وہ جاتے جاتے اسے بھی اپنی راہ پر لگا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بھینچ کر چند آنسوؤں کا نذرانہ اپنے دوست کی نذر کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

دونوں بھائی سر جوڑ کر بیٹھے تھے اور موجودہ صورت حال پر بات کر رہے تھے۔

''شمشیر! بارشوں کا زور ٹوٹتا نظر نہیں آرہا ہے۔ کل میں گیا تھا اُدھر۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔ ڈیم پورا بھر چکا ہے۔ اور تھوڑا ہی وقت اور ہے کہ اس کا پانی کنارے توڑ کر بہنے والا ہے۔ اور اس کے بعد کیا ہوگا۔ تجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میری ہزاروں ایکڑ پر تیار فصلیں پانی اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ تو بیٹھا تماشا دیکھتا رہے گا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جی! ایسے کیسے فصلیں بہہ جائیں گی۔ میں آپ کا اور اپنا کروڑوں اربوں کا نقصان کیسے ہونے دوں گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''اچھا...... تو پھر تو کیا کرے گا؟ ابھی تک تو تُو نے کچھ کیا نہیں ہے۔ جب بند ٹوٹ جائے گا اور نقصان ہو جائے گا۔ تب سر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے شمشیر! جو کچھ کرنا ہے۔ جلدی کر۔''

''فکر نہ کرو بھائی جی! ہفتے والے دن یہ کام ہو جائے گا۔ ہفتے کی رات کو بند ٹوٹے گا اور سارا سیلابی پانی دریا کنارے بستیوں کو روندتا ہوا نکل جائے گا۔ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

''دیکھ لے شمشیر! ہفتہ بولا ہے۔ تو ہفتے کو ہی ہونا چاہیے یہ کام کوئی بہانہ نہیں کہ یہ نہیں ہوسکا، وہ نہیں ہوسکا۔''

یہ ایک آڈیو ریکارڈنگ تھی جو کسی خیر خواہ نے میڈم علینہ کو بھیجی تھی۔ اس گفتگو کی خفیہ ریکارڈنگ کی گئی تھی اور میڈم علینہ نے اسے دو لاکھ کے عوض خریدا تھا۔

شمشیر خان، جو کنسٹرکشن کی دنیا میں ٹائکون کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ اور اس کا بھائی دل شیر خان جس کی زمینوں کا طول و عرض ایک دن میں ناپا نہیں جاسکتا تھا۔ ایک بھائی ایم پی اے، تو دوسرا بھائی ایم این اے۔ دونوں کی دولت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ لیکن ہوس کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی۔ علینہ نے افسوس میں سر ہلایا۔ کل سے وہ زاہد کے قتل کی خبریں سن اور دیکھ رہی تھیں۔ جس سفاکی سے اسے بھری پُری سڑک پر بے شمار لوگوں کے سامنے مارا گیا، وہ ہولناک تھا۔ لیکن قاتلوں کا اطمینان بتا رہا تھا کہ انہیں کسی جانب سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ محفوظ تھے۔ انہوں نے افسوس میں سر ہلایا۔

ولی کی آنکھ فون کی مسلسل بجنے والی گھنٹی سے کھلی۔ اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر میڈم کا نام دیکھ کر کچھ ہڑبڑی سی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر سوچا کہ بات کرے، یا نہ کرے۔ لیکن مسلسل بجنے والی گھنٹی نے کہا کہ اٹھالو فون۔ شاید کوئی اہم بات ہو۔

''ہیلو میم سوری۔ میں سو رہا تھا۔ کچھ دیر ہوگئی۔''

''ولی! شمشیر نے اپنی راہ کا ایک کانٹا تو نکال پھینکا ہے۔ بظاہر اس کے ارادوں کی تکمیل میں اب کوئی خاص رکاوٹ نظر تو نہیں آرہی ہے اس لیے بستیوں کی تباہی کا دن مقرر کیا جاچکا ہے۔ شاید ہفتے کا دن، یا رات۔ تم کم از کم بستی والوں کو اس بات سے خبردار کردو۔ تاکہ وہ جان بچانے کے اقدامات کرلیں۔ یہ آفت ٹلنے والی نہیں ہے۔ اوپر فیصلے ہو چکے ہیں۔''

''میں کیا کرسکتا ہوں؟ آپ بتایئے؟''

''تم کچھ بھی نہیں کرو گے۔ صرف وہاں کے لوگوں کو اس بارے میں مطلع کردو۔ جو کچھ کرنا ہے۔ وہی کریں گے۔ تم اس معاملے میں بالکل مت پڑنا۔ تم جانتے ہو زاہد کا انجام۔''

''کیا آپ کچھ نہیں کرسکتیں؟ آخر آپ بھی تو ایوانِ اقتدار و اختیار تک پہنچ رکھتی ہیں۔ اپوزیشن لیڈر کوئی کم طاقت نہیں رکھتا۔''

''خیال ہے تمہارا۔ میری بھی حدود کا تعین کر کے، مجھے آگاہ کردیا گیا ہے، کہ اگر اس سے باہر قدم نکالا تو انجام باپ سے مختلف نہیں ہوگا۔ میری طاقت صرف بولنے کی حد تک محدود ہے۔ جتنا چاہوں اور جو کچھ چاہوں بول سکتی ہوں، کر کچھ نہیں سکتی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''کاش آپ کچھ کرسکتیں۔''

''جو کچھ کرسکتی تھی، کردیا۔ تمہیں اطلاع دے دی جو سو فیصد درست ہے۔ اس سے آگے میرے پر جلتے ہیں۔ آگے تمہارا، اور اس سے بھی زیادہ خود بستی والوں کی ہمت اور حوصلے کا کام ہے۔''

''او کے۔ دیکھتا ہوں۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔''

اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ اور بھیگا ہوا ماحول بتا رہا تھا کہ بارش کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری ہے۔ وہ آلکسی میں دوبارہ بستر پر گر پڑا۔ لیٹے لیٹے اسے زاہد کا خیال آیا۔ اس نے مرتے مرتے یہ ذمے داری اس کے سر ڈال دی تھی کہ وہ اس کے چھوڑے ہوئے ادھورے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی بستی کو بچائے۔ اس کے لوگوں کو بچائے۔ وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر اسے میڈم علینہ کی وارننگ یاد آئی۔ پاپا کی

پریشانی اور ان کی مشکلیں یاد آئیں۔ ان کا اسے جلد سے جلد باہر بھیجنے کا... اصرار اور بے چینی یاد آئی۔ پاپا نے بہت کچھ داؤ پر لگا کر اس کے جانے کے انتظامات کیے تھے۔ سارہ اس دنیا سے جا چکی تھی۔ اس کے لیے اس ملک اور اس دنیا میں اگر کوئی تھا، تو وہ پاپا ہی تھے۔ اس نے بہت کچھ سوچتے ہوئے یہ پروگرام بنایا کہ وہ زاہد کے دوستوں کو بتانے کے بعد اگلے ہفتے.... کسی بھی دن اپنی سیٹ کنفرم کروا کر چلا جائے گا۔ سر ہلاتے ہوئے وہ اٹھا اور نیچے پہنچا تو ناشتا چل رہا تھا۔

’’لو جی آگئے آپ کے لاڈلے نواب۔ آپ بے چین ہو رہے تھے نا ان کے بنا۔‘‘ شیما نے حسب عادت طنز کے تیر چھوڑے۔ لیکن دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاشم نے ایک نظر بیٹے کے تنے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے ایک پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

’’زاہد کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ اچھا لڑکا تھا... پڑھا لکھا اور اپنا ایک خاص ویژن رکھنے والا۔‘‘

’’اسی لیے تو مارا گیا۔ ہمارے سسٹم میں ایسے روشن خیال اور تعلیم یافتہ لوگوں کو زندہ رہنے کی اجازت کہاں ہے۔ ہم عوام تو کالا انعام ہیں۔ بھیڑ، بکریاں، گائے بیل وغیرہ۔ اگر ایسے ہی رہیں تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن اگر جھکے ہوئے سر اٹھانے کی کوشش کریں، تو ایسے سر کاٹ دیے جاتے ہیں۔ اس کا بھی اٹھنے والا سر کاٹ کر پھینک دیا گیا۔‘‘

’’سب ہمارے سسٹم کو جانتے تو ہیں۔ للکارنے میں سوائے تکلیف کے کچھ نہیں مل سکتا۔ یا تو اتنی طاقت ہو کہ ٹکر لے سکیں۔ یا پھر سر کو جھکا کر رہیں۔ اسی میں عافیت ہے۔‘‘

’’ہر شخص مصلحت پسند نہیں ہو سکتا پاپا۔ بہت تکلیف ہوتی ہے جب ہمیں نہ جانے کہاں کہاں کمپرومائز کرنا پڑے۔ یہ بات آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔‘‘

’’اپنے پیچھے رونے والوں کی تکالیف کا احساس ہو، تو کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ پتا نہیں زاہد کی فیملی میں کون کون بے آسرا ہو کر لامتناہی تکلیفوں اور پریشانیوں کو زندگی بھر جھیلنے پر مجبور ہو گیا ہوگا۔‘‘ ولی نے سر ہلاتے ہوئے تائید کی پھر پوچھا۔

’’پاپا! میں سوچ رہا ہوں کہ اگلے ہفتے کسی دن نکل ہی جاؤں۔ کسی ویک اینڈ کی سیٹ کنفرم کروا دیجیے گا۔‘‘

عبداللہ ہاشم نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کے چہرے پر اطمینان کا ایک نامعلوم سا اظہار ہوا اور معدوم ہو گیا۔ وہ بڑے سیلف کنٹرولڈ انسان تھے۔

ناشتا کر کے وہ اٹھا اور چابی لے کر باہر نکل گیا۔

وہ بائیک پر بستی کے ڈھابے کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ اس کا ذہن اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے اڑ رہا تھا۔ وہ پانچ چھ دوست بستی کو بچانے کی مہم میں بہت پرجوش تھے۔ ان کے کچھ اور ساتھی بھی تھے، لیکن آگے آگے زاہد اور اس کے یہ سب ساتھی تھے۔ زاہد انہیں جو بھی مہم سونپتا، یہ دوڑ بھاگ کر کے اسے پورا کر ڈالتے۔ ان کے جذبے سے ولی بھی بہت متاثر ہوا تھا اور ایک غیر محسوس انداز میں وہ بھی دوستوں کے اس گروپ میں شامل ہو گیا تھا، کیونکہ اگر کسی وقت زاہد موجود نہیں بھی ہوتا، تو یہ سب ولی سے ہی مشورہ کرتے تھے۔ اب زاہد کے جانے کے بعد ان سب لڑکوں کو ایک ایسے لیڈر کی ضرورت تھی جو انہیں لیڈ کر سکے اور ولی اس ضرورت پر پورا اترتا تھا۔

اس نے نکلنے سے پہلے کاشف کو فون کیا تھا کہ ایک بہت ضروری بات ڈسکس کرنا ہے ان سب سے، تو اس نے کہا کہ آپ ڈھابے پر آجاؤ ہم سب فیملی روم میں ملیں گے آپ کو۔ بستی جانے والی سڑک تو پانی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور بہاؤ اتنا تیز ہے کہ اگر بائیک پر آئے تو وہ بہہ جائے گی۔ کچھ ہی دیر میں وہ ڈھابے پر تھا۔

’’بات دراصل یہ ہے دوستو! کہ ہمارے پاس صرف ہفتے تک کا وقت ہے۔ ہفتے والا دن آخری ہے۔ یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ آخری دن زاہد نے اپنی جان پر کھیل کر جن لوگوں کو للکارا تھا، اور سب کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ اب ہم بستی والے بند پر دھرنا دیں گے، اس وقت تک، جب تک کہ سیلاب کا ریلا وہاں سے گزر نہیں جاتا۔ ہم کسی کو بند توڑ کر اپنی بستیاں بہانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تو دوستو! اس نے ہمیں راستہ دکھایا تھا۔ اب وہ تو نہیں رہا لیکن وہ راستہ موجود ہے، جو اس نے دکھایا تھا۔ اب اس پر عمل کروانا آپ لوگوں کا کام ہے۔ اگر زندہ رہنا، اور گھروں کو آباد رکھنا ہے تو ہمت کرنا پڑے گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے ولی بھائی! ہمیں کرنا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو بتائیں۔‘‘ ایک نے پوچھا۔

’’بستی کے ایک ایک گھر میں جاؤ۔ ایک ایک فرد کو باہر نکالو۔ بڑے، بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد۔ سب گھروں سے نکلیں اور بند پر دھرنا دے کر بیٹھ جائیں۔ دن ہو یا رات کوئی اگر وہاں آکر بند میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرے، تو سب مل کر اسے، یا انہیں اٹھا کر دریا میں پھینک دو۔ سب کو بند پر پہرا دے کر اسے ٹوٹنے سے بچانا ہے۔

ورنہ ان کی زندگی اور گھر، سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ بولو! کرلو گے یہ کام؟"

"بالکل کریں گے ولی بھائی! آخر ہم سب کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ہم ایک ایک گھر میں جا کر لوگوں کو بتائیں گے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ سب کو نکالیں گے گھروں سے اور بند پر بٹھا دیں گے۔"

"لیکن بھائی! یہ بھی تو دیکھو بارش کتنی شدید ہو رہی ہے آج کل۔ سب لوگ مان جائیں گے کیا؟"

"بارش کے پانی میں بھیگنے سے کوئی نہیں مرتا۔ سیلاب میں بہہ کر لوگ مر جاتے ہیں۔ اس لیے بارش میں بھیگ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ سیلاب سے بچنے کی سوچو۔ اتنا کافی ہے۔" ولی نے انہیں سمجھایا۔

"ٹھیک ہے ولی بھائی! ہم کل ہی جاتے ہیں بستی والوں کو سمجھانے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔"

"کل کیوں؟ آج کیوں نہیں۔ آج کی بھی پوری رات باقی ہے۔ واپسی پر نکل جاؤ اپنی مہم پر۔ مسجدوں میں جا کر مائیک پر اعلان کرو۔ میگا فون اٹھا کر گلی گلی لوگوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کرو۔ اس سے بچنے کا طریقہ بتاؤ۔ اور لڑکوں میں بھی یہی کام بانٹ دو۔ اب زیادہ وقت نہیں ہے تم لوگوں کے پاس۔"

"او کے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں ہوں گے......؟"

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن یہ کہ ایک تو میں بستی والا نہیں ہوں۔ دوسرے مجھے ایک دو بہت ضروری کام نمٹانے ہیں۔ کل کے دن میں وہ کرلوں تو پھر شام کو ہم یہیں ملیں گے۔ اور دیکھیں گے کہ ہماری مہم کس حد تک کامیاب جا رہی ہے۔ اگر کچھ کمی ہے تو ہم ایک نیا لائحہ عمل بنائیں گے۔ لیکن کرنا یہی ہے۔ اور ابھی سے شروع کرنا ہے۔ ٹھیک۔ اجازت۔ کل ملتے ہیں ان شاء اللہ۔"

"ٹھیک ہے ولی بھائی! کل ملتے ہیں۔"

اگلے دن وہ اسی پولیس افیسر کے سامنے بیٹھا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ اس دن کیا کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس سارہ کے بارے کوئی اطلاع ہے۔ کیا اطلاع ہے۔ میں پوچھنے آیا ہوں۔"

"کوئی خاص نہیں۔ وہی پرانی بات معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سارا اپنے گھر کا راستہ چھوڑ کر کسی نئے راستے پر کیوں گئی تھی؟ جہاں پانی کا وہ مہیب گڑھا اس کے لیے موت کا کنواں ثابت ہوا۔ کیا کسی نے اسے وہاں جانے کا کہا تھا؟ اس بارے میں اس نے آپ کو کچھ بتایا تھا؟"

وہ ایک نوجوان افسر تھا۔ روایتی پولیس والوں سے تھوڑا مختلف۔ لیکن ولی کو صاف محسوس ہوا کہ اس نے بات گھمانے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ اسے معلوم تھا، وہ ولی کو بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ ولی غور سے اسے میز کی سطح پر بال پین گھماتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"اب مجھے اصل بات بتایئے پلیز! میں جانتا ہوں آپ کے پاس کہنے کو کچھ اور ہے۔ کہیے! میں منتظر ہوں۔"

افسر نے نظر اٹھا کر ولی کی آنکھوں میں دیکھا جہاں اسے ایک بے نام اداسی اور غصے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

"میں نے اُس وقت تمہیں کہہ تو دیا۔ لیکن بعد میں جب سوچا تو یہی مناسب لگا کہ میں تمہارے دکھ میں اضافہ نہ کروں۔ کیونکہ اب کچھ بھی کر لیا جائے، ہم سارہ کو واپس نہیں لا سکتے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ لیکن میں اپنے دل کا کیا کروں۔ اُسے تو کسی پل چین نہیں آتا۔ جانتے ہیں وہ میرے ساتھ مل کر اپنا گھر بنانے کے لیے پیسے جمع کر رہی تھی۔ ہمارے مستقبل کی ایک خوب صورت امید تھی۔ اب بتایئے میں کیا کروں گا ان سب امیدوں کا، جو اس کی ذات سے وابستہ تھیں۔ کم از کم اس کی پُر اسرار موت سے ہی پردہ ہٹ جائے تو مجھے کچھ تو قرار آئے۔"

میری دلی تمنا ہے کہ تمہارے دل کو صبر و سکون آ جائے لیکن میں ڈرتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی نئی الجھن میں پھنس جاؤ۔ مجھے احساس ہے کہ تمہارا مقابلہ بڑی طاقتوں سے پڑ گیا ہے۔ اور وہ کسی کو اسپیس دینے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے حوالے سے ظلم و ستم کا کوئی نیا باب لکھ دیا جائے۔ ولی! ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں انسانی جان لینا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بس جیسے کوئی چیونٹی کو مسل دیتا ہے۔ شاید سارہ بھی ایسی ہی کسی طاقت کو للکار بیٹھی تھی۔"

اس کی بات سن کر ولی نے چونک کر سر اٹھایا اور پوری آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا۔ "یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ وہ تو ایک حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ سب جانتے ہیں۔ پھر یہ نئی بات کیا ہے؟"

"ولی! کیا تم نے سارہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی ہے؟"

"جی ہاں۔ دیکھی ہے۔ جس میں اس کی موت کا سبب دم گھٹنا بتایا گیا ہے۔ پھیپھڑوں میں پانی بھر جانے کے

سبب وہ سانس لینے کے قابل نہیں رہی تھی اور اسی سبب اس کی موت واقع ہوگئی۔''

''بالکل ٹھیک۔ یہی لکھا ہے اس رپورٹ میں۔ میری فیونسی ایک ڈاکٹر ہے۔ سرکاری اسپتال میں جاب کرتی ہے۔ اتفاق سے وہ بھی اس ٹیم میں شامل تھی جس نے سارہ کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اس کا کہنا کچھ اور ہے۔'' افسر نے ولی کو دیکھتے ہوئے کہا تو ولی کے چہرے پر بے چینی کے واضح تاثرات تھے۔

''کیا...... کیا کہتی ہیں وہ کیا بتایا انہوں نے؟'' ولی نے بدحواس ہوکر پوچھا تو اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔ افسر نے ہاتھ اٹھا کر اسے تحمل کا اشارہ دیا اور پانی کا گلاس اس کی طرف سرکایا۔ لیکن ولی نے ہاتھ نہیں بڑھایا، وہ منتظر نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''اس نے بتایا کہ سارہ کے جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ اس کے دونوں بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور شاید اس کا ریپ......'' اس نے اتنا ہی کہا تھا تو ولی چلاّ پڑا۔

''نہیں...... نہیں...... ایسا نہ کہیں...... ایسا نہ کہیں پلیز! میرا دل پھٹ جائے گا۔ کہہ دیں کہ یہ محض مذاق ہے۔ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ نہیں نہیں ہوسکتا یہ۔ سارہ نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ اس کا تو کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ وہ تو صرف اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ پھر یہ ظلم کس نے کیا۔ کس نے کیا؟'' وہ چلاّ کر رو پڑا۔ روتا رہا۔ افسر بھاری دل کے ساتھ اسے روتا دیکھتا رہا۔ اسے لگا کہ ولی کی کیتھارسس کے لیے یہ ضروری ہے۔ کچھ دیر میں جب ولی کے جذبات کا تلاطم تھوڑا تھمنے لگا تو افسر نے اسے مخاطب کیا۔

''کیا تمہیں کوئی اندازہ ہے، کہ اس کے ساتھ یہ سب کرنے والے کون لوگ ہوسکتے ہیں۔ اس نے تم سے کوئی ایسی بات شیئر کی ہو جس سے اس الجھی ہوئی ڈور کا کوئی سرا ہاتھ لگ سکے۔''

ولی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھے اور دو تین لمبی لمبی سانسیں لے کر اپنے جذبات کو کسی حد تک کنٹرول کیا۔

''سارہ ایک ریسرچر تھی۔ وہ وزارت زراعت کے آبی امور سے متعلق معاملات پر اتھارٹی تھی۔ دریاؤں، گلیشیئرز اور بارشوں کی کیلکولیشن اور ان کی مینجمنٹ اس کی ریسرچ کے موضوعات تھے۔ ہمارے ہاں جو غیر معمولی بارشیں اور سیلاب آرہے ہیں، اس نے بہت پہلے ان کی نشاندہی کی تھی اور ان کے نقصانات سے بچنے کے اقدامات بھی بتائے تھے۔ اپنی رپورٹ تیار کر کے اس نے ارجنٹ لکھ کر اپنی وزارت کو بھیجی تھی۔ لیکن وہ رپورٹ وہاں تک پہنچی نہیں۔ درمیان سے ہی غائب کردی گئی۔ اب جبکہ خطرہ سر پر آ گیا تو اس نے دوبارہ وہ رپورٹ تیار کی اور اس پر ایس او ایس کے پیغام کے ساتھ خود ہینڈ اوور کرنے سیکریٹریٹ گئی تھی۔ اس کی رپورٹ خود میں نے اپنے ہاتھوں سے انولپ میں ڈالی اور اس پر مارکر سے ایس او ایس لکھا تھا۔ سیکریٹری نے اسے گیارہ بجے ملنے کا ٹائم دیا تھا۔ وہ دس بجے چلی گئی تھی۔ بس۔ پھر واپس نہیں آئی۔''

''آپ نے اس سے رابطہ نہیں کیا کہ وہ کہاں ہے۔ اور گھر کیوں نہیں آئی اب تک۔''

''اس کا فون گیارہ بجے بند ہوگیا تھا۔ انکل نے بارہ بجے اسے فون کیا۔ کیونکہ بارش بہت زیادہ ہورہی تھی اور وہ اس کے لیے پریشان تھے لیکن اس کا فون بند تھا۔ پھر اس کے بعد انکل نے وقفے وقفے سے بے شمار کالز کیں۔ لیکن وہ اٹینڈ نہیں ہوئیں۔ وہ کوشش کرتے رہے لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔ پھر پریشان ہوکر انہوں نے مجھے فون کیا۔ میں اور انکل ساری رات اسے تلاش کرتے رہے۔ اسے نہ ملنا تھا، نہ ملی۔ پھر آپ جانتے ہی ہیں۔''

''اس کے آفس سے پتا کیا۔ وہ وہاں پہنچی تھی یا نہیں۔''

''نہیں وہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ آفس پہنچی ہی نہیں۔''

''تمہاری روانگی کب ہے؟''

''بس اگلے ہفتے کسی بھی دن۔ سیٹ کنفرم ہوجائے تو معلوم ہوگا۔ لیکن اب مجھے جو کچھ پتا چلا ہے، اس کے بعد میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہورہا ہے۔ اگر میں چلا گیا تو یہ کیسے پتا چلے گا کہ سارہ کے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا ہے؟''

''میں ہوں نا۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میں آخر تک جاؤں گا اور معلوم کر کے رہوں گا کہ اس سب کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔ میں پروگریس بتاتا رہوں گا۔ لیکن ایک مشورہ ہے کہ جتنی جلد ہوسکے۔ تم چلے جاؤ۔''

''مجھے آپ بھی دوسروں کی طرح یہ مشورہ کیوں دے رہے ہیں۔ جلد سے جلد جانے کا۔''

''کسی اور نے بھی کہا ہے؟''

ولی نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ''ولی! میں ایک پولیس والا ہوں۔ عام لوگوں سے زیادہ حساس ہوں۔ چیزوں اور حالات کو دیکھنے کی ایک اضافی حس ہمیں تفویض کی جاتی ہے۔ یہ ہماری ٹریننگ کا حصہ ہے۔ مجھے بھی تمہارے اطراف سے کچھ ایسی

وائبز آ رہی ہیں۔ جو زیادہ بہتر نہیں ہیں۔ اس لیے فی الحال اس ماحول سے نکل جانا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

ولی تھکے تھکے قدم رکھتا ہوا اس کے آفس سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

آج وہ بائیک پر نکلا تھا۔ بارش نے اس کی واٹر پروف جیکٹ کے باوجود اسے بھگو دیا تھا۔ پھر ٹھنڈی ہوا لگنے سے اور کچھ اس کے جذباتی انتشار کے سبب وہ کچھ ٹھنڈ محسوس کر رہا تھا۔ اسے کچھ دیر سکون سے بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالنے کی بڑی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سڑک کنارے ایک چھوٹے سے کیفے میں داخل ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ ویٹر اس کے سامنے چائے رکھ گیا۔ گرم چائے سے اٹھتی ہوئی بھاپ کے مرغولوں کو وہ بے دھیانی میں گھورتا رہا... کبھی اسے اس میں سارہ نظر آتی تو کبھی زاہد جھانکنے لگتا۔ وہ اپنے بے پناہ دکھ کے بوجھ سے بے حال ہو رہا تھا۔

اسے بالکل اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سارہ کے ساتھ یہ ظلم کس نے اور کیوں کیا؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ ایک خوش نظر، خوش ادا لڑکی تھی۔ زندگی سے بھرپور اور حساس دل رکھنے والی۔ کبھی کسی کو تکلیف پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تو پھر...... وہ سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے دیکھا تو مجبور کا نام اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر کال ریسیو کی۔

"ولی! تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ سارہ کے بارے میں کچھ معلوم کرنا تھا۔ وہاں سے جو عذاب لے کر آ رہا ہوں، آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ سارہ کے ساتھ حادثہ نہیں ہوا تھا۔ وہ قتل ہوئی ہے۔ قتل۔"

"ولی! سارہ کے ساتھ جو بھی ہوا، وہ بہت برا تھا لیکن اب وہ اس دنیا میں جا چکی ہے، جہاں سے کبھی واپس نہیں آ سکتی۔ اس کو فی الحال چھوڑو اور جو زندہ ہیں ان کی فکر کرو۔ گھر جا کر اپنے باپ کی خبر لو۔ وہ تمہیں بلاؤں سے بچانے کی سزا بھگت رہا ہے، اسے دیکھو جا کر۔"

"کیوں؟ کیا ہوا بابا کو؟" وہ پوچھتا ہی رہ گیا۔ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اس کے پہلے سے بوجھل اعصاب پر اور بوجھ بڑھ گیا۔ اس نے دوڑ لگائی اور تیز رفتاری سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ولی کے گھر کے سامنے ایک پلے گراؤنڈ تھا۔ جس میں کچھ جھولے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ جب جھولے کو چلایا جاتا تو گھوڑے اور پالکیاں اس میں گھومتے تھے۔ یہ ایک برقی جھولا تھا جسے آپریٹر کنٹرول کرتا تھا۔ ولی گراؤنڈ کے نزدیک پہنچا تو فضا نیم تاریک تھی۔ جھولا ہلکی رفتار سے چل رہا تھا اور اس میں جلنے والی برقی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ جھولے کے چاروں طرف بہت سے لوگ دائرے کی شکل میں کھڑے اس جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک عجب پُراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ولی جیسے ہی وہاں پہنچا، ایک بھنبھناہٹ سی گونجی۔ ولی آ گیا۔ ولی آ گیا۔ ولی آگے بڑھا تو خودبخود بھیڑ چھٹتی گئی اور اس کا آگے بڑھنے کا راستہ صاف ہو گیا۔ ولی نے تیزی سے بڑھتے ہوئے جھولے پر نظر ڈالی تو اس کا دل اندر سے کانپ سا گیا۔

جھولا چل رہا تھا اور اس میں لگے ہوئے گھوڑے اور پالکیاں گول گول گھوم رہے تھے۔ اور ان میں سے ایک پالکی میں اس کا باپ عبداللہ ہاشم، سیکریٹریٹ میں ایک آنریبل جاب کرنے والا سینئر سرکاری افسر بیٹھا تھا۔ ولی کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس کی قابلِ عبرت حالت کو برداشت نہیں کر پایا۔ زور سے بابا، بابا چلاتا ہوا اس جھولے کی طرف دوڑا۔

عبداللہ ہاشم کے منہ اور ننگے بدن پر کالک ملی گئی تھی۔ گلے میں جوتوں کے ہار لٹکے ہوئے تھے۔ پیٹھ پر ایک کارڈ چپکا ہوا تھا۔ جس پر موٹے حروف میں "غدار" لکھا گیا تھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں خاموش سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا اور پالکی گول گول گھوم رہی تھی۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگ افسردہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب ان کے محلے دار تھے اور اس صورتِ حال کو دکھی دل کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔

ولی پاگلوں کی طرح جھولے کی طرف دوڑا۔ اس کے برقی تار جنونی انداز میں کھینچ کر پھینکے تو جھولا رک گیا۔ اس نے باپ کو تھام کر جھولے سے نیچے اتارا۔ گلے سے جوتوں کا ہار اور غداری کا سرٹیفکیٹ اتار کر پھینکا۔ اپنی آستینوں سے ان کے چہرے کی کالک صاف کی تو ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ گلے لگانے پر اندازہ ہوا کہ ان کی صرف آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، بلکہ ان کا پورا وجود شدتِ گریہ سے لرز اور کانپ رہا تھا۔ اسی وقت ان کا پڑوسی ثاقب اپنی گاڑی دوڑاتا ہوا گراؤنڈ میں آیا۔ اور ان دونوں کو گاڑی میں بٹھا کر تیزی سے گھر کی طرف چلا گیا۔

گھر میں داخل ہوئے تو ثمینہ نے ہاشم کو دیکھ کر ایک چیخ ماری۔ اور حواس باختہ ہو کر اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"یہ...... یہ کیا ہوا ہاشم؟ کس نے کیا یہ سب؟ تم نے ایسا کیا کر دیا ہے، جس کی تم کو یہ سزا دی گئی ہے۔ کچھ بولو۔

کچھ بتاؤ تو سہی......''

''بابا! اوپر چلیں۔'' ولی، شیما کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر ہاشم کو اندر لے جانے لگا تو وہ بھڑک گئیں۔

''ہاشم نے تو شاید کچھ نہ کیا ہو۔ شاید یہ تمہارے ہی کسی کرتوت کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خدا ایسی اولاد کسی کو نہ دے جو منہ پر کالک ملوا دے۔ لعنت ہو تم پر ولی! بیٹے نہیں... سزا ہو اپنے باپ کے لیے۔ دفع بھی ہو یہاں سے۔ تاکہ ہاشم سکون سے جی سکیں، اور ہم عزت اور سکون سے زندگی گزار سکیں۔ تم نے ہم سب کی زندگی کو عذاب بنا کر رکھ دیا ہے۔'' وہ چیخ چیخ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہیں لیکن دونوں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ ولی ہاشم کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ انہیں باتھ روم میں بھیجا کہ وہ اچھے سے نہالیں تاکہ ان پر لگائی گئی کالک صاف ہو جائے۔ وہ ان کے لیے کپڑے نکال رہا تھا کہ مجبور کا پھر فون آیا۔

''ولی! عبداللہ ہاشم کو جان سے بھی مارا جا سکتا تھا۔ اس طرح کہ وہ غائب کر دیے جاتے۔ پھر کسی ویرانے سے ان کی لاش ملتی۔ لیکن یہ صرف وارننگ ہے۔ تمہارے لیے۔ ہاشم کو یہ سزا اس لیے دی گئی کہ وہ تمہیں حسبِ وعدہ روک نہیں پایا۔ تمہاری ناپسندیدہ سرگرمیوں سے۔ اب تمہارے پاس وقت بہت کم ہے ولی! نکل جاؤ اپنی جان بچا کر۔''

''ناپسندیدہ سرگرمیاں؟ میں ایسا کیا کر رہا ہوں؟''

''ولی! تم سمجھ نہیں رہے ہو یا سمجھنا نہیں چاہتے۔ زاہد نے کیا کیا تھا؟ سارہ نے کیا کیا تھا؟ اور اب تمہارے بابا نے کیا کیا ہے؟ یہ سب کسی کے مفادات کے راستے میں آ رہے تھے۔ اور اب تم بھی وہی راستہ اختیار کر رہے ہو۔ ہٹ جاؤ ان کے راستے سے۔ تمہاری پرسوں صبح پانچ بجے کی فلائٹ کنفرم ہے۔ تم یہ وقت خاموشی سے گھر میں بیٹھ کر گزارو اور چلے جاؤ۔''

فون بند ہو گیا اور اس کے لیے سوچ کے نئے در کھول گیا۔ وہ سوچتا رہا اور اس کی پیشانی پر بل اور آنکھوں میں غصہ بڑھتا چلا گیا۔

بہت دیر بعد نیند آئی تو گیارہ بجے آنکھ کھلی۔ وہ کسلمندی سے اٹھا۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے فون پر کوئی نمبر ملایا۔

''ہاں کاشف! کیا بنا تم لوگوں کے کام کا۔ بستی والوں کو تیار کر لیا تم نے؟''

''ولی بھائی! کوشش تو ہم لوگوں نے بہت کی۔ لیکن نہ جانے کیوں لوگ اس بات کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں رہے ہیں۔ اتنی شدید بارش اور طوفان میں بند پر کھلی جگہ میں جم کر بیٹھنا انہیں بہت مشکل لگ رہا ہے۔''

''اچھا۔ اور مرنا آسان لگ رہا ہے۔ انہیں تم نے بتایا نہیں کہ اگر بند کو توڑا گیا تو تم سب کیڑے مکوڑوں کی طرح بہہ جاؤ گے۔ جان پیاری ہے تو یہ جوکھم تو اٹھانا پڑے گا۔''

''سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ کچھ تو سمجھ گئے اور اس بات پر راضی بھی ہو گئے۔ لیکن زیادہ تر ابھی بھی گومگو میں ہیں۔''

''ارے یار! ایسے ہی لوگوں کو تو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ وقت نہیں ہے کاشف۔ ابھی نہیں، تو کبھی نہیں۔ تم اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلو۔ اور گھروں کے دروازے بجا کر لوگوں کو سمجھاؤ کہ اگر مزید بارش ہو گئی تو وہ انتظار کیے بغیر بند کو توڑ دیں گے۔ اور تمہاری کہانی ختم ہو جائے گی۔ مجھے تھوڑی دیر لگے گی۔ میں بھی آتا ہوں۔ میں بھی تمہارے ساتھ کوشش کروں گا۔''

اس نے فون بند کیا اور باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ اسے مکرم انکل کے پاس جانا تھا۔ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ سارہ اتفاقی حادثے کا شکار نہیں ہوئی ہے بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ لیکن جب اس نے بائیک ان کے گھر کے باہر روکی تو اسے خیال آیا، کہ وہ ایک اکیلے، بوڑھے اور غمزدہ آدمی کو یہ بتا کر تو انہیں اور بھی تکلیف میں مبتلا کر دے گا۔ وہ اسے حادثہ ہی سمجھیں تو ٹھیک رہے گا۔ لیکن اب آ چکا تھا اور انکل نے شاید اسے کھڑکی سے دیکھ بھی لیا تھا۔ تو جانا تو تھا اندر۔

''آؤ میاں! کیسے ہو؟ آؤ یہاں بیٹھو۔ لنچ کرو میرے ساتھ۔'' انہوں نے ایک پلیٹ اس کی طرف بڑھائی تو اس نے دیکھا کہ وہ سبزیوں کی سلاد کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے۔ اسے ان کی حالت کا اندازہ تھا۔ اگر منع کرتا، تو شاید وہ یہ سمجھتے کہ اس کے کھانے کی چیز نہیں ہے۔ اس لیے اس نے خاموشی سے سلاد پلیٹ میں نکالی، تو انہوں نے آدھی روٹی توڑ کر اس کی طرف بڑھائی۔

''بسم اللہ کرو۔ اور یہ بتاؤ کہ تمہاری روانگی کب تک ہے؟''

''آپ بھی وہی سوال پوچھ رہے ہیں۔ جو آج کل ہر شخص مجھ سے پوچھ رہا ہے۔''

''ہاں۔ پتا نہیں کیوں اندر سے کچھ ایسی آواز آ رہی ہے کہ تمہیں یہاں سے کہیں دور چلے جانا چاہیے۔ یہاں مجھے تمہارے لیے حالات کچھ بہتر محسوس نہیں ہو رہے ہیں۔ جب جانا ہی ہے، تو جلد چلے جاؤ۔ دیر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟''

''یہ اندازہ آپ کو کیوں اور کیسے ہو رہا ہے؟''

''یہ کوئی مستند بات تو نہیں ہے۔ بس میری چھٹی حس

کہہ رہی ہے کہ تمہیں یہاں سے کہیں دور چلے جانا چاہیے۔“
”پرسوں رات میری فلائٹ ہے۔“
انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کھانا ختم ہوا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کرم صاحب بھی اٹھے۔ اس نے اشارے سے ان سے بیٹھے رہنے کو کہا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔
”نہیں میاں! پرسوں تم چلے جاؤ گے۔ پھر شاید ہماری ملاقات بھی نہ ہو سکے اس لیے گلے ملنا تو بنتا ہے۔“
انہوں نے اسے گلے لگایا تو نہ جانے کیوں ان کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی جیسے وہ اسے اپنی بانہوں میں چھپا لینا چاہتے ہوں۔ اس کی جدائی سارہ کے جانے جیسا دکھ دے رہی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اسے گلے لگائے رہے۔ پھر الگ ہوئے تو ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ انکل! میں جانتا ہوں کہ سارہ کا اس طرح چلے جانا آپ کو بہت بڑا غم دے گیا ہے۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں سے جانے کے بعد بھی میں آپ کو اکیلا نہیں رہنے دوں گا روزانہ آپ سے ویڈیو کال پر باتیں کروں گا۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔ ہم پھر ملیں گے۔“
”ابھی یہاں سے کہاں جا رہے ہو۔ گھر جاؤ گے نا؟“
”نہیں انکل! یہاں سے میں خدا کی بستی کی طرف جاؤں گا۔ وہاں زاہد کے دوستوں کو ایک کام کہہ کر آیا تھا۔ اس کی رپورٹ لینی ہے۔ پھر گھر جاؤں گا۔“
”اتنی بارش میں وہاں کیوں جا رہے ہو؟ فون پر بات کر لو۔ پوچھ لو جو پوچھنا ہے۔“
”نہیں انکل! جائے بغیر کام نہیں چلے گا۔ مجھے ان کے ساتھ مل کر کام کرنا ہو گا شاید۔ ان کا ڈھیلا ڈھالا انداز مجھے مطمئن نہیں کر پا رہا ہے۔ میں زاہد سے کیا وعدہ پورا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس بستی کو ہر صورت بچانا چاہتا تھا۔ میں اس کے دوستوں کے ساتھ مل کر بستی والوں کو بند پر دھرنا دینے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس میں شگاف ڈالنے والوں کو روکا جا سکے۔ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو ان کی بستی نیست و نابود ہو جائے گی۔“
”اچھا میاں! جیسے تمہاری مرضی۔ اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“
وہ وہاں سے نکلا تو کرم صاحب اسے دور تک جاتا دیکھتے رہے پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

گھن گرج کے ساتھ زوردار بارش ہو رہی تھی۔ کچھ دیر زوردار برسات کے بعد وہ کچھ ہلکی ہوتی پھر گھرے بادلوں کی دبیز تہوں میں بجلی کی تلواریں کوندتیں، بادلوں میں گرج دار دھماکے ہوتے اور بارش ٹوٹ کر برس پڑتی۔
گھرے بادلوں کی دبیز تہ نے دن میں بھی اندھیرے کا سماں کر رکھا تھا۔ ایسے میں وہ بائیک کے بند نہ ہونے کی دعائیں مانگتا ہوا خدا کی بستی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آخر کار ڈھابے پر پہنچ کر رک گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ زاہد کے سب دوست اس وقت وہیں ہوں گے۔
پورے علاقے کی لائٹ گئی ہوئی تھی اس لیے ہر طرف اندھیرا تھا۔ صرف پچھلی جانب فیملی ہال سے کمزور سی روشنی آ رہی تھی۔ وہ اسی طرف بڑھ گیا۔ اندر داخل ہوا تو بڑی خاموشی تھی۔ اس نے دو لالٹینوں کی کمزور سی روشنی میں ان سب کو خاموش کھڑے ہوئے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ اتنی خاموشی کیوں ہے؟ تم سب ٹھیک ہو نا۔ کاشف! کیا ہوا ہے؟ تم لوگوں نے اپنا کام کیا؟“
اس کے سوال کے جواب میں کاشف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”تو...... تو ساری بستی والے تو ابھی بستی میں ہی ہیں۔ انہیں تو وہاں بند پر جمع ہونا چاہیے تھا۔ وہ گئے کیوں نہیں ابھی تک؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔
”ولی بھائی! لوگ پتا نہیں کیوں ہماری بات مان نہیں رہے ہیں۔ کل کچھ لوگ آئے تھے بستی میں۔ انہوں نے سب سے کہا کہ وہ حکومتی پارٹی کے لوگ ہیں۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہے کہ بستی والے بند ٹوٹنے سے ڈر رہے ہیں۔ انہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اسمبلی میں بل پیش کیا تھا، جو پاس ہو چکا ہے۔ اس لیے اب اس بند میں شگاف نہیں ڈالا جائے گا۔ وہ سب بے فکر ہو جائیں۔“
”یہ سب دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مارے جاؤ گے سب۔ کیونکہ اوپر فیصلہ ہو چکا ہے کہ ڈیم بھر جائے اور اس کا سیلابی پانی آس پاس کی زرعی زمینوں کو روندتا ہوا نکلے۔ تو اس سے پہلے ہی بند کو توڑ دیا جائے۔ تاکہ بستیاں تاراج ہو جائیں اور ان کے کھیت اور باغ تباہ ہونے سے بچ جائیں۔ جانتے ہو نا۔ یہ میلوں تک پھیلی زرعی زمینیں کس کی ہیں۔ سردار شمشیر خان کی۔ جو مرکزی وزیر ہے۔ وہ گھاٹے کا سودا کبھی نہیں ہونے دے گا۔ چاہے تمہارے جیسے ہزاروں لوگ موت کے منہ میں بہہ کر چلے جائیں۔ تم سب کی ذمے داری اب اور بڑھ گئی ہے۔ لوگوں کو اس دھوکے میں پڑنے سے روکو۔ اور انہیں بند پر

لے کر جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو، پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' اس نے اپنے سمجھانے پر بھی ان کا سرد ردِعمل دیکھا تو وہ کچھ پریشان ہوا۔ وہ سب خاموش کھڑے چپ چاپ اسے بے حسی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر ان کو مخاطب کیا۔

''آج بستی میں جاؤ اور پہلے لوگوں کو جمع کرو۔ ہر لڑکا پچیس تیس لوگوں کو جمع کر کے بھی صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھائے گا تو پیغام سب تک پہنچ جائے گا۔ تم لوگ ان کو بند پر پہنچانے کے انتظامات کرنے کی جتنی کوشش ہو سکتی ہے، ضرور کرلو۔ یاد رکھو۔ تمہارے پاس صرف آج کی رات اور کل کے دن تک کی مہلت ہے۔ کرلو جو کچھ کر سکتے ہو۔ میں کل پھر آؤں گا۔ مجھے اچھی خبر ملنا چاہیے کہ ساری بستی بند پر دھرنا دے کر بیٹھ گئی ہے۔'' اس کے بعد وہ مڑا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس کے اندر کچھ تلخی اور مایوسی سرا ٹھا رہی تھی۔

موٹر بائیک نے پھر اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بے دلی سے اسے گھسیٹتا ہوا واپسی کے لیے جا رہا تھا۔ کچھ دور ہی چلا تھا کہ درختوں کے پیچھے سے ایک لڑکا نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ولی نے اسے پہچان لیا۔ وہ زاہد کے ساتھ اس کے آگے پیچھے رہتا تھا۔

''ولی بھائی! میں مستقیم۔ آپ نے زاہد بھائی کے ساتھ دیکھا ہوگا۔ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہ جو آپ تین دن سے ان سارے لڑکوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہ بستی کے لوگوں کو بتائیں کہ انہیں بند پر جمع ہونا چاہیے۔ تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے کسی بستی والے کو وہ نہیں کہا، جو زاہد بھائی کہتے رہے۔ یا جو اب آپ کہہ رہے ہو۔ آپ کو ان پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔'' ولی نے غور سے اس سولہ سترہ سالہ لڑکے کو دیکھا۔

''اچھا۔ لیکن یہ تو ان کی بھلائی کے لیے بھی ہے۔ وہ بھی تو اسی بستی میں رہتے ہیں۔ اگر بستی سیلاب میں بہی تو وہ کیا بچ جائیں گے؟''

''پتا نہیں ولی بھائی! لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے پوری بستی میں یہ بات کسی کو بھی نہیں کہی۔''

''حیرت ہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ میں پچھلے تین دنوں سے انہیں یہ کام کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ خیر، میں تو اپنے مرتے ہوئے دوست کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی مجھے واپس جا کر کچھ ضروری کام نمٹانا ہے۔ کیونکہ پرسوں میری فلائٹ ہے مجھے جانا ہے۔ اس لیے کل پھر آؤں گا۔ آخری کوشش کرنے۔ تم جاؤ اپنا خیال کرو۔ بلکہ ایسا کرو کہ گھر والوں کو لے کر کسی رشتے دار کے گھر چلے جاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے، تو واپس آجانا۔'' وہ سوچوں میں ڈوبا کھڑا رہا۔ پھر روانہ ہو گیا۔

اس کی تمام رات بہت بے چینی میں گئی۔ اس وقت بھی وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا تھا۔

ذہن میں بہت اُلجھنیں تھیں اور ان میں وہ اُلجھا ہوا تھا۔ صبح ہو رہی تھی۔ فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی تو اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس دن وضو کر کے وہ نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نہ جانے کیا ہوا کہ اس کے سینے میں جمع ہونے والا غبار پھٹ پڑا۔ وہ دعا کیا مانگتا۔ اس کی ہچکیاں، سسکیاں اور اس کا پورا وجود دعا بن کر رہ گیا۔ وہ نہ جانے کب تک اسی طرح ہاتھ اٹھائے سسکتا رہا۔ پھر اس کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ عبداللہ ہاشم نے جھانک کر اندر دیکھا اور کچھ حیران ہو کر دبے قدموں اندر آکر اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ اداس آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر..... اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئے۔ وہ ان کی طرف مڑا تو چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر آنسو صاف کیے۔

''بابا! آپ اتنی جلدی اٹھ گئے۔ طبیعت ٹھیک ہے؟''

''پتا نہیں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں سب سے چھپ کر کہیں ایسی جگہ چلا جاؤں، جہاں کوئی مجھے جانتا نہ ہو۔''

''میں جانتا ہوں بابا! کل جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا۔ وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ صرف آپ کے لیے نہیں۔ میرے لیے بھی۔ مجھے بتائیے تو سہی، کس نے کیا ہے یہ سب؟ میں ان کا گریبان پکڑ کر پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''کوئی فائدہ نہیں بیٹا! وہ عفریت ہیں۔ وہ جس کو چاہیں ذلیل و رسوا کر سکتے ہیں۔ جس کو چاہیں جان سے مار دیں۔ کوئی ان کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ میں تم کو ان سے بچانا چاہتا ہوں۔ تم کچھ نہ کرو۔ بس خاموشی سے باہر چلے جاؤ۔''

''وہ تو میں جا رہا ہوں بابا! پانچ بجے صبح میری فلائٹ ہے۔ تین بجے رات کو ہی نکل جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ بھی اٹھ کر لان میں آ گیا۔

بھاری دل اور ذہن کے ساتھ وہ بڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ اسے اپنے اردگرد ایک غیر مرئی جال سا پھیلا ہوا محسوس تو ہو رہا تھا لیکن نظر کچھ نہیں آرہا تھا۔ اسے سارہ بہت یاد آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کا تو حساب لینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس کا مجرم سا محسوس کررہا تھا۔ لڑکپن سے لے کر ابھی چند دن پہلے تک کی بے شمار یادیں، جن میں سارہ اس کے ساتھ تھی، ایک ایک کر کے اس کے ذہن سے گزر رہی تھیں۔ وہ اتنی قریب محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے چلے جانے کا یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ بینچ پر بیٹھا تھا اور اب بھی اس کا دل گداز ہو رہا تھا۔ پھر اسے زاہد یاد آیا۔ اس کی آخری وقت کی گفتگو، جس میں اس نے ولی سے وعدہ لیا تھا۔ پھر ولی کو یاد آگیا کہ اس نے زاہد کے دوستوں کو جو ٹاسک دیا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے پورا کیا بھی یا نہیں۔ ان سے پوچھنا چاہیے۔ وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔

کمرے میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور اسکرین پر مجبور کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے فون اٹھایا۔

”جی میم!“

”ولی! تمہاری روانگی کس وقت ہے؟“

”میم! صبح پانچ بجے کی فلائٹ ہے۔ خیریت۔ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ کوئی خاص بات ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ ولی! اب گھر سے کسی بھی وجہ سے باہر مت نکلنا بس صرف ائرپورٹ جانے کے لیے ہی نکلنا ہے تمہیں۔ ٹھیک ہے۔ اور ہاں۔ گاڑی میں تمہیں بھیجوں گی۔ گارڈز کے ساتھ۔ بلٹ پروف گاڑی ہے۔ اس میں جانا ہے تمہیں۔“

”اوہ! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ وی آئی پی پروٹوکول مجھے کیوں دیا جارہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ عبداللہ ہاشم کے بیٹے ہو۔ میں ان کی ممنونِ احسان ہوں۔ اس لیے اور تو کچھ کر نہیں سکتی۔ اتنا تو کر لینے دو۔ اوکے۔“

”اوکے میم!“ اس نے کچھ الجھے ہوئے انداز میں فون کو دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر کاشف کا نمبر ملانے لگا۔ کئی مرتبہ کال کرنے کے باوجود اس نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ کچھ فکرمند سا ہوا۔ فون رکھ کر اس نے اپنا بیگ نکالا، جو اسے لے کر جانا تھا۔ پیکنگ وہ کر چکا تھا۔

ضروری ڈاکومنٹ بھی اس نے ایک لفافے میں ڈال کر اسی میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ نکال کر ایک مرتبہ اور چیک کیے۔ کپڑے جوتے نکال کر الگ رکھے۔ ایسی ہی بیکار کی مصروفیات میں وہ ٹائم پاس کر رہا تھا۔ شام ہونے لگی تو اس نے پھر کاشف کو فون کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حسبِ معمول اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ کسی اور لڑکے کا نمبر اس کے پاس تھا نہیں۔ آج صبح سے بارش بھی نہیں ہوئی تھی اس لیے اسے بہتر لگا کہ وہ شام کو ایک چکر لگا کر دیکھ لے کہ کیا صورتِ حال ہے۔ شاید بستی والے بند پر پہنچ ہی گئے ہوں۔

اپنی تیاریاں مکمل کر کے وہ خدا کی بستی والے ڈھابے کا ایک چکر لگانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ تاکہ اسے صحیح صورتِ حال کا اندازہ ہوسکے۔

بادل پھر سے گھر آئے تھے اور تیزی سے جمع ہو کر فضا کو بارش کی تمہید دے رہے تھے۔ اس نے اسپیڈ بڑھاتے ہوئے سامنے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس قدر گہرے سیاہ بادلوں کو تیزی سے اوپر آتے دیکھ کر اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ بس ایک سیلاب زمین پر ہوگا تو دوسرا آسمان سے اترے گا۔ ایک لمحے کو اس نے واپس گھر جانے کا سوچا۔ پھر سوچا کہ اب ڈھابا دور ہی کتنا ہے۔ ہو ہی آتا ہوں تو سر جھٹک کر دوبارہ اسپیڈ بڑھا دی۔ بس وہ نزدیک ہی تھا کہ بارش نے آن لیا۔ ایسی طوفانی بارش اور بادلوں کی چنگھاڑ تھی کہ الامان۔

لگ رہا تھا کہ بجلی کے کوندوں کی شکل میں آسمان سے بلائیں اتر رہی ہیں۔ وہ بائیک کو ڈھابے کے اندر ہی لے گیا۔ حسبِ معمول اندر کے فیملی ہال میں روشنی ہو رہی تھی اور وہ سب وہیں جمع تھے۔ ان سب کو وہاں دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

”تم سب لوگ یہاں جمع ہو۔ اور بستی کے لوگ کہاں ہیں؟ کاشف! تم کو میں نے کتنے فون کیے۔ تم نے کال کیوں ریسیو نہیں کی۔“ وہ ان سب کو مخاطب کر کے پوچھ رہا تھا لیکن ان میں سے کسی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہت حیران ہوا۔

”تم لوگوں نے بستی والوں کو نہیں نکالا۔ وہ سب مارے جائیں گے۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ اوپر کہیں یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ آج رات کو بند توڑ دیا جائے گا۔ بس اتنی ہی مہلت ہے تم لوگوں کے پاس۔ جاؤ۔“ وہ چلایا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی قدم بڑھائے۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگوں کا تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں اپنے حصے کی اذان دے کر ہی جاؤں گا۔ میں خود جاتا ہوں بستی میں اور لوگوں کو بتاتا ہوں کہ ان کے پاس زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے کے لیے صرف چند گھنٹے ہیں۔ اگر جینا ہے تو اٹھو اور جس حال میں بھی ہو اٹھ کر بند کی طرف

دوڑ لگا دو۔‘‘

’’ولی بھائی! آپ ہم لوگوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ آپ اپنے گھر جاؤ۔‘‘

’’ٹھیک کہتے ہو۔ میرا تو اس میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر میں نے مرتے ہوئے زاہد سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔ صرف اس سے کیا وعدہ وفا کرنے کے لیے میں ایک بار بستی والوں کو بتا دوں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ پھر واپس چلا جاؤں گا۔‘‘

’’آپ وہاں مت جائیں ولی بھائی! کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ آپ نقصان ہی اٹھائیں گے۔‘‘ ایک اور لڑکے نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن ولی نے اس کی بات سنی اَن سنی کر دی۔ باہر آیا تو پریشان ہو گیا۔ اس کی بائیک غائب تھی۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہ حیران تھا کہ اس طوفانی بارش میں کون آیا اور اس کی بائیک اٹھا کر لے گیا۔ اب وہ گھر کیسے جائے گا۔ بستی تو پھر بھی نزدیک تھی۔ پیدل وہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔ لیکن گھر کیسے جائے گا؟ اسے جانا بھی ہے۔ گھر سے تین بجے تو نکلنا تھا۔ اب کیا کرے اب تو بستی پہنچنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ شاید وہاں سے کوئی رکشا، ٹیکسی مل سکے۔ ورنہ وہ وقت پر گھر نہ پہنچا تو فلائٹ بھی مس ہو جائے گی۔ یہی سوچ کر وہ پیدل تیز قدمی سے بستی کی طرف چل پڑا۔

دھواں دار اور موسلا دھار بارش میں وہ بستی کی جانب جانے والی سڑک پر کچھ ہی دور گیا ہوگا، کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے تالی بجانے کی آواز سنائی دی تھی۔ انداز جانا پہچانا ہی تھا۔ اس نے دو تین بار کی ملاقات میں جن خسروں کی تالی سنی تھی۔ یہ ویسی ہی آواز تھی۔ زاہد کو قتل کرنے کے بعد جب وہ سب سوزوکی میں بھاگ رہے تھے۔ تو ان کے گرو نے اسی طرح کی تالیاں بجاتے ہوئے اس کو بیہودہ اشارے بھی کیے تھے۔ وہ اچھی طرح جان گیا کہ وہ یہیں کہیں ہیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑتی چلی گئی۔

اس نے چاروں طرف گھوم کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی، لیکن کہیں ان کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ وہ زبردستی اسے اپنا وہم قرار دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ تالی کی آواز دوبارہ گونجی۔ اب اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ آس پاس ہی کہیں موجود تھے۔

ولی کی نظروں میں وہ سارا منظر گھوم گیا، جب وہ خسرے ہاتھوں میں ہتھیار لیے زاہد کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ جان بچا کر بھاگ رہا تھا لیکن نہیں بچ سکا۔ ایک نے چاقو پھینک کر مارا جو اس کے سینے میں ترازو ہو گیا، دوسرا بھاگتے ہوئے نزدیک سے گزرا تو کٹاری سے اس کی گردن کی شہ رگ کاٹ گیا۔ اور وہ تالی بجاتے ہوئے سوزوکی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔

اب ولی کو صحیح معنوں میں خطرے کا احساس ہوا۔ اس کی جان خطرے میں تھی۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کدھر بھاگے۔ کیونکہ تالی کی آواز کی سمت اسے ایک مرتبہ اپنے سامنے کی طرف محسوس ہوئی، تو دوسری مرتبہ پیچھے کی جانب سے۔ وہ کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر قدم بڑھاتا پھر رک جاتا۔ وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

اس وقت اس کی جیب میں پڑے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے پلاسٹک میں لپٹا فون نکال کر کان سے لگایا تو دوسری جانب مجبور تھیں اور پوچھ رہی تھیں کہ وہ کہاں ہے۔

’’میں...... میں...... پتا نہیں۔ شاید خدا کی بستی کے آس پاس کہیں ہوں۔ شاید۔ اور مجھے قاتل خسروں کی تالی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔‘‘ وہ ہانپتے ہوئے انہیں بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’ولی...... بھاگو...... بھاگو ولی...... نکلو وہاں سے...... بھاگو......‘‘ یہ سن کر اسے بس یہی سمجھ میں آیا کہ بستی کی طرف دوڑ لگا دے۔ اس نے اندھا دھند بستی جانے والی سڑک پر دوڑ لگائی اور دوڑتا چلا گیا۔ بارش، پانی اور کیچڑ نے اس کے راستے روکے، لیکن وہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ ہر مشکل سے نکل کر، ہر رکاوٹ کو توڑتے ہوئے اسے آگے جانا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور وہ بستی سے تھوڑی ہی دور تھا کہ درختوں کے پیچھے سے کچھ ٹارچ کی روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آئیں۔ پھر کسی نے اسے آواز بھی دی۔

’’ولی بھائی! رک جاؤ ولی بھائی......‘‘

وہ اپنے پھٹتے ہوئے پھیپھڑوں پر ہاتھ رکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھی آ گئے تھے۔ زاہد کے دوست۔ اس نے کئی لمبے لمبے سانس لے کر اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اور انہیں کچھ بتانے کی بھی۔

’’وہ...... وہ...... اُدھر ہیں...... وہی خسرے۔ زاہد کے...... زاہد کے قاتل۔ وہ یہیں کہیں ہیں۔ میں نے ان کی تالیوں کی آواز سنی ہے۔ شکر ہے کہ تم لوگ آ گئے۔ ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بس اب میرا بھی انجام زاہد جیسا ہی ہونے والا ہے۔‘‘

’’ٹھیک کہا ولی...... انجام تو تمہارا وہی ہونے والا ہے۔ کتنا ٹالنے کی کوشش کی تم کو۔ منع بھی کیا۔ لیکن تم پر سماجی

خدمت کا بھوت سوار تھا۔ بستی والوں کی ہمدردی میں تم حد سے گزر رہے تھے۔ بستی میں جا کر لوگوں کو بند پر بھیجنا چاہتے تھے۔ تمہیں اتنی تکلیف کیوں ہو رہی تھی ولی!''
کاشف نے نہ جانے کہاں سے ایک لمبے پھل والا چاقو نکال کر اس پر وار کیا۔ ولی نے حیرت زدہ ہونے کے باوجود خودکار طریقے سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی۔ لیکن پھر بھی چاقو نے اس کے بازو کو گہرائی تک کاٹ دیا۔
''کاشف! تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔ مجھے...... کیوں؟ میں تو تمہاری بہتری کے لیے، بستی والوں کی جان بچانے کے لیے ہی تو یہ سب کرنا چاہتا تھا۔ تم کیوں دشمنوں کی صف میں کھڑے ہو گئے۔ بلکہ تم سب بھی۔'' ولی نے ان سب کے ہاتھوں میں ہتھیار دیکھ لیے تھے۔
''کیونکہ تم اگر وہ سب کر لو گے، جو تم کرنا چاہتے ہو تو ہم کیا کریں گے؟ ہاں۔'' محمود نامی لڑکے نے جواب تو بھی وہ لفظوں میں تو نہیں لیکن اس کے لہجے اور آنکھوں کی ہوس دیکھ کر اچھی طرح سمجھ میں آ گئی۔
''اوہ تو تم سب بھی بک گئے ہوں۔ کمپرومائز ہو گئے ہو۔ کتنے میں سودا کیا ہزاروں انسانی جانوں کا۔ بولو؟'' ولی نے تلخ لہجے میں پوچھا۔
''ہم سب کو شہر کی ایک اچھی سوسائٹی میں ایک سو بیس گز کے بنگلے اور ایک ایک ٹیکسی ملی ہے۔ تا کہ ہم عزت سے روٹی کما سکیں اور سکون سے رہ سکیں۔'' کاشف نے تفصیل بتائی تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔
''صرف ایک سو بیس گز کے مکان اور ایک ٹیکسی کے عوض ہزاروں انسانوں کی زندگیوں کا سودا کر لیا۔ کیسے رہو گے ان مکانوں میں، جن کی بنیادوں میں اتنے لوگوں کا لہو ڈالا گیا ہو۔ اور ایک ٹیکسی چلا کر تم کتنی دولت کما لو گے؟''
''بکواس مت کر۔ پیسے بھی ملیں گے۔ تجھے راستے سے ہٹانے کے دو دو لاکھ الگ سے ملیں گے۔ یہ اتنا ہے کہ ہم یہاں رہ کر ساری زندگی بھی گھستے رہتے۔ تو ہمیں نہیں ملتا۔''
''اور یہ سب وعدے ہیں نا۔ وہ وعدے جو کبھی پورے نہیں ہوتے بلکہ ثبوت مٹانے کے لیے، تم سب بھی شاید مٹا دیے جاؤ گے۔ کوئی کاغذی کارروائی ہوئی ہے۔ گھر یا ٹیکسی کی۔ کوئی ایڈوانس سپاری ملی ہے تم لوگوں کو میرے قتل کی۔ نہیں نا۔ ملے گا بھی نہیں کچھ۔''
''بکواس کر کے ہمارے دماغ خراب مت کر۔ اور پڑھ لے کلمہ۔'' کاشف چلایا۔ اتنے میں پھر فون کی گھنٹی بجی۔ ولی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا فون کان سے لگایا۔ اور تیزی سے بولا۔
''وہ خسرے نہیں تھے۔ زاہد کے دوست ہیں۔ ہتھیار لیے ہوئے۔ ایک چاقو مجھے مار چکے......'' ولی نے اتنا ہی کہا تھا کہ ان لڑکوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے فون چھینا اور باقی نے اس پر حملہ کر دیا۔ جانے کتنے چاقو اور خنجر اس کے جسم میں پیوست ہوئے لیکن جان اس کٹار نے لی جو اس کی شہ رگ پر چلائی گئی۔
دور کہیں سے تالیاں بجانے کی آوازیں آئیں اور وہ سب اُدھر چل پڑے۔
عبداللہ ہاشم نے جس کی زندگی کے لیے ہزار ذلتیں اور رسوائیاں اٹھائیں۔ بھرے آفس میں تھپڑ کھانے کی بے عزتی برداشت کی۔ آج وہی زندگی دور ایک کچی سڑک پر لہو کی صورت میں پانی کے ساتھ مل کر بہہ رہی تھی۔ جوان خون نے مٹیالے اندھیروں کو کچھ دیر کے لیے ہی سہی، سرخی بخش دی تھی۔ اس کی لاش کے زخموں سے بہنے والا خون پانی کے ساتھ مل کر اس کے گرد رنگین ہالہ بنا رہا تھا اور آسمان رو رہا تھا۔
اسی وقت ایک ہیبت ناک دھماکے سے فضا تھرتھرا اٹھی۔ بند ٹوٹ چکا تھا اور قیامت خیز سیلابی ریلا اپنی بھرپور تباہ کاریوں کے ساتھ چنگھاڑتا بستیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔
اسی وقت فضا میں ایک ہیلی کاپٹر کی آواز گونجی۔ ہیلی کاپٹر میں سے نیچے دیکھتے ہوئے شمشیر خان نے مسرت سے ایک نعرہ لگایا۔
''یہ لیں بھائی جی! بچ گئیں آپ کی فصلیں۔ بند ٹوٹ گیا۔ اب تو خوش ہو۔ ہاہاہا۔''
''مجھے پتا ہے شمشیرے! تو نے اپنے کھیت بچانے ہی تھے۔ آخر تیرا بھی تو حصہ ہے نا اس میں۔ پر تیری ہشیاری کو تو مانتے ہیں بھئی! ایک تیر سے دو شکار کیسے کرتے ہیں۔ یہ تیرے سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔'' دل شیر خان نے بھائی کے کاندھے پر تھپکی دی۔
''ایک تیر سے دو شکار؟ وہ بھلا کیسے بھائی جی!''
''اوئے رہنے دے۔ سب جانتا ہوں میں۔ تو نے فصلیں بھی بچا لیں، اور تیری فیکٹری اور ہاؤسنگ اسکیم کے لیے زمین بھی صاف ہو گئی اور کس طرح کیے جاتے ہیں ایک تیر سے دو شکار ہیں جی؟'' دونوں بھائی ہنس دیے اور ہیلی کاپٹر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

❖❖❖

# نشانہ باز

مظہر حسین

ہر دور میں وقت اور جگہوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ ایسا منسوب ہوتا ہے... جو کبھی ذہن سے نہیں نکلتا... بات مشرق کی ہو یا مغرب کی خفیہ ایجنسیز بڑی خاموشی سے اپنا کام کرتی ہیں... ان کے مخبر بھی ان کے کھیل میں کام آجاتے ہیں... ایک ایسے ہی سچے نشانہ باز کی مبہم روداد... جو خود شکاری تھا مگر... اپنوں کے ہاتھوں ہی شکار ہو رہا تھا...

ایمسٹرڈیم کو دُھند نے یوں آغوش میں لے رکھا تھا گویا شہر پر ایک پُراسرار چادر کا سایہ ہو۔ یہ شہر اپنی پُرسکون فضا پر نازاں تھا مگر آج رات کچھ مختلف تھا۔ ہوا بوجھل تھی، جیسے کسی اَن کہی کشیدگی کا بوجھ ہو۔ چوک میں موجود چہل پہل کی رونق کافی مدھم پڑ چکی تھی، گویا شہر نے اپنی سانس روک لی ہو۔

کسی بینچ پر جھکی ہوئی وہ شبیہہ شاید کسی تھکے ہارے مسافر کی سی لگتی تھی، جیسے کچھ دیر کے لیے آرام کی تلاش میں ہو۔ ابتدا میں کسی نے توجہ نہیں دی لیکن جب دُھند چھٹنا شروع ہوئی اور اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اندھیرے کو چیرتے ہوئے پہنچی، تو حقیقت نے پردہ ہٹا دیا۔ ایک گولی کا زخم...... صاف، درست، گویا کسی ماہر نشانہ باز کے ہاتھ کا کام ہو......

مقامی تھانے میں فون تین بجے کے بعد آیا۔ ڈیوٹی پر موجود افسر نے سرسری سا بیان لکھا، جیسے یہ معمول کی بات ہو۔ اس ہفتے میں یہ پانچواں فون تھا، اور وہ بھی مختلف یورپی شہروں سے۔ میڈیا پہلے ہی قاتل کو ایک نام دے چکا تھا...... ”تنہا نشانے باز۔“

ڈیٹیکٹو ولیم وانر چند ہی لمحوں میں جائے وقوعہ پر پہنچا تھا۔ گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی صبح کی ٹھنڈی ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ پولیس کا یہ تجربہ کار افسر پُرتشدد اموات دیکھنے کا عادی تھا لیکن آج کا منظر کچھ اور ہی تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے موت نے کسی ماہر جراح کے ہاتھوں اپنا کام کروایا ہو...... نپا تُلا، بے خطا اور خوفناک حد تک درست۔

ولیم نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو مسلا اور اپنے کوٹ کو درست کرتے ہوئے لاش کی طرف بڑھا۔ فرانزک ٹیم پہلے ہی دستانے پہنے، پورٹیبل لائٹس کی تیز روشنی میں احتیاط سے شواہد اکٹھے کرنے میں معروف تھی۔ آدمی کی کنپٹی پر خون کی سوکھی ہوئی باریک لکیر، جسم آگے کو جھکا اور ہاتھ ڈھیلے انداز میں جڑے ہوئے تھے۔

ولیم کی نظریں زمین پر اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ اچانک، پتھروں کے بیچ ایک ہلکی سی چمک اس کی نظر میں آئی...... گولی کا خول۔ کیا یہ قاتل کا نشان تھا یا پھر کوئی چیلنج؟

وہ فوراً جھک گیا، دستانے پہنے ہاتھ سے خول اٹھایا اور اسے ثبوت والے تھیلے میں ڈال دیا۔ اس کا دماغ تیزی سے واردات کو جانچ رہا تھا۔ نشانے باز کبھی غلطی نہیں کرتا، اس کا نشانہ ہمیشہ درست ہوتا ہے، کبھی کوئی نشان نہیں چھوڑتا...... تو پھر یہ گولی کا خول کیوں؟

پیچھے کھڑا وردی پوش افسر اپنے ساتھی سے بڑبڑایا۔ ”اسے فوراً لیبارٹری بھیجو۔“

اس نے خول تھمایا اور ہدایت دے دی۔

انسپکٹر ایلینور مچل نے اپنے سنہرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اس کی نیلی آنکھیں جیسے ہر تصویر کو بار بار دیکھ کر اس میں چھپی ہوئی حقیقت کو تلاش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ آہستہ سے بولی۔ ”ہم کچھ بھول رہے ہیں...... کچھ چھوٹ رہا ہے۔ ان سارے قتل کے پیچھے ایک ترتیب ہے، کوئی بات ضرور ہے۔“

میز پر پھیلا ہوا نقشہ اس کے سامنے تھا، فرانسیسی تفتیش کار مارسل ڈوپونٹ بھی اس جانب متوجہ تھا۔ مارسل کا انداز باریک بینی میں بے مثال تھا، اس کی نظر نقشے کو مسلسل گھور رہی تھی۔ نقشے پر پانچ سرخ پنز پانچ مختلف شہروں پر نمایاں تھیں۔ پیرس، ویانا، برلن، برسلز اور ایمسٹرڈیم۔

مارسل نے پُرسکون آواز میں کہا۔ ”کبھی تم نے پُتلی تماشا شو کے بارے میں سنا ہے؟“

ایلینور کی نظریں اوپر اٹھیں۔ ''مجھے لگتا ہے تم سڑک کے فنکاروں کی بات نہیں کر رہے ہو؟''

مارسل اپنے ہاتھ سے نقشے پر ایک پن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''کٹھ پتلی کا یہ کھیل۔ وہ ڈور جو سب کو جوڑتی ہے، لیکن جو ہاتھ ان کو ہلاتا ہے، وہ چھپا ہوا ہے۔ یہ قاتل...... وہ کہانی پر قابو پا رہا ہے، ہمیں نچا رہا ہے، لیکن ہر کٹھ پتلی ایک ترتیب پر چلتی ہے۔ ابھی تک اس کی ترتیب ہم سے پوشیدہ ہے۔''

ایلینور ایک گہری سانس کھینچ کر لمحہ بھر کے لیے سوچوں میں کھو گئی۔ پھر اچانک جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر بولی۔ ''ہمیں اس کے ذہن میں جھانکنا ہوگا، اس کی طرح سوچنا ہوگا۔''

اس نے میز کے گرد بیٹھے سب لوگوں پر نظر ڈالی اور کہا۔ ''چلو، سب کچھ دوبارہ سامنے رکھو۔ ہمارے پاس کیا ہے؟''

تیز نظر رکھنے والی اطالوی تجزیہ کار، لوسیا رومانو، نے فوراً لیپ ٹاپ کھولا اور رپورٹ سامنے رکھی۔ ''پانچ مقتول، سب مرد، عمر پینتیس سے پچاس کے درمیان۔ نہ کوئی مجرمانہ ریکارڈ، نہ آپس میں کوئی تعلق۔'' اسکرین پر اسکرول کرتے ہوئے مزید معلومات دیں۔ ''پیشے بھی مختلف ہیں...... ایک بلڈر، دوسرا بینکر، تیسرا صحافی، چوتھا تاریخ کا پروفیسر، اور پانچواں ایک سیاح۔''

مارسل نے سر ہلایا۔ ''بالکل کوئی ربط نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے ہی نہ ہوں۔''

لیا رومانو کچھ دیر خاموش رہی، پھر اسکرین پر نظر جما کر بولی۔ ''ایسا ہمیں کچھ نہیں ملا، لیکن ایک بات ہے......'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''پانچوں قتل تاریخی اہمیت رکھنے والی جگہوں پر ہوئے۔ وہ مقامات جو بڑے سیاسی واقعات یا انقلابات سے جڑے ہیں۔''

ایلینور کی آنکھوں میں چمک آئی۔ اس کے دل کی دھڑکن کافی تیز ہو گئی۔ ''یہ بات دوبارہ کہو۔''

لوسیا نے چشمہ درست کیا اور فوراً کہا۔ ''ہر مقام کسی ہنگامہ خیز لمحے سے جڑا ہے۔''

''پیرس، پلیس ڈی لا کونکورڈ، جہاں انقلابیوں کو پھانسی دی گئی۔ ویانا: ہوفبرگ پیلس کے قریب، جہاں شاہی اقتدار کا زوال ہوا۔ برلن: برینڈن برگ گیٹ کے پاس، تاریخ کے بوجھ تلے دبی ایک علامت۔ ایمسٹرڈیم: کینال ڈسٹرکٹ، وہ گلیاں جو دوسری جنگِ عظیم میں لڑائیوں کی خاموش گواہ بنیں۔''

کمرے میں ایک گہرا سکوت چھا گیا۔ فوراً ایلینور کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ''یہ قتل بے ترتیب نہیں ہیں۔ شاید وہ کہنا چاہتا ہے۔''

مارسل نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ''مگر کیا؟ کیا وہ طاقتور اداروں کے مقامات سے نشانہ بنا رہا ہے یا پرانی حکومتوں کے اثرات کو چیلنج کر رہا ہے۔''

لوسیا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ایک اور بات ہے۔ ایمسٹرڈیم شہر میں ملا گولی کا خول...... وہ جان بوجھ کر چھوڑا گیا تھا، جیسے وہ اپنے ہی اصول توڑ رہا ہو۔''

ایلینور نے مارسل کی طرف گھورتی نظروں سے دیکھا، جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو۔ ''اسنائپر بدل رہا ہے، یا شاید وہ خود ہی عام مجرموں جیسا بنتا جا رہا ہے۔ مارسل، مجھے ان تاریخی مقامات کی ساری تفصیلات دو اور پچھلی دہائی میں غائب ہونے والے کسی بھی فوجی تربیت یافتہ نشانے باز کی فہرست نکالو۔''

مارسل نے حکم بجالا کر کندھے جھکاتے ہوئے نقشہ بند کیا۔ ''اور اگر ہم اسے ڈھونڈ لیں؟''

ایلینور کی نظریں چمک اٹھیں۔ ''تو ہم اس کے اگلے قدم سے پہلے اس کے دھاگے کاٹ دیں گے۔''

☆☆☆

پراگ ہمیشہ سے رازوں کا شہر رہا ہے جہاں آسمان کو چھوتے ہوئے سیاہ مینار پتھریلی گلیوں پر گہرا سایہ ڈال رہے تھے۔ ہوا میں بارش اور پرانے پتھروں کی خوشبو رچی بسی تھی۔ یہاں کی تنگ گلیوں میں کہر کا جال پھیلا ہوا تھا۔ آج رات، اسی کہرے میں ایک نیا جرم ہوا تھا۔

ولیم وانر نے سردی سے بچنے کے لیے اپنا کوٹ سینے سے لپیٹا اور وِشہراڈ کے قدیم قلعے کی طرف قدم بڑھائے جو دریا کے کنارے واقع تھا۔ تازہ ترین شکار سینٹ پیٹر اور سینٹ پاول گرجا گھر کی سیڑھیوں پر پڑے تھے، ان کا خون تاریخی درازوں میں بہہ کر سوکھ گیا تھا۔

محققین دستانوں سے ڈھکے ہاتھوں کے ساتھ خاموشی سے کام میں مصروف تھے۔ قریب ہی کھڑی ایلینور مچل ایک ٹیکنیشن کو زخم کا معائنہ کرتے دیکھ رہی تھی۔

''ایک ماہر نشانہ، ٹھوڑی کے قریب......'' وہ آہستہ سے کہہ رہی تھی جب ولیم اس کے قریب آیا۔

ولیم نے سنجیدہ لہجے میں سر ہلایا۔ ''وہی مہارت، وہی خاموشی۔ وہ اپنے ہنر کو مزید نکھار رہا ہے۔''

ایلینور نے گہری سانس لی اور ماتھے کو رگڑا۔ ''ہم اس بار قریب تھے۔ گولی قلعے کی دیواروں میں کہیں سے چلائی گئی تھی۔ ہمارے پاس سکیورٹی کیمروں کا جال ہے مگر......'' اس کی آواز میں جھجک تھی۔

ولیم نے سوال کیا۔ ''مگر کیا؟''

اسی لمحے تجزیہ کار لوسیا رومانو ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا ٹیبلٹ تھامے آگے بڑھی۔ ''ہم نے اسنائپر کی قریبی کیمرے سے فوٹیج حاصل کی ہے۔'' اس نے اسکرین پر انگلی رکھی، یکایک تصویر ابھری، مگر رنگوں سے خالی، دھندلی سی سیاہ و سفید ویڈیو۔

لوسیا نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ دیکھو......''

ایلینور کی انگلیاں مٹھی میں بند ہو گئیں۔ ''یہ خرابی تھی یا جان بوجھ کر مداخلت؟''

لوسیا نے سر ہلایا۔ ''اتفاق ہو سکتا ہے مگر اس شخص کی مہارت دیکھتے ہوئے مجھے شک ہے۔ کسی نے فوٹیج میں مداخلت کی ہے۔''

ولیم نے اسکرین کو غور سے دیکھا۔ ''وہ چمک، وہ خلل...... یہ بے ترتیب نہیں تھا۔ پراگ سانفرکیس جیسا......'' اس نے سرگوشی کی۔

ایلینور چونک گئی۔ ''کیا؟''

ولیم نے آہستہ سے کہا۔ ''بارہ سال پہلے، ایک ہتھیاروں کا سوداگر، وکٹر کالڈر، مشرقی یورپ میں خفیہ مال لے کر جا رہا تھا۔ وہ دو چیزوں کے لیے مشہور تھا۔ بے عیب نشانہ بازی اور ڈیجیٹل نقوش مٹانے کی صلاحیت۔ جب بھی ایجنسیاں قریب پہنچتیں، خفیہ کیمرے پُراسرار طور پر ناکام ہو جاتے۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ۔''

لوسیا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''تم کہنا چاہتے ہو کہ......''

ولیم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''یہ صرف ایک مفروضہ ہے، اگر وہ واپس آ گیا ہے تو یہ سب اسی کا کام ہو سکتا ہے۔''

ایلینور نے آہستہ سے سانس چھوڑا۔ ''انٹرپول نے تو کہا تھا کہ کالڈر مر چکا ہے؟''

ولیم نے اسے مایوس کن نظر سے دیکھا۔ ''کتنی آسانی سے سب نے مان لیا۔ مگر کبھی کوئی لاش نہیں ملی۔ بس یہ افواہیں کہ وہ اندھیروں میں گم ہو گیا۔''

ایلینور نے سیڑھیوں پر پڑی لاش کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تو شاید وقت آ گیا ہے کہ ہم اسے روشنی میں واپس لائیں۔'' پھر وہ مارسل کی طرف مڑی۔ ''کالڈر کی پچھلی

سرگرمیوں، ساتھیوں، فرضی ناموں... جو کچھ بھی ہاتھ لگ سکے، سب نکالو۔"

مارسل نے اثبات میں سر ہلایا اور فون نکال کر ایک طرف ہٹ گیا۔

☆☆☆

سی برگ کے ایک دھندلی روشنی والے کیفے میں، ایلینور رچل اور ولیم واز ایک عورت کے سامنے بیٹھے تھے۔ تینوں کے چہروں پر بے چینی چھائی ہوئی تھی۔ میز پر کافی کا ایک کپ رکھا تھا جس کے کنارے پر اسے تھامے ہوئے لینا کی انگلیاں لرز رہی تھیں، اس کی آنکھوں میں انجانے خوف کی جھلک نمایاں تھی، وہ بار بار دروازے کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی، جیسے کسی لمحے دروازہ کھلے اور اندر کوئی شیطان در آئے۔

"مجھے نہیں معلوم، میں یہاں کیوں آئی۔" لینا نے سرگوشی جیسی آواز میں کہا۔ "اگر اسے پتا چل گیا تو......"

ولیم نے اس کی بات کاٹی۔ "تم یہاں محفوظ ہو۔"

لیکن لینا کے چہرے پر ایک کھوکھلی ہنسی اُبھری۔ "محفوظ؟" اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔ "تم سمجھتے نہیں ہو۔ تمہیں لگتا ہے کہ یہ بس ایک قاتل کی تلاش ہے مگر وہ صرف بندوق والا آدمی نہیں ہے۔ وہ ایک سایہ ہے، ایک بھوت ہے۔ اسے غائب ہونا آتا ہے، خود کو مٹانا آتا ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ تم اس کی تلاش میں ہو، تو سمجھ لو، اسے تمہارے بارے میں سب کچھ پتا ہے۔"

ایلینور نے اسے غور سے سنا اور پھر میز سے تھوڑی آگے جھک کر اپنی آواز کو دھیمی کر کے بولی۔ "ہم جانتے ہیں وہ وکٹر کالڈر ہے۔ ہم جانتے ہیں اسے برسوں پہلے مردہ قرار دے دیا گیا تھا لیکن اگر یہ قتل اسی کے ہاتھوں ہو رہے ہیں تو ہمیں جاننا ہوگا، کیوں؟"

لینا کا سانس یہ نام سن کر اچانک اٹک گیا۔ لمحے بھر کے لیے وہ خاموش رہی، پھر جیسے دل میں کوئی فیصلہ کرنے کی کشمکش ہو، ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "تم غلط زاویے سے دیکھ رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟" ایلینور نے سوال کیا۔

لینا نے کنپٹیاں مسلیں، جیسے وہ فیصلہ کر رہی ہو کہ بات آگے بڑھائے یا نہیں۔ آخرکار اس نے کہا، اس کی آواز میں خوف سے زیادہ ندامت تھی۔ "وہ کھیل کے لیے نہیں مار رہا، نہ پیسے کے لیے۔ اس افراتفری کے پیچھے ایک نقشہ ہے، مگر تم صرف آدمی تصویر دیکھ رہے ہو۔" وہ لمحہ بھر کو رکی پھر مدھم آواز میں کہا۔ "یہ انتقام ہے۔"

ایلینور کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔ "انتقام کس سے؟"

لینا کے ہونٹ ہلے، وہ کچھ کہیں بولی۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دے پاتی، کیفے کا دروازہ یک دم زور سے کھلا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا...... لمبا، منہ چھپائے ہوئے۔ لینا پتھر کی طرح ساکت ہو گئی۔ اس کی انگلیاں کپ کو اتنی شدت سے جکڑ گئیں کہ وہ ٹوٹنے کے قریب تھا۔ اس کی سانس بے قابو اور نبض گلے میں تیز دھڑکنے لگی۔

ایلینور فوراً چوکس ہو گئی۔ اس نے جیکٹ کے پیچھے ہاتھ ڈالا، اس کی انگلیاں چھپے ہتھیار کے قبضے کو چھو گئیں۔ وہ آدمی لمحے بھر کو رکا، پھر کچھ کہے بغیر رات کی تاریکی میں گم ہو گیا مگر سب ظاہر ہو چکا تھا۔

لینا نے جلدی کرسی پیچھے دھکیل دی اور کپ کو گراتے ہوئے جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ "مجھے جانا ہوگا!" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ "تم سمجھتے نہیں ہو، اس کی نظریں ہر جگہ ہیں۔"

ایلینور بھی فوراً کھڑی ہو گئی۔ "لینا، رک جاؤ!" وہ پکارتی رہ گئی لیکن بے چین لینا جا چکی تھی، برلن کی گلیوں میں گم ہو کر۔"

ولیم نے گہری سانس لی اور بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خیر، یہ تو واقعی چونکا دینے والا تھا۔"

ایلینور خاموش رہی۔ "وہ ہمیں کچھ اہم بتانے والی تھی۔ کچھ ایسا جو اس نشانے باز کے اصل مقصد سے متعلق تھا۔"

وہ ولیم کی طرف مڑی۔ "ہمیں اسے ڈھونڈنا ہوگا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کرے۔"

باہر ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی جو گلیوں کو دھو رہی تھی۔ لیکن کچھ داغ کبھی نہیں مٹتے، خاص طور پر وہ جو بھوت چھوڑ جاتے ہیں۔

ولیم کو سراغ رسانی کے کام میں برسوں ہو گئے تھے لیکن اس نے وکٹر کالڈر کا نام کسی فعال فائل میں نہیں دیکھا تھا مگر اب وہ نام اس کے سامنے یوں چمک رہا تھا جیسے ادھورے حساب کتاب کی گہرائیوں سے کوئی بھوت دوبارہ زندہ ہو گیا ہو۔

کمرے کے اس پار، ایلینور رچل بازو سینے پر لپیٹے ہوئے بے چین گھوم رہی تھی۔ لینا بات کرنے کو تیار تھی، وہ خوف زدہ تھی یا پھر کسی نے اسے ڈرا دیا۔ شاید خود کالڈر نے۔

ولیم نے اس کی بات بمشکل سنی۔ اس کا ذہن ماضی کی دھندلی گلیوں میں جا چکا تھا، ان برسوں میں جب انٹرپول نے کالڈر کو مردہ قرار دیا تھا۔

اس نے ایک پرانی رپورٹ پلٹی، وہی جو اس نے دس برس سے نہیں چھوئی تھی...... پراگ سانحہ کیس۔ اس وقت قیادت ولیم کے ہاتھ میں تھی، آخری بار جب کوئی کالڈر کے قریب پہنچا تھا۔ بارہ سال پہلے کی یاد آج بھی تیز تھی، جیسے وقت رکا ہوا ہو۔

بڈاپسٹ کے باہر ایک محفوظ ٹھکانے پر چھاپا، ہتھیاروں کے سوداگروں کے لیے جال...... کالڈر بھی ان میں شامل تھا۔

انہیں اطلاع ملی تھی کہ وہ وہاں ہوگا، اور کچھ بڑا منصوبہ بنا رہا ہے۔ ولیم نے ایک یونٹ کی قیادت کی، بوسیدہ عمارت کے اندھیروں میں راستہ بناتے ہوئے، بندوق اٹھائے، سانس قابو میں رکھتے ہوئے۔

اور دو ماہ بعد، سرکاری طور پر اسے مردہ قرار دے دیا گیا...... ایک جلی ہوئی گاڑی میں نامعلوم لاش۔

یہ سب کچھ حد سے زیادہ آسان تھا، جیسے سچائی خود کو چھپانے کے لیے تیار تھی۔

ولیم اچانک رک گیا۔ ''اور اب وہ واپس آ گیا ہے۔''

ایلینور نے اس کی نظریں پڑھیں، وہ جواب پہلے ہی جانتی تھی۔

''برلن؟ اگلا ہدف۔'' مارسل نے سر ہلایا۔

''یہ ہو سکتا ہے۔'' ولیم نے فائل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے گہری سانس خارج کی۔ ''تو ہمیں اس کی طرح سوچنا ہوگا۔ اگر وہ تاریخ کو خون سے دوبارہ لکھ رہا ہے، تو اگلا صفحہ کہاں ہوگا؟''

☆☆☆

ویران عمارت کی چھت پر، ایلینور مچل نے اپنی رائفل سنبھالی اور نیچے چوک پر نظریں گاڑ دیں۔ فرانسیسی حکام نے بمشکل انٹرپول کو گرفتاری کی ہدایت کی تھی، مگر وہ جانتی تھی کہ ان کا صبر اب ختم ہونے کو ہے۔ یہ ایک جُوا تھا...... ایسا جُوا جس میں ہارنا ممکن نہیں تھا۔

اس کے ساتھ ولیم وانر دوربین لگائے جھک کر گلیوں کو کسی باز کی طرح دیکھ رہا تھا۔ ''اگر ہم درست سوچ رہے ہیں تو وہ چھپ نہیں سکے گا۔''

ایلینور نے رائفل پر گرفت مضبوط کر لی۔ ''وہ بہت شاطر ہے۔ جب تک اسے فرار کا یقین نہ ہو، وہ گولی نہیں چلائے گا۔''

ولیم نے سر ہلایا۔ ''یعنی وہ ابھی ہمیں دیکھ رہا ہے۔''

ایلینور کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ ''کہاں ہو تم، کالڈر؟''

نیچے کا چوک مصنوعی زندگی سے بھرپور تھا، گویا شطرنج بچھائی جا چکی تھی...... ایجنٹ جو سیاحوں، صحافیوں اور ہوٹل کے عملے کے روپ میں چھپے ہوئے تھے۔ پورا علاقہ ایک اسٹیج بن چکا تھا، ہر کردار اس طرح رکھا گیا تھا کہ تنہا شاہ باز کو کھلے میں لایا جا سکے مگر پھر بھی کچھ غلط محسوس ہو رہا تھا۔

تب اُس نے دیکھا...... دور کہیں ہلکی سی جنبش۔ ایک سایہ جو وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔

''جنوب کی طرف، اوپر چھت کی جانب......'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

ولیم نے دوربین گھمائی۔ ''میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ شبیہہ اندھیرے میں لپٹی بمشکل نظر آ رہی تھی، مگر ایلینور جانتی تھی۔ وہ اس کی موجودگی کو ہوا میں بکھری ہوئی بجلی کی طرح محسوس کر سکتی تھی۔''

''یہ وہی ہے۔'' ولیم نے سرگوشی کی۔

ایلینور کی انگلی ٹریگر پر منڈلا رہی تھی، ایک گولی، صاف اور درست...... سب کچھ ختم ہو جاتا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتی، اچانک وہ حرکت میں آیا۔

''پیچھے نہیں، سیدھا اُن کی طرف۔''

ایلینور کی سانس رک سی گئی۔ ''وہ جانتا ہے ہم یہاں ہیں۔''

دور کہیں، ایک گونج سی اٹھی، پھر وہ لمحہ آیا جس کا تصور بھی انہوں نے نہیں کیا تھا۔ اچانک قیامت ٹوٹ پڑی۔ گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی، اور یہ گولیاں کالڈر کی طرف سے نہیں، بلکہ کسی اَن دیکھی سمت سے آ رہی تھیں۔

ایک تھادہ حملہ۔

ولیم نے گالی دی اور جھک گیا، گولیاں پتھروں سے ٹکرا کر اچھل رہی تھیں۔ ایلینور نے فطری طور پر لڑھک کر خود کو ڈھال کے پیچھے کر لیا۔

''یہ جال ہے۔ وہ جانتا تھا ہم جال بچھا رہے ہیں اس لیے اس نے ہمارے لیے جال بچھا دیا۔''

افراتفری کے بیچ، اس نے کالڈر کو دیکھا...... پُرسکون انداز میں چلتا ہوا جیسے اس کے پاس کافی وقت ہو۔

ولیم ریڈیو کی طرف لپکا۔ ''یونٹس، حرکت میں آؤ! وہ جنوب مغرب کی طرف نکل رہا ہے، روسینٹ۔ اِتوان سے گزر رہا ہے!''

جیسے ہی اس نے بولنا شروع کیا، وکٹر کالڈر وہاں سے

جاچکا تھا۔

☆☆☆

پیرس...... یہ شہر خوابوں کا، مگر حقیقت میں ایک فریب تھا۔ یہ اپنی چمک دمک سے آنکھوں کو خیرہ کرسکتا تھا، رومانیت کی سرگوشیاں کرسکتا تھا، دلوں کو بہکا سکتا تھا۔ لیکن آج رات، اس سنہری پردے کے پیچھے ایک اور کھیل جاری تھا...... سایوں کا، دھوکے کا، اور مہلک منصوبوں کا۔

ایلینور مچل تیزی سے دوڑ رہی تھی، پسینہ ماتھے پر چمک رہا تھا۔ وہ روسینٹ۔انتوان کی بھیڑ میں لوگوں سے بچتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے سامنے ولیم وانز تھا۔

"وہ کہاں گیا؟" ایلینور نے ریڈیو میں چیخ کر پوچھا۔

مارسل کی جھنجلاہٹ سے بھری ہوئی آواز آئی۔ "غائب ہوگیا۔ دائرے میں کوئی نشان نہیں۔ جیسے وہ کبھی یہاں تھا ہی نہیں۔" لیکن وہ جانتے تھے، یہ سچ نہیں تھا۔

وکٹر کالڈر یوں غائب نہیں ہوتا۔ "وہ شکار نہیں بنتا، شکار کرتا ہے۔"

اچانک ایلینور نے رفتار کم کی، سانس سنبھالا اور خود سے کہا۔ "سوچو...... ہم یہاں کیوں ہیں؟ ابھی کیوں؟"

منصوبہ مکمل سوچا سمجھا تھا۔ ایک بڑا ہدف، ایک سوچا سمجھا مقام۔ مگر کالڈر جانتا تھا کہ وہ اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

"یہ بھاگنے کا کھیل نہیں تھا۔ یہ قابو کرنے کا کھیل تھا۔"

ولیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جیسے دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہوں۔

"وہ ہمیں کھینچ رہا ہے۔" ولیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم اسے نہیں ڈھونڈ رہے۔ وہ ہمیں وہاں لے جا رہا ہے جہاں وہ چاہتا ہے۔"

مارسل کی آواز پھر آئی۔ "ہم نے اس کے پچھلے تمام اہداف دیکھے ہیں۔ ایک بات مشترک تھی۔ انقلاب کی جگہیں، طاقت کے بدلنے کے مقام۔ چونکہ پیرس اس میں فٹ بیٹھتا ہے لیکن آج رات کیوں؟"

ایلینور نے اردگرد نظر دوڑائی۔ پھر اس کی نگاہ سڑک کے آخری جانب جا ٹھہری...... پانتھیون، ایک عظیم گنبد والی عمارت۔ تاریخ کا مسکن، انقلابیوں اور رہنماؤں کی آرام گاہ جنہوں نے فرانس کو نئی شکل دی۔ اس کی نبض تیز ہوگئی۔

"وہ وہاں جا رہا ہے۔" اس نے کہا اور قدم بڑھا دیے۔

ولیم کا چہرہ سخت ہوگیا۔ "ہمارے پاس وقت کم ہے۔"

یہ عمارت رات کی چاندنی میں عظیم الشان لگ رہی تھی جس کا اوپری حصہ روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ یہاں کے پہرے دار داخلی دروازے پر گشت کر رہے تھے، اس بھوت سے بے خبر جو سایہ بن کر حرکت کر رہا تھا۔

قریب کی عمارت کی چھت پر وکٹر کالڈر دوربین لگائے ایلینور اور ولیم کو بڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ بالکل ٹھیک وقت پر۔ پھر اس نے جیب سے ایک نشان زدہ گولی نکال کر چیمبر میں ڈالی، نرم سی کلک کانوں میں گونجی۔ اور نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

گولی کی آواز موت کی سرگوشی کی طرح پیرس کی رات کی خاموشی کو چیرتے ہوئے گونجی۔ ایلینور نے اس آواز کو سننے سے پہلے، ہوا کے تیز جھٹکے کو محسوس کیا جب گولی اس کی کنپٹی کے قریب سے گزری، اتنی نزدیک کہ وہ اس کی حرارت محسوس کرسکتی تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا، جیسے ابھی وہ ماضی کی طرح موت کے قریب ہو۔

ایک پل میں، ایلینور زمین پر گرگئی اور ولیم بھی اس کے


متحدہ عرب امارات میں مقیم
اردو قارئین کے لیے خوشخبری
جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)
کے چاروں رسائل
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت
ایک فون کال کے فاصلے پر
آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔
اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زائد آر ڈی، ای 311 شارجہ
971504805734
URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

ساتھ لڑھکتا ہوا، دونوں عمارت کے ستون کے پیچھے چھپ گئے۔ اگر گولی ایک انچ دائیں طرف لگتی تو وہ مرچکی ہوتی۔

”نشانے باز کہاں ہے؟“ ولیم ریڈیو میں دہاڑا۔

”جنوب کی طرف چھت پر، پانچویں عمارت کے سامنے!“ مارسل کی کرخت آواز آئی۔ ”نیچے رہو، حرکت نہ کرو۔“

ایلینور کا دل تیز دھڑک رہا تھا، وہ اپنی سانس پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کا جسم خوف سے ساکت تھا۔ وہ پہلے بھی موت کا سامنا کر چکی تھی مگر یہ صورت حال مختلف تھی۔ یہ موت کا چہرہ نہیں، یہ کچھ اور ہی تھا۔ یہ ذاتی انتقام جیسا تھا۔

اس نے جیب سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکال کر اسے گھماتے ہوئے ستون کے پار جھکایا۔ گلی سنسان تھی، چھتیں سیاہی میں ڈوبی ہوئی تھیں لیکن وہ جانتی تھی، کالڈر اب بھی اوپر ہے اور وہ انہیں دیکھ رہا ہے۔

”وہ ہمیں مارنا نہیں چاہتا۔“ اس نے آہستہ کہا۔

ولیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا کہا؟“

”اس کا نشانہ ٹھیک تھا، ولیم۔ وہ کبھی چوکتا نہیں۔ اس نے جان بوجھ کر نشانہ خطا کیا۔ وہ کھیل رہا ہے ہمارے ساتھ۔“

ولیم نے چھت کی طرف نظریں گاڑ دیں۔ ”تو یہ کسی بڑے کھیل کا آغاز ہے۔“

ایلینور نے بھی یہی محسوس کیا۔ یہ اب تعاقب نہیں رہا تھا۔ کالڈر انہیں آزما رہا تھا، ایک بڑی چال چل رہا تھا۔

اچانک منڈیر پر ایک سایہ ہلا، پھر ایک اور گولی...... سیدھی ولیم کی طرف۔ وہ بمشکل بچا، گولیاں اس کے پاؤں کے قریب زمین میں سوراخ کرتی گزریں۔

”بس، اب بہت ہوگیا!“ ایلینور نے غصے سے رائفل اٹھائی، اس کا اسکوپ درست کرتے ہوئے نشانہ سیدھا کر لیا۔ اس بار، وہ کسی صورت چوکنے والی نہیں تھی۔

چھت پر نظر جمائی، وہ وہاں تھا...... وکٹر کالڈر۔ سیدھا کھڑا، پُرسکون، جیسے کوئی خطرہ نہ ہو۔ رائفل کندھے پر لٹکی ہوئی، ہاتھ پہلو میں، ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ لیے۔

ایلینور کی انگلی ٹریگر پر سخت ہوگئی۔ ”کرو... ختم کردو۔“

کالڈر نے سر کو ذرا سا جھکایا، پھر اپنی کنپٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ایلینور رک گئی۔ ”یہ کیا کر رہا تھا؟“

”شاید وہ کچھ سمجھانا چاہ رہا ہو۔“

پھر کالڈر نے جیب سے چاندی کی گولی نکالی، اسے اوپر اٹھایا، چاندنی کی روشنی اس پر چمکی، اور پھر اسے انگلیوں سے چھوڑ دیا۔ گولی سیدھی ایلینور کے قدموں کے پاس گری، جیسے ایک پیغام، ایک انتباہ، یا شاید ایک وعدہ۔

پھر وہ مڑا اور رات کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ جب تک وہ اس چھت پر پہنچے، کالڈر جا چکا تھا۔

زمین پر واپس آکر، ایلینور نے گولی اٹھائی۔ اس پر ایک لفظ نقش تھا۔ ”روم۔“

اس نے ولیم کی طرف دیکھا۔ ”وہ ہمیں بتا رہا ہے کہ اگلا مقام کہاں ہے۔“

ولیم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”تو ہم روم جا رہے ہیں۔“

☆☆☆

وہ کولوزیم کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے جہاں اس کے پرانے پتھروں پر سورج کی سنہری روشنی نرم لہروں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ روم کی گلیوں میں زندگی کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں، سیاح چوک میں گھوم رہے تھے اور عاشق قدیم محرابوں کے سائے میں آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہے تھے۔ مگر ایلینور رچل اور ولیم وانز کے لیے یہ خوشگوار سفر نہیں بلکہ ایک خطرناک مشن تھا، جس کا مرکز وہ گولی تھی جس پر لفظ ”روم“ کندہ تھا۔ وہ دونوں اسی نشان کی پیروی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے، اور اب اس دہلیز پر کھڑے تھے، جہاں ہر قدم ان کے مقدر کا فیصلہ کرسکتا تھا۔

انٹرپول کے ایجنٹ ہر طرف پھیل چکے تھے، ہجوم میں پوشیدہ مارسل نگرانی کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کا دھیان ہر گلی، ہر چھت پر تھا۔ کوئی خطرہ مول نہیں لیا جا رہا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جس کا انتظار تھا۔ ایلینور نے ائرپیس پر سرگوشی کی۔

”کوئی خبر؟“

مارسل کی محتاط آواز آئی۔ ”وہ یہیں آس پاس ہے، ورنہ ہمیں یونہی روم نہیں بلاتا۔“

ولیم نے کولوزیم کی بلند محرابوں کی طرف نظریں دوڑائیں۔ ”کالڈر بھاگنے والا نہیں، اگر یہ اس کا آخری کھیل ہے، تو اس نے اسٹیج سوچ سمجھ کر چنا ہے۔“

ایلینور نے سر ہلایا۔ ”تو پھر ہم اندر جا رہے ہیں۔“

عمارت کے اندر ہوا ٹھنڈی اور خشک تھی، وہاں کی پتھروں اور گرد کی ملی جلی مدھم خوشبو، ایک پُراسرار سا احساس پیدا کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ماضی کے بھوت خاموشی میں منڈلا رہے ہوں، وہ دونوں جاسوس سرنگوں بھول بھلیوں میں قدم رکھے جا رہے تھے۔ اچانک ایک آواز آئی، ایک سوچا سمجھا قدم۔ ایلینور اور ولیم نے فوراً بندوقیں تھامتے ہوئے رخ موڑا۔

وہ وہاں تھا...... ایک محراب کے نیچے کھڑا، وکٹر کالڈر،

اس کا سایہ چاندنی کی ٹوٹی کرنوں میں ڈھلا ہوا۔ سیاہ کوٹ میں، رائفل بے فکری سے کندھے پر لٹکی ہوئی، جیسے یہ پرانے دوستوں کی ملاقات ہو۔

چند لمحے خاموشی میں گزرے، پھر کالڈر کے ہونٹوں پر ایک حقیرانہ مسکراہٹ اُبھری۔ ''میں سوچ رہا تھا، تمہیں پہنچنے میں مزید کتنا وقت لگے گا؟''

ایلینور نے پستول پر انگلی مزید سخت کرلی۔ ''ہتھیار ڈال دو۔''

کالڈر ہنسا۔ ''ایلینور، اگر میں تمہیں مارنا چاہتا، تو یہ کام پیرس میں کرچکا ہوتا، یا ایمسٹرڈیم شہر یا پھر برلن میں۔''

ولیم ایک قدم آگے بڑھا۔ ''تو پھر ہم یہاں کیوں ہیں، ڈکٹر؟''

کالڈر نے گہری سانس لی۔ اس کی نظریں عمارت کی بلند دیواروں پر جاکر ٹھہر گئیں۔

''یہ جگہ...... کبھی انصاف اور تماشے کا میدان تھی۔ لوگ اپنی جان کے لیے لڑتے تھے، اور دنیا تماشا دیکھتی تھی۔ کچھ چیزیں کبھی نہیں بدلتیں۔''

ایلینور نے اسے غور سے دیکھا۔ ''وہ بھاگنے والے آدمی کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔ تم کوئی پیغام دینا چاہتے ہو؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''لیکن کس کو؟''

کالڈر کی مسکراہٹ گم ہوکر کچھ اور بن گئی، جیسے کچھ کچا، کچھ زخمی سا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے درد کی جھلک چمکی۔ یہ جنون نہیں تھا بلکہ اذیت تھی۔

ولیم نے بازو باندھ کر پُرسکون انداز میں پوچھا۔ ''تو بتاؤ، ڈکٹر...... کون سا سچ تمہیں بولنے پر مجبور کررہا ہے؟''

ایک لمحے کے لیے فضا پر گہری خاموشی چھاگئی۔ پھر اچانک کالڈر کی آواز گونجی، جیسے کسی زخمی روح کی چیخ ہو۔ ''انہوں نے میرے خاندان کو مارڈالا!'' یہ الفاظ پتھروں سے ٹکرا کر عمارت کے اندر واپس پلٹے۔

ایلینور نے ولیم کی طرف چونک کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں ایک لمحے کے لیے ملیں۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

کالڈر نے پھر ایک گہری سانس لی، جیسے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو اکٹھا کررہا ہو۔ پھر اس نے دھیرے سے بات شروع کی۔ ''بارہ سال پہلے، بڈاپیسٹ میں...... اسلحے کا سودا۔ ولیم، تمہیں یاد ہے؟''

ولیم کا جسم تن گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وہی پراگ سائفر کیس ہے، جس کا تعلق اسلحے کی خرید و فروخت سے تھا جس پر گھنٹوں تفتیش کی گئی تھی۔ مگر اب سب کچھ بدلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کالڈر نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں درد اور بغاوت کی لرزش تھی۔ ''میں صرف اسلحہ فروش نہیں تھا...... میں مخبر تھا۔ میں اس زندگی سے نکلنا چاہتا تھا، مگر انہوں نے اجازت نہ دی۔ وہ میرے خاندان کے پیچھے آئے۔''

یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا، جیسے پرانی تکلیف کی یادیں زخم بن کر پھر سے رسنے لگی ہوں۔

''جن لوگوں کے لیے میں کام کرتا تھا، جنہوں نے وہ آپریشن چلایا، انہوں نے مجھے ختم کرنے کا حکم دیا۔ مگر نشانہ غلط لگ گیا۔'' کالڈر کے لہجے میں غصہ اور درد کی جھلک تھی۔

ایلینور نے کچھ دیر کے لیے خاموش رہ کر سوال کیا۔ ''تم کہنا چاہتے ہو، انہوں نے تمہاری بیوی اور بیٹی کو مارڈالا؟''

کالڈر کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے گہرا دکھ چھلکا۔ ''انہیں زندہ جلادیا اور سب کچھ چھپادیا پھر دنیا کو بتایا کہ میں غائب ہوگیا۔''

ولیم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ وہاں موجود تھا، وہیں ان تمام واقعات کے بیچ، جب اس نے اس آپریشن کی قیادت کی تھی۔ اس نے یہ سمجھا تھا کہ کالڈر محض ایک... مجرم ہے، لیکن اب، کولوزیم عمارت کی قدیم دیواروں کے بیچ کھڑا، اس نے سچائی دیکھ لی تھی۔

کالڈر صرف شکاری نہیں تھا...... وہ خود شکار تھا۔ اور اس کی فہرست کا آخری نام...... ایک ایسا نام تھا جس پر ولیم نے خود اعتماد کیا تھا۔

ایلینور کی آواز لرزی۔ ''تم نے جو پانچ آدمی مارے۔ کیا وہ ذمے دار تھے؟''

کالڈر کی نظر اندھیرے میں معلق ہوگئی۔ ''یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے حکم پر دستخط کیے۔''

ولیم نے دبا ڈالا۔ ''کالڈر؟''

کالڈر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ ''فہرست کا آخری نام...... وہ جس نے سب کچھ ترتیب دیا۔'' پھر اس نے سیدھا ولیم کی طرف دیکھا۔

ایلینور کی سانس رک گئی۔ ''وہ یہاں ہے؟ روم میں؟''

کالڈر نے سر ہلایا۔ ''اگر تم عقل مند ہو تو مجھے یہ کام مکمل کرنے دو۔''

ایلینور نے اپنے پستول پر گرفت مزید سخت کرلی۔ اس کے ذہن میں خیالات طوفان کی طرح دوڑ رہے تھے۔ ڈکٹر کالڈر نے پانچ آدمی مارڈالے تھے مگر وہ بےقصور نہیں تھے۔ وہ مجرم تھے۔

ولیم کے ہاتھ مٹھیوں میں بند ہو گئے۔ برسوں تک وہ اس آدمی کا پیچھا کرتا رہا، یہ سوچ کر کہ وہ ایک دہشت گرد ہے، مگر اب، عمارت کے بیچ کھڑا اس نے سچائی دیکھ لی تھی۔ کالڈر وہ درندہ نہیں تھا جسے وہ سمجھتے رہے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔

اچانک ایلینور کے ریڈیو سے ایک کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ آواز اُبھری۔ مارسل نے اطلاع دی کہ عمارت کی دوسری سمت کچھ ہلچل ہے۔ ایک اور ٹیم قریب آ رہی ہے، مسلح ہے، اور وہ ہماری نہیں۔

ولیم کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔

کالڈر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا اور بولا۔ ”وہ اپنی گندگی صاف کرنے آئے ہیں۔“

ایلینور نے ولیم کی طرف دیکھا۔ ”دونوں جانتے تھے کہ اب فیصلہ قانون کے مطابق ہونا چاہیے۔ کالڈر کو گرفتار کر کے حوالے کریں...... یا کوئی اور راستہ اختیار کریں؟“

ولیم نے سخت لہجے میں کہا۔ ”گرفتار کرو۔“

ایلینور لمحے بھر کو حیران رہ گئی، پھر آہستہ سے اپنا پستول نیچے کر دیا۔ ”نہیں، ہم ایسا نہیں کریں گے۔ کیونکہ کبھی کبھی انصاف قانون کی کتابوں میں نہیں ملتا بلکہ اندھیروں سے نکل کر روشنی دیتا ہے۔“

☆☆☆

روم کی صبح پہلی کرنوں کے ساتھ جاگ اٹھی۔ قدیم شہر کی لمبی پرچھائیاں پتھریلی گلیوں پر پھیل گئیں، جو رات کی نمی سے اب بھی تر تھیں۔ کولوزیم کی عمارت ان کے پیچھے کھڑی تھی، ایک خاموش گواہ اس سب کا جو ہوا تھا...... حالانکہ باضابطہ طور پر، کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ایلینور رچل اور ولیم وانز خاموش گلیوں میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے قدم سست، ناپ تول کر، جیسے ہر قدم ایک بوجھ کی طرح تھا۔ سارا جوش ختم ہو چکا تھا، اب صرف فیصلے کا بوجھ باقی تھا۔

وکٹر کالڈر غائب ہو چکا تھا...... نہ کوئی نشان، نہ گولی، نہ لاش۔ اور جب مارسل اپنی ٹیم کے ساتھ کولوزیم عمارت میں داخل ہوا تو وہاں صرف موت کا سکوت تھا۔ وہ لوگ جو کالڈر کے پیچھے تھے، جن کے پاس اصل طاقت تھی، جنہوں نے سچ کو دفن کیا تھا...... سب ختم ہو چکے تھے۔

ایلینور باہر فوارے کے قریب رکی۔ سنہری دھوپ اس کے پانی پر جھلک رہی تھی، جیسے ایک نیا آغاز ہو۔ اس نے ایک آہ بھری، بالوں میں ہاتھ پھیرا اور پھر ولیم کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں لگتا ہے وہ کبھی رکے گا؟“ اس نے سوال کیا۔

ولیم نے کندھے اُچکائے۔ ”اس نے اپنی فہرست مکمل کر لی۔ اس نے بدلہ لے لیا۔“

”یہ جواب نہیں ہے۔“

ولیم نے دھیرے سے کہا۔ ”مجھے نہیں لگتا ایسے لوگ کبھی رکتے ہیں۔“

ایلینور نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ”اس نے برسوں قاتلوں کا پیچھا کیا تھا، مگر اس بار، آج اس نے ایک کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ وہ لوگ جنہیں کالڈر نے مارا تھا، وہ بے قصور نہیں تھے۔ انہوں نے ظلم کیا، سازشیں کیں، شہریوں کو قتل کیا، اپنے جرائم کو سفارتی استثنیٰ کے پردے میں چھپایا۔ انہوں نے کالڈر کے خاندان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور کبھی انصاف کا سامنا نہیں کیا تو کالڈر خود انصاف بن گیا۔“

ایلینور نے آہ بھری۔ ”انٹرپول اسے یوں نہیں چھوڑے گا۔ اگر وہ دوبارہ سامنے آیا تو......“

”وہ نہیں آئے گا۔“ ولیم کی آواز میں یقین تھا۔ ”کالڈر بہت چالاک ہے۔ اس نے اس گولی کے ساتھ ہمیں ایک اشارہ دیا تاکہ ہم اس کا سراغ لگائیں، مگر وہ یہ یقینی بنائے گا کہ دوسری گولی نہ چلے۔“

”اور اگر چل گئی؟“

ولیم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ ”تو ہم ہی وہ لوگ ہوں گے جو اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔“

ایلینور نے آہستہ سے سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیس ختم ہو چکا مگر کچھ بھوت کبھی نہیں مٹتے۔“

کہیں دور، ایک ٹرین دیہات کو چیرتی ہوئی پٹریوں پر دوڑ رہی تھی۔ فرسٹ کلاس ڈبے میں ایک آدمی اکیلا بیٹھا تھا، کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے۔ اس کا سیاہ کوٹ، اس کی رائفل اور اوزار...... سب پیچھے رہ گئے تھے۔ سوائے ایک چیز کے۔ ایک گولی، جو اس کی انگلیوں میں تھی۔

وکٹر کالڈر نے گولی کو پلٹا۔ اس پر کندہ نام اب دھندلا ہو چکا تھا۔ اس نے وہ کر لیا تھا جس کے لیے آیا تھا۔ اس کی جنگ ختم ہو چکی تھی...... یا کم از کم وہ خود کو یہی یقین دلا رہا تھا۔

ایک خاموش سانس کے ساتھ، اس نے گولی کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ وہ ہوا میں غائب ہو گئی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو آگے لے جانے دیا۔

❖❖❖

# بکھرے خواب

مظہر سلیم ہاشمی

**سکون زندگی کی دولت ہے... ضرورت ہے... اسی سکون کو پانے کے لیے انسان در در بھٹکتا ہے... ناکامیوں کا دکھڑا سناتا ہے... اپنی پریشانی کے اسباب لیے پھرتا ہے... حالانکہ انسان چاہے تو تلخ حقائق کو بھلا کر کسی مہربان دوست کے میٹھے بولوں کو یاد کرکے خوش و مطمئن ہو سکتا ہے... مگر کچھ لوگ لذتِ آزار کے رسیا ہوتے ہیں... ایک واقعے سے بندھ کر اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کو بھی رگیدتے چلے جاتے ہیں...**

ایک عادی مے نوش کے شب و روز گزارنے کا نیا انداز......

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ چار مہینوں میں ایک انسان مکمل طور پر بدل سکتا ہے لیکن جب کیپریلیان عرف کیپری نے فریڈ ڈوبیک کو ''ڈراپ بیک'' نامی اپنے شراب خانے میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے ڈوبیک کو خراماں خراماں ٹہلتے انداز میں اندر آتے دیکھا تو وہ حیران ہی رہ گیا...... اب اس کے پاس جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے...... ایک انسان مکمل طور پر تبدیل ہونے پر قادر ہے۔ وہ اتنا حیران ہوا کہ کاؤنٹر کے پیچھے

کھڑا بس منہ کھولے اسے گھورتا ہی رہ گیا۔
آج کی طرح اس دن بھی بارش ہو رہی تھی جب اس نے آخری بار ڈوبیک کو دیکھا تھا۔

اس رات وہ شخص اتنا ہی تباہ حال تھا جتنا کوئی انسان آخری حد تک ہو سکتا ہے۔ اس نے اتنا نشہ کر رکھا تھا جو دو آدمیوں کے لیے کافی ہوتا۔ اس اکیلے کے لیے یہ ضرورت سے بہت زیادہ تھا اور اس کی حالت برباد تھی۔ لیکن آج تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے...... ایک بہترین حلیے میں وہ سامنے آیا تھا۔

وہ ایک اچھے انداز میں سلے ہوئے سوٹ میں ملبوس تھا۔ وہ بالکل ہوش میں تھا یعنی اس کے انداز و اطوار میں نشے کی مدہوشی مفقود تھی اور وہ اس طرح نارمل دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر کبھی کوئی ذاتی المیہ گزرا ہی نہ ہو۔ ہر غم سے عاری پُرسکون چہرہ......

یکلخت ہی کیپری کو ایک عجیب سا احساس ہوا...... جیسے پچھلے سات مہینے گزرے ہی نہ ہوں بلکہ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے خود کلامی کی۔

اسے ایسے احساسات پسند نہیں تھے اس لیے ان خیالات کے آتے ہی اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے انہیں جھٹک دیا۔ پھر اس نے ایک اُداس سی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کی جانب دیکھا۔

ڈوبیک چلتا ہوا آیا اور اپنے پرانے اسٹول پر بیٹھ گیا...... وہی اسٹول جس پر وہ اس خوفناک واقعے کے بعد تین ماہ تک ہر رات مسلسل بیٹھتا رہا تھا۔ اس کا یہ معمول تب بنا تھا جب ایک سہ پہر اس نے کام سے گھر آ کر اپنی بیوی کو مردہ حالت میں پایا تھا۔ کسی ظالم... شخص نے اس کی بیوی کا سر کچل کر اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

درحقیقت...... کیپری اس میں آنے والی تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

قتل سے پہلے وہ ڈوبیک یا اس کی بیوی کو زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ بس علاقے کے عام لوگ تھے جو کبھی کبھار پینے پلانے کی نیت سے اس کے ہاں آ جاتے تھے۔

وہ ان دونوں میاں بیوی کو ہی پسند کرتا تھا۔ ڈوبیک سے اس کی اچھی یا بہتر شناسائی اس خوفناک واقعے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ بے انتہا شراب نوشی کر رہا تھا اور اس کی حالت تباہ کن ہو چکی تھی۔

لگتا نہیں تھا کہ وہ بچ پائے گا اسی لیے اس تبدیلی نے اسے بے انتہا حیران کر دیا تھا۔

ڈوبیک اور اس کی بیوی ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے...... ان کی پسند کی شادی تھی اور اس شادی میں دنیا کی پروا کیے بغیر ان دونوں کے بیچ صرف اور صرف محبت تھی۔ وہ شمع تھی اور یہ اس کا پروانہ تھا۔

وہ اس کے حسن کا، اس کی اداؤں کا بُری طرح سے دیوانہ تھا۔ اسے پرستش کرنے کی حد تک چاہتا تھا۔ کیپری نے اپنی زندگی میں بھی کسی سے ایسی محبت نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا۔

بہرحال...... جب اس کا قتل ہوا تو ڈوبیک بُری طرح ٹوٹ گیا۔ اس نے کیپری کو چند بار بتایا تھا...... اپنی بیوی کے بغیر، وہ خود بھی جینا نہیں چاہتا تھا لیکن اس میں خودکشی کی ہمت نہیں تھی۔

ہاں قطرہ قطرہ وہ مر سکتا تھا...... شراب کی بوتل اس کے نزدیک آسان ترین خودکشی ہی تھی۔

ڈوبیک نے کہا تھا کہ اس کے خودکشی نہ کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ وہ قاتل کو سزا ملتے دیکھنا چاہتا تھا۔ پولیس ابھی تک اسے پکڑ نہیں سکی تھی۔ وہ منتظر تھا کہ کب قاتل اپنے انجام کو پہنچے گا۔

تفتیش کے آغاز میں پولیس والوں نے ڈوبیک پر بھی شک کا اظہار کیا تھا...... لیکن اس کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا پکا ثبوت موجود تھا۔

ویسے بھی...... ان دونوں میاں بیوی کے تمام دوستوں نے بتایا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے تو پولیس نے اپنی تفتیش کا رخ بدلا، ورنہ وہ اسی کوشش میں تھے کہ کسی طرح ڈوبیک کو ہی مجرم قرار دے دیں۔

اگرچہ اس دن علاقے میں کسی نے کوئی مشکوک آدمی نہیں دیکھا تھا پھر بھی پولیس نے اس نظریے پر کام شروع کر دیا۔ وہ تفتیش کرنے لگے کہ کیا کوئی نشئی زبردستی ڈوبیک کے اپارٹمنٹ میں تو نہیں گھسا تھا یا کوئی چور ہو جسے کسی نے وہاں آتے جاتے دیکھا ہو۔

واردات بہت بھیانک تھی۔ ڈوبیک کے گھر کو بُری طرح الٹ پلٹ کیا گیا تھا۔ کچھ زیورات اور نقدی غائب تھی۔ اس کی بیوی کا سر ایک لیمپ سے کچلا گیا تھا اور پولیس کا خیال تھا کہ اس نے چوری کے دوران مین غالباً مزاحمت کی کوشش کی تھی۔

پولیس کی تفتیش جاری تھی چنانچہ ڈوبیک ہر رات ڈراپ بیک پر آتا رہا...... وہاں وہ جی بھر کر شراب پیتا اور اس انتظار میں رہتا کہ پولیس کو قاتل مل جائے۔ اسی دوران تین مہینے گزر گئے...... وہ ابھی تک قاتل کو تلاش نہیں کر پائے تھے۔ کیپری کو

تب ہی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کبھی قاتل کو نہیں ڈھونڈ پائیں گے اور حقیقت یہی تھی کہ اب تک ایسا ہی تھا۔

آخری رات جب اس نے ڈوبیک سے ملاقات کی تھی...... تب اس نے پہلی بار یہ بات تسلیم کی تھی اور پھر وہ خاموش رہا تھا۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد نجانے اس کے دل میں کیا سودا سمایا کہ وہ بارش میں باہر نکل کر غائب ہو گیا۔

بڑے دنوں کے غیاب کے بعد وہ اچانک ہی آج سامنے نظر آیا تھا اور ایک بالکل ہی بدلا ہوا انسان دکھائی دے رہا تھا۔

''ویلکم...... ویلکم۔'' کیپری نے اسے خوش آمدید کہا۔

ڈوبیک نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔

''ڈوبیک، تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔'' کیپری نے کہا۔ ''میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہارے ساتھ آخر کیا ہوا...... تم چار مہینے پہلے بغیر اطلاع دیے اتنے اچانک سے غائب ہو گئے تھے۔''

''مجھے لگتا ہے تمہیں امید نہیں تھی کہ میں دوبارہ آؤں گا، ہے نا، ہیری؟'' ڈوبیک نے پوچھا۔

''اگر تم سچ پوچھو تو واقعی امید نہیں تھی......'' کیپری نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ''لیکن تم بہت بہتر لگ رہے ہو...... تم اتنے عرصے تک آخر کہاں گم تھے؟''

''زندگی کے بکھرے ٹکڑوں، کچھ بکھرے خوابوں کو دوبارہ جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' ڈوبیک نے جواب دیا۔ ''زندگی کا کوئی نیا مقصد تلاش کر رہا تھا۔''

کیپری نے اثبات میں سر ہلایا...... پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔

''اگر تمہیں میرا یہ کہنا برا نہ لگے تو تم سے ایک بات کہوں؟''

''ہاں...... کہو۔''

''تم جانتے ہو......'' کیپری قدرے ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔ ''مجھے لگا تھا تم بربادی کی طرف جا رہے ہو یا پھر قبر کی طرف۔''

''نہیں، مجھے برا نہیں لگا۔ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، کیپری۔''

''اچھا...... کیا میں تمہیں کوئی ڈرنک دوں؟'' کیپری نے فوراً پوچھا۔ ''جنجر ایل...... تمہاری پسندیدہ۔''

''میں نے شراب چھوڑ دی ہے۔'' ڈوبیک نے نرمی سے انکار کیا۔ ''لیکن آج تم پلا دو...... تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

کیپری اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا اس لیے اس بات پر اور بھی زیادہ حیران ہوا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں یعنی کچھ شراب نوش، جن کے بارے میں آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کبھی پینا پلانا چھوڑیں گے۔ ان کے اور شراب کے بیچ دوری بس موت ہی پیدا کر سکتی ہے اور ان تین برے مہینوں کے آخر میں ڈوبیک کے بارے میں اسے ایسا ہی لگا تھا۔

''ایک بار کا مالک ہونے کے ناتے مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے...... لیکن مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی ہے۔'' کیپری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں نے اس کاروبار کے بیس سالوں میں کوئی ایک چیز سیکھی ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ اپنی پریشانیاں یا غم شراب میں نہیں ڈبو سکتے۔ میں نے سیکڑوں لوگوں کو یہ کوشش کرتے دیکھا ہے اور ایک بھی ان میں سے کامیاب نہیں ہوا۔''

''مجھے یاد ہے تم نے مجھے درجنوں بار یہ بتانے کی کوشش کی تھی......'' ڈوبیک نے کہا۔ ''خوش قسمتی سے...... مجھے وقت پر احساس ہو گیا کہ تم صحیح کہتے تھے۔''

اس دوران کیپری نے گلاس میں برف ڈالی اور اسے مشین کی مدد سے جنجر ایل سے بھر دیا۔ جب اس نے گلاس کاؤنٹر پر رکھا، تو دوسرے سرے پر بیٹھے دو مزدوروں میں سے ایک نے اسے ایک اور بیئر کے لیے آواز دی۔

اس نے بیئر کی ایک یخ بستہ بوتل نکالی اور وہاں لے گیا اور پھر واپس آ کر ڈوبیک کے سامنے جھک گیا۔

''تو چار مہینے پہلے...... یہاں سے غائب ہو جانے کے بعد تم کہاں گئے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، کیا تم شہر میں ہی رہے یا کہیں اور؟ مجھے معلوم ہے تم نے وہ علاقہ چھوڑ دیا تھا۔''

''نہیں...... میں یہاں نہیں رہا۔'' ڈوبیک نے اپنی جنجر ایل ...کا گھونٹ بھرا۔

''پھر......؟''

''یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسان کو بصیرت کیسے ملتی ہے...... کیپری۔'' ڈوبیک نے رسان سے کہا۔ ''اور عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اس میں کتنا وقت لگتا ہے۔ میں نے تین مہینے کسی چیز کی پروا کیے بغیر گزارے...... خود کو شراب میں ڈبو کر، خود پر ترس کھاتے ہوئے۔ پھر ایک صبح میں جاگا اور مجھے احساس ہوا کہ میں اس طرح مزید ایسے نہیں چل سکتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کیوں...... لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے خود کو ٹھیک کرنا ہے۔ میں شہر سے باہر پہاڑوں میں ایک کرائے کے کیبن میں گیا اور وہاں شراب چھوڑی۔ باقی نصیحت مجھے وہیں ملی...... مجھے احساس ہوا کہ میں نے پینا کیوں چھوڑا ہے...... اور اب مجھے کیا کرنا ہے۔''

''کیا؟'' کیپری کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''وہ میری زندگی کا مقصد تھا۔''

''وہ کیا تھا ڈوبیک؟''

''کیرن کے قاتل کی تلاش۔''

کیپری پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا...... ڈوبیک اب

کوئی نشئی یا زندہ لاش نہیں تھا بلکہ بالکل ہی بدلا ہوا انسان بن چکا تھا۔

وہ ٹی وی ڈراموں اور فلموں کا ہیرو نہیں تھا جسے لوگ دیکھتے ہیں اور ایک منٹ کے لیے بھی اس پر یقین نہیں کرتے لیکن جب حقیقی زندگی میں اس طرح کی بات کرنے والے شخص کو دل کی گہرائیوں سے سنتے ہیں...... تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ سچ کہہ رہا ہے اور یہ سچ سن کر اچھا بھی لگتا ہے۔

پھر بھی کیپری کو لگا کہ یہ ڈوبیک کا سب سے سمجھداری والا فیصلہ نہیں تھا...... حقیقی زندگی اور زمینی حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تو بالکل بھی نہیں۔

کیپری نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا فریڈ...... لیکن اگر پولیس اسے نہیں ڈھونڈ سکی تو تم کیا ہی کر لو گے؟''

ڈوبیک نے اس حقیقت پسندانہ تجزیے پر سر ہلایا۔

''میں خود ان تمام اعتراضات و سوالات سے گزر چکا ہوں کیپری۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے کوشش کرنی ہے۔ میں شہر واپس چلا آیا اور میں نے تلاش شروع کر دی۔''

''یعنی یہ کام تم پہلے ہی شروع کر چکے ہو؟'' کیپری نے ایک گلاس کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... میں نے ٹینڈرلوئن کے بارز میں کافی وقت گزارا۔ وہاں میں کچھ آوارہ مزاج لوگوں سے ملا...... میں ان میں بالکل ہی گھل مل گیا تھا۔ کم و بیش انہوں نے مجھے قبول کر لیا تھا...... ان کا اعتماد حاصل کرنے کے کچھ عرصے بعد میں نے سوال پوچھنے کا آغاز کیا اور جواب حاصل کرنا شروع کر دیے۔''

''تمہارا مطلب ہے......'' کیپری نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں واقعی اس آدمی کا سراغ مل گیا جس نے یہ سب کیا تھا؟''

''نہیں...... مجھے ملنے والے تمام جواب نفی میں تھے۔'' ڈوبیک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر......؟''

''ڈیئر کیپری...... مجھے بالکل کچھ نہیں پتا چلا سوائے اس بات کے کہ پولیس کیرن کے قاتل کے بارے میں بالکل ہی غلط تھی۔ وہ کوئی نشئی یا چور اُچکا یا کسی قسم کا اسٹریٹ کرمنل نہیں تھا۔''

''تو پھر وہ کون تھا؟''

''کوئی ایسا جسے وہ جانتی تھی...... جس پر وہ بھروسا کرتی تھی۔'' ڈوبیک نے جواب دیا۔ ''کوئی ایسا جسے وہ اپارٹمنٹ میں بنا کسی رکاوٹ کے آنے دیتی۔''

''تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے...... شاید ایسا ہی ہوا ہو۔'' کیپری نے کہا۔

''یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

''تمہیں کوئی اندازہ ہے یہ کوئی کون ہو سکتا ہے؟''

''شروع میں تو نہیں ہوا تھا......'' ڈوبیک بولا۔ ''لیکن کچھ خفیہ تحقیق کرنے کے بعد...... علاقے کا پھر سے چند بار دورہ کرنے کے بعد...... یہ سب ایک ریاضی کے سوال کے آسان جواب کی طرح سامنے آ گیا۔ صرف ایک ہی ایسا شخص ہو سکتا تھا۔''

کون؟'' کیپری نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکیا۔''

''ڈاکیا......؟'' کیپری اس کے جواب پر بھونچکا رہ گیا۔

''بالکل......'' ڈوبیک نے سنجیدگی سے کہا۔ ''سوچو ذرا کیپری...... اور کس کی ہمارے اپارٹمنٹ تک اتنی آسانی سے رسائی ہو سکتی تھی؟ اور کسے پڑوسی اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے دیکھ بھی سکتے تھے اور انہیں کچھ عجیب بھی نہ لگتا...... یا بعد میں وہ اسے یاد بھی نہ رکھتے کیونکہ اس کی موجودگی کوئی انوکھی بات نہ ہوتی؟''

''اچھا...... تو تم نے پھر کیا کیا؟''

''میں نے اس کا نام اور پتا معلوم کیا اور پچھلے ہفتے ایک رات اس سے ملنے پہنچ گیا۔''

''کیا...... اکیلے ہی؟ پولیس کو بھی نہیں بتایا؟'' کیپری نے پھٹی آنکھوں سے سوال کیا۔

''ہاں اکیلے ہی......'' ڈوبیک نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے اس کے جرم کے بارے میں اپنی معلومات کے ساتھ چیلنج کیا...... اس نے قدرتی طور پر فوراً ہی ہر بات کی تردید کی...... اور وہ آخر تک انکار ہی کرتا رہا۔''

''آخر تک؟'' کیپری کے لہجے میں اب خوف جھلکنے لگا تھا۔

''ہاں...... آخر تک...... جب تک میں نے اسے مار نہیں ڈالا......'' ڈوبیک نے ایسے کہا جیسے کسی معمولی مچھر مارنے کی بات کر رہا ہو۔

کیپری کے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی...... اس کے سارے اندیشے سچ نکلے تھے۔

''مار ڈالا؟ ڈوبیک، تم مذاق کر رہے ہو؟ تم نے واقعی اسے نہیں مارا نا......''

''تم اس کے لیے اتنے صدمے کا شکار مت ہو......'' ڈوبیک نے کہا۔ ''وہی قاتل تھا تو میں اور کیا کر سکتا تھا؟''

''پولیس کو بتا سکتے تھے۔'' کیپری کے لہجے میں افسوس تھا۔

''میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا...... میں اسے پولیس کے پاس نہیں لے جا سکتا تھا۔'' ڈوبیک کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ''لیکن اس نے کیرن کے ساتھ جو کیا تھا...... اس کے بعد

میں اسے اس کے دردناک انجام سے بچ کر جانے بھی نہیں دے سکتا تھا..... تم سمجھتے ہو نا؟''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا.....'' ڈوبیک نے جواب دیا۔''میں نے وہ بندوق نکالی جو میں نے ایک گروی رکھنے والی دکان سے نہایت سستے داموں خریدی تھی۔ میں نے اسے گولی ماردی..... سیدھا اس کے دل میں۔''

''اوہ خدایا.....'' کیپری نے کہا۔''اوہ خدایا۔''

کیپری کو شاید اب ڈوبیک کی بات کا مکمل یقین آگیا تھا اس لیے وہ خود پر قابو کھو بیٹھا۔

ڈوبیک نے اس کا یہ ردِعمل دیکھ کر مسکرانا بند کر دیا اور ماتھے پر بل ڈالے پنی جنجر ایل کو گھورنے لگا..... وہ اچانک سے ہی خاموش اور کچھ اُداس سا ہو گیا۔

کیپری کو یکلخت احساس ہوا کہ بار میں کتنی خاموشی ہو گئی ہے..... اور اسے کچھ نہ سوجھا تو اس نے ٹی وی چلا دیا۔

اسی اثنا میں دونوں مزدور بار کے دوسرے سرے سے اٹھے..... اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور میز کی جانب اشارہ کیا جہاں انہوں نے ادائیگی کے لیے رقم رکھ دی تھی اور ہنستے مسکراتے باہر کی جانب چلے گئے۔

ڈوبیک نے اچانک کہا.....''صرف ایک بات کی وجہ سے مجھے احساس ہوا کہ وہ قاتل نہیں ہو سکتا تھا۔''

کیپری تڑپ کر ٹی وی سے مڑا۔

''کیا؟'' اس کے لہجے میں افسوس حیرانی اور خوف یکجا تھے۔

''یہی کہ ڈاکیا صرف ایک وجہ سے قاتل نہیں ہو سکتا تھا۔''

''وہ کیا؟'' کیپری نے پوچھا۔

''وہ ڈاکیا قاتل نہیں ہو سکتا تھا.....'' ڈوبیک نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا اور پھر وضاحت کی۔''وہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا شخص تھا..... یعنی کھبا اور پولیس نے ثابت کیا تھا کہ قاتل غالباً دائیں ہاتھ والا تھا۔''

''تو پھر قاتل کون تھا؟''

''کیرن کو مارنے والی ضرب کے زاویے کے بارے میں، میں نے سوچا تو کچھ کچھ آئیڈیا ہوا..... تب ہی میں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا کہ اور کون ہو سکتا ہے..... اور پھر میں جان گیا.....'' ڈوبیک اپنی ہی روانی میں بول رہا تھا۔

''کون؟''

''وہ کریانہ کا سامان پہنچانے والا لڑکا ہو سکتا تھا۔ ہم دو دکانوں سے سودا لیتے تھے..... یعنی دو ڈیلیوری بوائے اور پتا چلا کہ وہ دونوں دائیں ہاتھ والے تھے۔'' ڈوبیک کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''پھر.....؟''

''پھر میں نے پہلے لڑکے سے بات کی اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہی قاتل ہے..... چنانچہ میں نے اسے گولی ماردی..... پھر مجھے احساس ہوا میں غلط تھا.....'' ڈوبیک نے اپنی بات میں وقفہ لیا۔''میری بیوی کیرن کا قاتل وہ دوسرا والا تھا..... میں نے اسے بھی گولی ماردی۔''

''ارے.....'' کیپری نے غصے سے کہا۔''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔''

''تو دوسرا والا تمہاری بیوی کا قاتل تھا؟''

''نہیں..... قاتل وہ دونوں ڈیلیوری بوائز بھی نہیں تھے۔''

ڈوبیک کی آنکھوں میں یکلخت ہی ایک چمک سی اُبھری۔

''تم..... تم.....'' کیپری کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ڈوبیک کو کس انداز میں سنبھالے۔

''تم نے پھر کیا کیا؟''

''میں نے سوچا.....''

''کیا سوچا؟''

''آخر پھر کون ہو سکتا ہے؟ میرے علاقے میں سے کوئی اور..... اور پھر مجھے سمجھ آ گئی۔ میں جان گیا کہ وہ کون ہونا چاہیے۔''

کیپری ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا سُن رہا ہے۔ سب کچھ بہت تیزی سے ہو رہا تھا۔ ڈوبیک جس طرح پل پل بات بدل رہا تھا، اسے سمجھنا آسان نہیں تھا۔

''پھر کون تھا؟'' اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''تم.....'' ڈوبیک نے نفرت سے کہا۔''تم کیرن سے اچھی طرح واقف تھے..... اور تمہارا میرے گھر آنا جانا بھی تھا۔''

آخرکار جب تک اس نے بندوق نہیں نکالی تب تک کیپری سمجھ نہ سکا کہ کیا ہو رہا ہے.....؟ کہ ان تین غمگین..... سوگوار ترین..... اور نشہ آور مہینوں کے بعد ڈوبیک دراصل کیا بن چکا تھا۔ لیکن اب سمجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔

گولی کے دھماکے کے بعد کیپری نے آخری چیز جو سُنی، وہ ٹیلی وژن پر آوازیں تھیں۔ ایک کرائم ڈراما..... جہاں آدمی کی بیوی قتل ہو جاتی ہے اور وہ باہر نکل کر اصلی قاتل کو ڈھونڈ لیتا ہے اور کہانی کے کلائمکس کے وقت تک ہیرو بن جاتا ہے۔

حقیقی زندگی میں تلاش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور ہیرو ذہنی توازن کھو کر ہر جاننے والے کو قتل کرنے کے مشن پر نکل چکا تھا۔

❖❖❖

بارہواں حصہ

# سربہ کف

طاہر جاوید مغل

دکھ کی کہانی بڑی دردناک ہوتی ہے... جسے سنانا آسان نہیں ہوتا... بعض اوقات سنانے والے کے پاس اس کا اپنا ذہن ساتھ نہیں دیتا... مضبوط شانیں ڈھلک چکے ہوتے ہیں... اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں دکھ کیا ہے... شدید ترین مسافت کی تھکن کے باوجود حالات کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے چپ چاپ چلتا چلا جاتا ہے... کبھی خود سے کبھی راستوں سے الجھتا ہے... مگر کسی آواز پر رکتا نہیں... اسے تلاشنا تھا... اپنا پرانا پیراہن... دل گرفتہ تھا... طلسمات غم ہستی سے سانسیں رکتی تھیں مگر اس کی تلاش... شناخت کا رقص جنوں اسی طرح تازہ تھا... ہر بچھڑی ساعت سے اسے گلے ملنا تھا... ظلم کی ڈور کہاں اور کیسے ٹوٹی تھی، ابھی معلوم نہ تھا... ایک دُھن تھی جو سنائی نہیں دیتی تھی پھر بھی اس کی لے پر آگے بڑھنے کا سلسلہ جاری تھا...

سنسنی خیز واقعات اور انتقام کے جذبات سے لبریز ایک لہورنگ داستان

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس پُراسرار شخص سے گوٹھ نوشیر اور پھر زرعی فارم میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ہر بار وہ ایک عجیب سا تجسس چھوڑ کر اوجھل ہوا تھا۔ اب بھی اس نے فون پر جو کچھ کہا، وہ ناقابلِ فہم تھا۔ اس نے اس ''ان کاؤنٹر اسپیشلسٹ'' کا ذکر کیا تھا جس نے رانی جان کی کوٹھی میں خون ریزی کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ انسان کے روپ میں ایک شیطان ہے۔

ماہین ابھی تک اپنے کمرے میں بند تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کا سامنا نہیں کر سکتی۔ اس نے میرے سامنے آنے سے بھی کلی طور پر انکار کیا تھا۔ پوری عمارت میں سوگواری کی سی کیفیت تھی۔ ٹی وی پر رہ رہ کر وہی نیوز چل رہی تھیں جن میں رانی جان کی کوٹھی میں ہونے والی قتل و غارت کا ذکر تھا۔ سادو ڈکیت کی موت کا تذکرہ بھی بار بار کیا جا رہا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ ہفتے کے روز بڑی ''بہادری'' سے شانے مینشن پر کامیاب آپریشن کرنے والے ڈی ایس پی ڈوگرے بھی سادو ڈکیت کے حملے میں شدید زخمی ہوئے ہیں اور اسپتال میں ان کی حالت نازک ہے (حالانکہ ہم جانتے تھے ڈوگرے کو سادو ڈکیت نے نہیں مبینہ ان کاؤنٹر اسپیشلسٹ نے گولی ماری تھی)

دوپہر سے ذرا پہلے میں اور شاہ زیب کامن روم میں بیٹھے موجودہ صورتِ حال

پر غور کررہے تھے۔ شاہ زیب نے کہا۔ ''معلوم نہیں اشفاق کی حالت اب کیسی ہے؟ میرے خیال میں آپ انوش کو فون کرلیں۔''

میں نے ابھی فون جیب سے نکالا ہی تھا کہ کال کے سگنل آنے لگے۔ یہ انوش ہی کا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی مگر دوسری طرف سے جو آواز آئی، وہ انوش کی نہیں تھی۔ ایک شخص نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''آپ مسٹر تابش بول رہے ہیں؟''

''ہاں تابش ہوں۔ خیریت تو ہے۔ انوش کہاں ہے؟''

''انوش زخمی ہوا ہے...... کسی نے اٹیک کیا ہے اُس پر۔ آپ فوراً اسپتال پہنچیں۔''

''زخمی کیسے ہوا؟''

''گولیاں لگی ہیں اس کو۔ آپ وقت ضائع نہ کریں۔ فوراً آئیں۔''

''اور اس کا ساتھی اشفاق؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ڈاکٹر عثمان بول رہا ہوں۔ آپ سے کہا ہے نا، آپ جلدی آجائیں۔ ہم انوش کو آپریشن تھیٹر میں لے جارہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

شاہ زیب بھی ہماری بات سن چکا تھا۔ انوش جٹ جاتے ہوئے مجھے اس پرائیویٹ اسپتال کا ایڈریس دے گیا تھا۔

ہم فوراً باہر نکلے۔ لان میں قسطینا بھی موجود تھی۔ شاہ زیب نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ہم اسپتال جارہے ہیں۔

''کہیں، یہ کوئی چال نہ ہو؟'' قسطینا نے کہا۔ ''آپ اس نمبر پر کال بیک کرکے دیکھیں۔''

''کوشش کی ہے مگر نمبر مسلسل انگیج جارہا ہے۔'' میں نے کہا۔

شاہ زیب بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ رسک لینا پڑے گا۔''

ہم دونوں چند لمحے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر ایک ساتھ ہی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ شاہ زیب نے قسطینا سے کہا۔ ''ڈیئر! تمہیں یہاں چوکس رہنا ہے۔''

''فکر نہ کریں۔'' وہ تن کر بولی۔

یہاں پر گرے کلر کی ایک فارچیونر گاڑی موجود تھی۔ اس میں ایک لوڈڈ سیون ایم ایم بھی تھی مگر ہمیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم دونوں کے پاس پسٹل موجود تھے۔ گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے ٹنٹڈ تھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور تیزی سے اسپتال کی جانب روانہ ہوئے۔

سردی بڑی تیزی سے بڑھی تھی۔ حالانکہ یہ دوپہر ایک بجے کا وقت تھا اور ہلکی دھوپ بھی تھی پھر بھی ہوا میں ٹھیک ٹھاک ٹھنڈک تھی۔ سڑکوں پر معمول کا رش تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ پولیس تندہی سے ہمیں تلاش کررہی ہے۔ عین ممکن تھا کہ گوٹھ نوشیر کے کچھ صف شکن بھی یہاں پہنچ کر ہماری تلاش میں شریک ہوچکے ہوں۔ میں نے مین روڈ کے بجائے چھوٹی سڑکیں استعمال کیں اور دس منٹ میں اس پرائیویٹ اسپتال تک پہنچ گیا۔

یہ ایک چھوٹا لیکن جدید اسپتال تھا۔ اسپتال کا سینئر ڈاکٹر ہی اس کا مالک بھی تھا اور یہ عثمان نامی سرجن ڈاکٹر میڈم مرینہ اور انوش کے واقفان میں سے تھا۔ یہ اسپتال بھی مرینہ کی تعمیراتی کمپنی نے ہی بنایا تھا۔ ذہن مسلسل انوش والے واقعے میں اُلجھا ہوا تھا۔ ہم نے دور ہی سے جائزہ لیا۔ اسپتال سے باہر کوئی غیر معمولی صورتِ حال نظر نہیں آئی۔ ایسے پرائیویٹ اسپتالوں میں رش عموماً شام کے بعد ہی ہوتا ہے۔ پارکنگ میں صرف تین گاڑیں موجود تھیں، البتہ اسپتال کے داخلی راستے پر کھڑے دو پرائیویٹ گارڈ سراسیمہ نظر آتے تھے اور ان کے چہرے گواہی دیتے تھے کہ یہاں کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔

شاہ زیب نے اپنی پی کیپ چہرے پر جھکا رکھی تھی۔ میں نے بھی اپنی چادر میں چہرے کو کسی حد تک چھپا لیا تھا۔ انوش جٹ ایک نڈر اور بہادر شخص کا نام تھا۔ گوٹھ نوشیر میں اس نے جس طرح وقاص کی بیمار والدہ کے قتل کا انتقام موقع پر ہی لیا تھا، وہ یادگار تھا۔ پہلوان حشمت اسے کسی وقت پنجابی گبرو کے نام سے پکارتا تھا...... اب یہ گبرو کسی بدنظری کا شکار ہوکر آپریشن تھیٹر میں تھا۔ گو اندازہ تو یہی ہورہا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے مگر جب تک ہم اسے دیکھ نہ لیتے، ہماری تسلی نہ ہوتی۔

جونہی ہم اسپتال میں داخل ہوئے، ڈاکٹر عثمان کے ایک اسسٹنٹ نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ ہمیں فوراً ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ تعارف کے بعد بولا۔ ''انوش صاحب کے بازو میں لگنے والی گولی نکال دی گئی ہے۔ دوسری گولی ان کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ وہاں بینڈیج وغیرہ کی جارہی ہے۔ قدرت نے ان کو بال بال بچایا ہے۔''

ہمیں کچھ اطمینان ہوا۔ وہ جو سراسیمگی سی کیفیت تھی، کم ہوگئی۔ میں نے اسسٹنٹ سے پوچھا۔ ''ہمارا دوسرا مریض تو ٹھیک ہے نا؟''

''آپ، اشفاق کی بات کررہے ہیں؟''

''ہاں، کافی چوٹ ہے اُس کے سر پر۔'' میں نے کہا۔
اسسٹنٹ نے ذرا حیرت سے کہا۔ ''ڈاکٹر عثمان نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اسسٹنٹ جس کا نام ڈاکٹر اسامہ تھا، بجھے لہجے میں بولا۔ ''بڑا شدید حملہ تھا...... اشفاق بچ نہیں سکا۔ موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ ہمیں کچھ کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔''

ہم دونوں ہکا بکا ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

ڈاکٹر اسامہ ہمیں لے کر ایک دوسرے کمرے میں آیا۔ یہ کمرا کسی آئی سی یو کی طرح تھا۔ یہاں نوجوان اشفاق کی خونچکاں لاش پڑی تھی۔ ماہین کے یوٹیوب چینل کا دیرینہ ساتھی، ایک ماہر وڈیو میکر، محنتی اور خوش باش اشفاق، ہمارے سامنے مردہ حالت میں پڑا تھا اور حالت بھی ایسی کہ دیکھ کر کلیجا منہ کو آنے لگا۔ نہ صرف پورا بستر خون سے داغ دار تھا بلکہ کمرے کی دیواروں پر بھی خون کے چھینٹے تھے۔ اس کے جسم پر بڑی وحشت سے تیز دھار آلے کے اَن گنت وار کیے گئے تھے۔

جواں سال ڈاکٹر اسامہ نے غم زدہ آواز میں کہا۔ ''سر! ابھی تک ہم نے یہاں موقع واردات پر کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کہ پولیس کی تفتیش میں رکاوٹ نہ پڑے۔ پلیز آپ بھی احتیاط کیجیے۔''

میں نے دیکھا انوش جٹ کی وہ گرم چادر جسے وہ دونوں کندھوں پر رکھتا تھا کرسی کے قریب ہی فرش پر پڑی تھی۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے۔ اندازہ یہی ہوا تھا کہ جس وقت جواں مرگ اشفاق پر حملہ ہوا، انوش تیمار دار کی حیثیت سے اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے اشفاق کو بچانے کی کوشش کی اور خود بھی زخمی ہوا۔

ڈاکٹر اسامہ نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حملہ کرنے والا پینٹ شرٹ میں تھا۔ اس نے ہُڈ والی جیکٹ پہن رکھی تھی جس کا رنگ براؤن تھا۔ ماسک بھی لگایا ہوا تھا۔ اچھے قد کاٹھ کا تھا۔ بارہ بج کر بیس منٹ پر اسپتال میں داخل ہوا اور سیدھا اس کمرے میں آ گیا۔ اس وقت اتفاق سے اٹینڈنٹ انوش صاحب واش روم میں پلیٹ دھو رہے تھے۔ حملہ آور نے نیم بے ہوش مریض پر پے در پے چاقو کے وار کیے۔ انوش صاحب نے واش روم سے نکل کر اشفاق کو بچانے کی کوشش کی مگر تب تک وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ انوش صاحب اور ایک گارڈ نے اس کا پیچھا کرنا چاہا، اس نے فائرنگ کر کے انوش صاحب کو بھی زخمی کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت کی طرف غائب ہو گیا۔''

''پھر کہاں گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بدقسمتی سے یہاں کئی عمارتوں کی چھتیں ساتھ ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ گارڈز نے ڈھونڈا لیکن اس کا کھوج نہیں مل سکا۔''

''کیا کسی نے اسے کسی دوسری چھت پر کودتے دیکھا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ابھی تک تو کسی نے ایسا بیان نہیں دیا۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ابھی اسی بلڈنگ میں کہیں موجود ہو؟'' شاہ زیب نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

شاہ زیب کی بات سن کر نوجوان ڈاکٹر کے چہرے پر خوف لہرا گیا۔ تب اس نے دائیں بائیں دیکھ کر نفی میں سر ہلایا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''ایسا تو کچھ نہیں لگتا...... ہم نے اوپر والی منزل پر تو ہر طرف دیکھ لیا ہے۔''

قریب ہی کھڑا ایک فربہ اندام کمپاؤنڈر بولا۔ ''مگر سر! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیچھے والے چھوٹے زینوں سے ہو کر پھر نیچے کہیں آ گیا ہو۔''

''احتیاطاً ہمیں ایک بار دیکھ لینا چاہیے۔'' میں نے

## آزاد اُمیدوار

ایک شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا۔ ''بتائیں وہ کون سی چیز ہے جو آسمان پر نہیں؟ وہ کون سی چیز ہے جو زمین پر نہیں؟ وہ کون سی چیز ہے جو زبان پر نہیں؟ اور وہ کون ہے جس کا کوئی ایمان نہیں؟'' دوست نے جواب دیا۔

''پہلی چیز جو آسمان پر نہیں ہے وہ قبر ہے۔ دوسری چیز جو زمین پر نہیں ہے وہ ہیں سورج، چاند، ستارے۔ تیسری چیز جو زبان میں نہیں وہ ہڈی ہے اور جس کا کوئی ایمان نہیں ہے وہ ہے آزاد امیدوار۔''

## پوری جیب خالی

شوہر: ''دیکھو تمہارے لاڈلے نے پھر میری جیب سے دس روپے چرا لیے ہیں۔''

بیوی: ''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو میں بھی تو لے سکتی ہوں؟''

شوہر: ''نہیں یہ تمہارا کام نہیں۔ تم اگر چراتیں تو پوری جیب خالی ہوتی۔''

کوئٹہ شہر سے شہر یار آفریدی کی فریاد

قمیص کے نیچے سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ شاہ زیب نے بھی اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے سائلنسر لگا پستول نکال لیا تھا۔ ہمارے سینے غم سے پھٹے جارہے تھے۔ ہمت نہیں ہورہی تھی کہ ہم اشفاق کا خونچکاں مردہ چہرہ دوبارہ دیکھ سکیں۔ اشفاق جو پچھلے کئی دنوں سے ہمارے ساتھ تھا۔ شب و روز ہمارے ساتھ بتا رہا تھا۔ پہلے وہ ایک سنگین الزام کی زد میں آیا پھر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

ہم دونوں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تو نوجوان ڈاکٹر اسامہ مزید سراسیمہ دکھائی دینے لگا۔ وہ ہکلا کر بولا۔ ''دیکھیں آپ ذرا تحمل رکھیں۔ عثمان صاحب کہہ رہے تھے کہ میرے آپریشن تھیٹر سے نکلنے تک کچھ نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے یہ پولیس کیس ہے اور......''

اس کا فقرہ ادھورا ہی رہا کیونکہ ہم باہر کوریڈور میں نکل آئے تھے۔ اسپتال کا مختصر سا عملہ مزید خوف زدہ نظر آنے لگا۔ آؤٹ ڈور کے مریض تو شاید پہلے ہی رفوچکر ہو چکے تھے۔ ہم نے تیزی سے دو تین کمروں کی تلاشی لی۔ چوتھا کمرا عقبی سیڑھیوں کے پاس ہی تھا۔ یہ چھوٹی سی لیبارٹری جیسا تھا۔ یہاں بھی کچھ نہیں ملا۔ ہم واپس پلٹ ہی رہے تھے کہ شاہ زیب پھر رک گیا۔ اس نے گھوم کر دوبارہ بڑے دھیان سے ایک گوشے میں دیکھا۔ اب مجھے بھی وہاں ایک بڑے کارٹن کے پیچھے براؤن رنگ کی جیکٹ کی جھلک نظر آئی۔

شاہ زیب نے اپنے سائلنسر لگے پستول کو سیدھا کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، کمرے میں بجلی سی چمک گئی۔ گہری براؤن جیکٹ اپنی جگہ سے حرکت میں آئی۔ کوئی اُڑتا ہوا سا شاہ زیب پر جا پڑا۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایک بدترین خدشہ بار بار میرے ذہن کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ وہ اب چشم زدن میں حقیقت کا روپ دھار گیا تھا۔ شاہ زیب پر خطرناک انداز میں جھپٹنے والا کوئی اور نہیں عمران تھا۔ میرے جگر عمران دانش کا جگر گوشہ عمران۔ جو میرے کندھے سے کندھا ملا کر بڑے عزم کے ساتھ ایک خطرناک مشن کے لیے نکلا تھا مگر ناقابلِ فہم حالات کی آندھی اسے کسی اور ہی سمت اُڑانے لگی تھی۔

عمران کی جھپٹ میں زبردست قسم کی ٹائمنگ اور توانائی تھی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ شاہ زیب جیسا ماہر فائٹر بھی اپنے پستول پر گرفت برقرار نہ رکھ سکا۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے پستول نکلتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی عمران کے سر کی وہ دھواں دار ضرب بھی دیکھی جو شاہ زیب کی پیشانی پر لگی تھی۔

شاہ زیب نے اس کی گردن اپنے بازو کے لپیٹے میں لینا چاہی مگر اس کے بدن میں تو جیسے بجلیاں کوند رہی تھیں، وہ گردن صاف بچا گیا پھر اس کا گھٹنا شاہ زیب کے پیٹ میں لگا، اس کے ساتھ ہی وہ چنگھاڑا۔ ''تھپڑ مارا تھا تم نے مجھے...... تھپڑ مارا تھا۔ پچھتاؤ گے تم......'' وہ شاہ زیب پر پل پڑا۔

پستول میرے ہاتھ میں تھا مگر ان لمحوں میں ایک بے کار شے لگ رہا تھا۔ عمران نے شاہ زیب پر مکوں کی بارش کر دی۔ شاہ زیب صرف اپنا دفاع کر رہا تھا۔ یقیناً میری طرح اس کا ذہن بھی عمران کو یہاں دیکھ کر ماؤف ہو رہا تھا۔ دل مان کر ہی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اشفاق کو اپنے رقیب کی حیثیت سے قتل کر چکا ہے، ایک قاتل بن چکا ہے۔

''عمران ہوش کرو۔'' میں گرجا اور اسے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی، وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میرے ہاتھوں سے نکلا۔ اب مجھے اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چاقو نظر آرہا تھا۔ یقیناً اسی چاقو نے اشفاق کی جان لی تھی۔

فربہ اندام کمپاؤنڈر اور ایک سیکیورٹی گارڈ نے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عقب سے عمران کو دبوچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ یکایک عمران نے عقبی زینوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ سیکیورٹی گارڈ نے اپنی رائفل عمران کی طرف سیدھی کی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی عمران کی پشت کو نشانہ بنا کر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ شاہ زیب نے لپک کر گارڈ کی رائفل کی نال نیچے جھکا دی۔ عمران کسی تند بگولے کی طرح بالائی منزل کی طرف اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اور شاہ زیب سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اس کے پیچھے گئے، وہ ایک بلڈنگ چھوڑ کر تیسری بلڈنگ کی چھت پر صرف ایک لمحے کے لیے نظر آیا۔ ہم وہاں پہنچے تو وہ چھتوں، برساتیوں اور منڈیروں کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔ شاہ زیب کے نچلے ہونٹ سے خون ٹپک رہا تھا۔ قرب و جوار عجب طرح کی سنسنی خیزی کی زد میں تھے۔

یہی وقت تھا جب کہیں دور سے پولیس موبائلز کے سائرن سنائی دینے لگے۔ ''ہمیں یہ جگہ چھوڑنا پڑے گی۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

ہم سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے۔ اسپتال میں افراتفری کا عالم تھا۔ جس موٹے کمپاؤنڈر نے عمران کو پیچھے سے دبوچا تھا، اس کے ہاتھ پر بھی چاقو کا زخم آیا تھا...... دھینگا مشتی میں وہ چاقو بھی لیبارٹری نما کمرے کے اندر گرا

گر گیا تھا جو اب اس پرائیویٹ اسپتال کے مالک، ڈاکٹر عثمان کے ہاتھ میں تھا۔ ڈاکٹر عثمان کے پہلو میں انوش دست بستہ کھڑا تھا۔ اس کے کندھے اور بازو پر تازہ تازہ بینڈیج کی گئی تھی۔

میں نے ڈاکٹر عثمان کے ہاتھ سے چاقو لے لیا کیونکہ اس کے دستے پر یقیناً عمران کے فنگر پرنٹس موجود تھے۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے انوش؟“ درمیانی عمر کے ڈاکٹر عثمان نے شکوہ کناں لہجے میں انوش سے پوچھا، پھر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر کی آنکھوں میں بس ایک ہی التجا تھی...... کسی اور خونریزی سے پہلے ہم تینوں اسپتال سے نکل جائیں۔

ہمارے اپنے لیے بھی اس سے بہتر اور کچھ نہیں تھا کہ پولیس کی آمد سے پہلے یہاں سے اوجھل ہو جائیں۔ اشفاق کی لاش کو اس طرح چھوڑ کر جانے سے دل پر بہت بوجھ آ رہا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم قریباً بھاگتے ہوئے فارچونر گاڑی تک آئے اور وہاں سے نکل گئے۔ ڈرائیونگ ایک بار پھر میں ہی کر رہا تھا۔ شاہ زیب پسنجر سیٹ پر تھا اور انوش اپنا بازو دبائے عقبی نشست پر تھا۔ وہ کراہتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”سر جی! یہ کیا ہو گیا عمران کو۔ لگتا ہے اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے، بالکل اندھا ہو گیا ہے۔ چاقو کے وار کرتا چلا گیا منڈے (اشفاق) پر۔ جب تک میں باتھ روم سے نکلا وہ اپنا کام کر چکا تھا۔“ انوش کی آواز بھرا گئی۔

”واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ میں نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

”اتنی نفرت، اتنی دشمنی؟“ انوش کی آواز میں تاسف آمیز حیرت تھی۔ ”ویسے تو مجھے اس بات کا یقین ہی نہیں کہ اشفاق وچارے نے ماتین کے ساتھ تعلق بنا لیا تھا۔ پر...... اگر کچھ ایسا تھا بھی اور ماتین کی مرضی سے تھا تو پھر...... اس کی سزا یہ تو نہیں تھی کہ اس [illegible] کو اتنی بے دردی سے چیر دیا جاتا۔“

انوش کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ اندر سے انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔

شاہ زیب نے کہا۔ ”انوش! ابھی کچھ نہ سوچو [illegible] وہ ہماری سوچ سے کہیں زیادہ [illegible] کچھ ہمارے سامنے [illegible] ہے [illegible]“

”شاہ زیب صاحب [illegible]“ [illegible] ہوش پڑا تھا [illegible] انوش [illegible]

کی ہماری آواز [illegible]

شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی [illegible] میں بولا۔ ”میں آپ [illegible] لیکن ابھی نہیں...... مجھے تھوڑا سا وقت دیں [illegible]“

میں نے گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے شاہ زیب کی طرف دیکھا۔ اس کے گم زدہ چہرے پر عجیب تاثرات نظر آئے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

میں نے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاہ زیب بہت ٹینس نظر آ رہا تھا۔ پورے جسم میں کرب کی لہر محسوس ہوتی تھی۔ میں نے نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ذہن میں عمران کا وہ فقرہ گونجنے لگا جو کل رات بڑے کرب کے عالم میں بولا تھا۔ سرخ آنکھوں کے ساتھ کہا تھا...... ”میں آپ کو کیا بتاؤں جی کہ میں نے ماتین اور اس حرامزادے کو کس حالت میں دیکھا......“

سوچ سوچ کر میرا سر پھٹنے لگا۔ اب ہم شہر کی اس عمارت سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں قیام کر رکھا تھا۔ جونہی ہم بڑی سڑک سے چھوٹی پر مڑے میری نگاہ عقب نما آئینے کی طرف اٹھی۔ میں نے دو آوارہ کتوں کو دیکھا جو قریباً ایک منٹ سے ہماری گاڑی کے پیچھے دوڑتے آ رہے تھے۔ اب وہ ہمارے پیچھے ہی پیچھے چھوٹی سڑک پر آ گئے تھے۔ چھوٹی سڑک پر کار کی رفتار تھوڑا کم ہوئی تھی اس لیے برق رفتاری سے دوڑتے کتوں کا فاصلہ ہماری گاڑی سے کم ہو رہا تھا۔ اب ایک اور کتا بھی ان کے عقب میں دکھائی دینے لگا تھا۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی...... البتہ کچھ آگے جا کر یہ معمولی نہیں رہی۔ ہماری فارچونر کے قریب پہنچ کر تینوں کتے بری طرح شور مچانے اور گاڑی پر جھپٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ جسیم کتے آوارہ تھے مگر ان کے چہروں پر عجیب سی وحشت نظر آ رہی تھی۔

میں نے اب بھی انہیں کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جلد ہی ہانپ کر پیچھے رہ جائیں گے مگر ایسا ہوا نہیں۔ یہاں تک کہ ہم کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ دور ہی سے ہارن کی آواز سن کر گیٹ کیپر مختار حسین نے گیٹ کھول دیا تھا۔ کتے ہمارے ساتھ ہی اندر گھس آئے۔ گارڈز نے انہیں ڈرا کر پیچھے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ اور مشتعل نظر آنے لگے اور یہی لمحے تھے جب میری نگاہ شاہ زیب کے چہرے پر پڑی۔ میں ششدر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید تلاطم تھا۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور آنکھوں

میں شعلے رقصاں تھے۔ اچانک ہی مجھے لگا کہ صورتِ حال معمول سے بہت ہٹ کر ہے۔ ڈرائیو وے پر کھڑا گارڈ بھی حیرت زدہ تھا۔ وہ ایک لاٹھی لہرا لہرا کر کتوں کو گاڑی سے پیچھے ہٹانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً شاہ زیب نے گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور ایک کتے پر اوپر تلے دو فائر کیے۔ سائیلنسر لگے پستول کا ایک فائر تو خالی گیا، دوسرا قدآور کتے کی گردن میں لگا۔ وہ کربناک آواز میں چلّا کر گھاس پر پلٹیاں کھانے لگا۔ میری توجہ صرف ایک لمحے کے لیے اس منظر کی طرف گئی تھی، دوسرا جسیم کتا کسی وزنی پتھر کی طرح گاڑی کی بائیں کھڑکی سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا مجھ پر آن گرا۔ اس کی حیوانی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ نکیلے دانت مجھ سے فقط ایک دو فٹ کے فاصلے پر تھے۔ وہ آوارہ کتے سے زیادہ ایک شکاری درندہ نظر آرہا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی بالوں بھری گردن دبوچ کر اس کا خونی جبڑا خود سے دور کیا۔ عقبی نشست سے انوش جٹ نے زخمی ہونے کے باوجود کتے کو پیچھے کھینچنے کی کوشش کی مگر کتے نے اتنی وحشت سے پنجے چلائے کہ انوش کی گردن سے کھال اُدھڑ گئی۔ میں اس دوران میں اپنا ہاتھ اس چاقو تک پہنچانے میں کامیاب رہا جو اسپتال میں عمران کے ہاتھ سے گرا تھا۔ جونہی چاقو کے دستے اور میرے ہاتھ کا ملاپ ہوا، میں نے پوری طاقت سے آٹھ نو انچ لمبا پھل کتے کے پیٹ میں گھونپ دیا پھر اس تیزی سے یوں اوپر کی طرف کھینچا کہ ہینڈ بریک کی جانب کتے کی آنتوں کا ڈھیر لگ گیا۔ گرم خون نے مجھے کہنی تک بھگو دیا تھا۔

تیسرا کتا بھی طوفانی رفتار سے مجھ پر آیا۔ اس نے اپنے دانتوں سے میری بائیں آستین اُدھیڑ کر رکھ دی۔ میں نے اسے اپنی ایک ٹانگ کے زور سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تب میں نے خون آلود چاقو پورے زور سے اس کتے کی پسلیوں میں گھونپ دیا۔ وہ بُری طرح تڑپا۔ چاقو اس کی کسی ہڈی میں دھنس گیا تھا۔ وہ جب پھڑکا تو چاقو کا خون آلود دستہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ یہ وحشی جانور میرا نرخرہ اُدھیڑ ڈالے گا۔ یہی وقت تھا جب خون کے چھینٹوں والی ونڈ اسکرین کی دوسری جانب مجھے قسطینا نظر آئی۔ وہ رائفل تھام کر دلیری سے کار کی طرف آرہی تھی۔ کتے نے ایک دم مجھے چھوڑا اور قسطینا کی طرف دیوانہ وار جست لگائی۔ قسطینا نے ایک طرف ہٹ کر خود کو بچایا۔ اس سے پہلے کہ کتا دوبارہ اس پر جھپٹتا، اس نے بڑا صاف نشانہ لگایا۔ کتے کی کھوپڑی سے اچھلنے والا خون دور تک گیا۔ وہ گھاس پر گر کر اینٹھنے لگا۔

''اندر چلو...... سب اندر چلو۔'' شاہ زیب، چوکیدار اور گارڈ وغیرہ کو مخاطب کرتے ہوئے چلّایا۔ پھر وہ ہم دونوں سے بولا۔ ''جتنی جلدی ہو سکے اندر چلیں...... ہم یہاں بالکل محفوظ نہیں۔ پلیز جلدی کریں۔''

اس کی آواز کا ارتعاش اور چہرے کے تاثرات ناقابلِ فہم تھے، بلکہ ابھی یہاں جو کچھ ہوا تھا، وہ سب بھی ناقابلِ فہم تھا۔ اس تہلکہ خیز ہنگامے کا شور سن کر زرافی، راشدہ اور پہلوان حشمت بھی باہر نکل آئے تھے۔ شاہ زیب کی کیفیت کچھ عجیب ہورہی تھی۔ وہ سب کو جیسے ہانکتا ہوا اندر لے گیا، پھر مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''تابش صاحب! ماہین کہاں ہے؟ اسے بھی لے آئیں، پلیز جلدی۔''

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں خود جاتا ہوں۔ شاید وہ آپ کے کہنے سے نہ آئے۔ آپ ان سب کو بیسمنٹ میں لے جائیں۔''

تب وہ قریباً بھاگتا ہوا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا ماہین والے کمرے کی طرف چلا گیا۔ سہ پہر کی زرد دھوپ میں اردگرد کا منظر خونچکاں تھا۔ میں نے سخت تذبذب میں ہونے کے باوجود شاہ زیب کے کہنے پر عمل کیا اور سب کو لے کر تہ خانے کی طرف بڑھا۔ اچانک مجھے بہروزا کا خیال آیا۔ میں نے پہلوان حشمت سے پوچھا تو وہ ہڑبڑائے انداز میں بولا۔ ''اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ سب جگہ ڈھونڈا ہے۔''

اسی اثنا میں فرسٹ فلور کا دروازہ زور زور سے بجایا جانے لگا۔ تب زوردار کڑاکے سے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ جھلّائے ہوئے شاہ زیب نے ماہین والے کمرے کا دروازہ توڑ دیا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے دیکھا کہ وہ ماہین کی کلائی پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا نیچے لا رہا تھا۔ ماہین کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بال چہرے پر منتشر تھے۔

ہم سب کے ساتھ سیڑھیاں اترے۔ یہ بیسمنٹ تین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمروں میں بغلی دروازے بھی تھے جن کے ذریعے ایک سے دوسرے کمرے میں جایا جاسکتا تھا۔ میں سب سے پہلے واش روم میں گھسا اور ہلاک ہونے والے کتے کا خون اپنے بازو سے دھویا۔ چاقو وہیں کتے کی پسلیوں میں پھنسا رہ گیا تھا۔ جب میں واش روم سے باہر نکلا شاہ زیب کے سوا سب ہکا بکا کھڑے تھے۔ شاہ زیب سرگوشیوں میں قسطینا اور پہلوان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ قسطینا

اور پہلوان کے چہرے بھی متغیر تھے۔

شاہ زیب نے ہیجانی انداز میں چیک کیا کہ سب دروازے بند ہیں۔ پہلوان نے شاہ زیب کی ہدایت پر دروازوں کی نچلی درزیں بھی مختلف کپڑوں سے بند کرنا شروع کردیں۔

میری سوالیہ نگاہیں مسلسل شاہ زیب پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی شاید ان نگاہوں کی شدت محسوس کررہا تھا۔ اس نے دوتین گہری سانسیں لیں، پھر اشارے کے ساتھ قسطینا کو چوکس رہنے کی ہدایت کی اور مجھے لے کر بغلی دروازے سے گزرا۔ ہم تہ خانے کے تیسرے کمرے میں پہنچے جو بالکل خالی تھا۔ شاہ زیب کے نچلے ہونٹ سے اب بھی ذرا ذرا خون رس رہا تھا۔ یہ خون اُس جھڑپ کا نتیجہ تھا جو اسپتال کے کمپاؤنڈ میں عمران اور شاہ زیب کے درمیان ہوئی تھی۔ شاہ زیب نے آئینے میں دیکھ کر رومال سے خون صاف کیا پھر مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گیا۔ وہ نہایت گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”تابش صاحب! میری طرح آپ بھی اُلجھن میں تھے نا کہ شانے مینشن میں گوھار زینت نے عالی جاہ سے اپنی موت کی سزا کیسے ملتوی یا معاف کرائی۔ اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے۔“

”نہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“

”تابش صاحب! میرا دل کہہ رہا ہے کہ بہت بڑا نقصان ہوگیا ہے، بہت ہی بڑا۔ اور یہ سب گوھار زینت کی وجہ سے ہوا ہے اور اس بدخصلت شاہ خانو کی وجہ سے جس کو میں دوست سمجھتا رہا۔ اس کی فطرت سے اس کے اندر کی سیاہی سے بے خبر رہا۔ وہ میرے ساتھ دوتین بار جاماجی بھی جاچکا تھا۔ جزیرے کے سارے حالات جانتا تھا۔ آپ...... آپ اس بدبخت کو گھر کا وہ بھیدی بھی کہہ سکتے ہیں جو لنکا ڈھاتا ہے اور اس نے یہی کیا ہے۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ گوھار اور شاہ خانو تمہارے کسی دشمن سے مل گئے ہیں؟“

شاہ زیب کا چہرہ چٹان کی طرح سخت نظر آنے لگا۔ آنکھوں میں شعلے فروزاں ہوگئے۔ ”دشمن نہیں تابش صاحب...... وہ ایک عفریت ہے...... اور وہ آزاد ہوگئی ہے، وہ بہت نقصان پہنچائے گی۔“

میں جب سے شاہ زیب سے ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ اعتماد اور چہرے پر حد درجہ سکون دیکھا تھا مگر آج یہ اعتماد و سکون درہم برہم تھا۔

اس نے پھر گہری سانس لی۔ ”خدا کرے وہ نہ ہو جو ہم سوچ رہے ہیں لیکن...... لیکن ننانوے فیصد امکان یہی ہے۔“

تب ہی اچانک اسے ایک نیا خیال آیا۔ وہ میرے شانے تھام کر بولا۔ ”تابش صاحب! میرا دل کہہ رہا ہے، عمران بھی وہ نہیں جو ہمیں نظر آرہا ہے۔ آپ سمجھیں...... وہ ایک جادو کے اثر میں ہے۔ ایک سحر ہے جس نے اسے جکڑا ہوا ہے۔“

میں حیرت سے اُس کا چہرہ تکنے لگا۔ یقین نہیں آیا کہ شاہ زیب جیسے پڑھے لکھے ہوش مند شخص کے منہ سے میں اس طرح کی ناقابلِ فہم بات سنوں گا۔

”شاہ زیب! تم مسلسل پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ یقین کرو میرا دماغ چکرانے لگا ہے۔ تم...... یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ عمران وہ نہیں جو نظر آرہا ہے اور پھر یہ آوارہ کُتے؟...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......“

اس نے اسکرین کی طرف دیکھا جہاں کوٹھی کے سی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ نظر آرہی تھی۔ تب میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ ”تابش صاحب! آپ ہپناٹزم یا مسمریزم کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

”یہی کہ اس کا تعلق انسانی ذہن سے ہے۔ کچھ لوگ اپنی اس ذہنی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے دوسرے ذہنوں پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔“

”آپ اسے جادو ٹونا کہیں گے یا سائنسی علم؟“

”ظاہر ہے سائنسی علم۔“

”بے شک...... تابش صاحب یہ ایک سائنسی علم ہے مگر اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس علم اور اس کے عمل میں غیر معمولی صلاحیت حاصل کی ہے اور اسے ایک شیطانی عمل بنا دیا ہے۔ میں نے جس عفریت کا ذکر کیا ہے، وہ بھی ایک ایسی ہی عورت ہے...... اور ہماری، میرا مطلب ہے کہ میری اور قسطینا کی یہ بدقسمتی ہے کہ وہ عورت پھر یہاں آپہنچی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کو یہاں پہنچانے کا سیاہ کارنامہ اسی شاہ خانو اور گوھار زینت نے انجام دیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے اور پہلوان حشمت نے اپنی گفتگو میں کسی ایسی عورت کا ذکر تو کیا تھا جو جزیرے میں کسی شیطانی بگولے کی طرح چکراتی تھی مگر پھر شاید ماری گئی تھی۔“

”جی ہاں۔“ شاہ زیب نے عجیب لہجے میں کہا۔ ”وہ ماری گئی تھی پھر بھی ماری نہیں گئی تھی۔ ہم کافی عرصہ اس بھول میں رہے کہ وہ ماری گئی ہے۔ پھر ایک گاؤں میں اس عورت کے ساتھ سخت ٹاکرا ہوا تھا۔ میں نے بہت قریب سے اس کے سر میں دو گولیاں ماری تھیں۔ ایک گولی تو ہڈی کو نقصان

پہنچا کر نکل گئی۔ دوسری [illegible] ماں [illegible] ہے۔ شدید زخمی ہو جانے [illegible] اس نے اپنی بے پناہ اندرونی توانائیوں کی [illegible] پارا پارا جسم اور اپنی روح کا منحوس رشتہ برقرار رکھا تھا۔ وہ ایک بنجر زدہ کھیت میں گوبر سے لتھڑی ہوئی، ایک مردار کی طرح پڑی تھی۔ جب رات کے اندھیرے میں پولیس والے اسے اٹھا کر لے گئے۔ بظاہر وہ اسے پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کے جسم پر نہایت ناتی [illegible] بھی تھے جن میں سے زیادہ تر پولیس والوں نے اتار لیے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ بظاہر اس مردہ عورت کی سانس ابھی باقی ہے پھر انہی پولیس والوں کی ملی بھگت سے ہاناوانی کے کچھ خاص بندے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ جی ہاں، ہاناوانی نام تھا اُس کا۔"

شاہ زیب نے اپنے موبائل فون پر اس عورت کی ایک پرانی تصویر بھی مجھے دکھائی جو بقول شاہ زیب ہپناسز کی جداقسم کی صلاحیتیں رکھتی تھی۔ اس کی عمر کا درست اندازہ لگانا مشکل تھا، البتہ وہ خاصی پختہ عمر کی تھی۔ چہرے پر خاص طرح کی خشونت اور آنکھوں پر سیاہ شیشوں والی عینک، گلے میں قیمتی ہار تھا۔

"پولیس کے ہاتھوں سے نکل کر یہ کہاں گئی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کئی ماہ تک پاکستان کے ہی شمالی علاقے میں چھپی رہی۔ اپنے لاغر جسم اور روح کا منحوس رشتہ مضبوط کرتی رہی۔ جب تک یہ رشتہ مضبوط نہ ہوتا وہ HYPNOSIS کی غیر معمولی صلاحیت سے دوبارہ کام نہیں لے سکتی تھی...... پھر وہ جزیرے پر پہنچ گئی۔"

بات کرتے کرتے ایکا ایکی شاہ زیب کی آنکھوں میں غم کی لہر اُبھری۔ چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "آپ کو اپنے معصوم بچے کی موت کا بتایا تھا نا...... وہ جانکاہ حادثہ کہنے کو تو حادثہ تھا مگر اسی خون آشام [illegible] کی وجہ سے ہوا۔ بہرحال اس معصوم کی قربانی نے اور قسطینا کو [illegible] پورے جاماجی کو بڑی آفات سے بچا لیا۔ ہم نے شروع میں ہی ہاناوانی کو دبوچ لیا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے اور [illegible] ایسا نہیں کہ میں آپ کو سنا سکوں۔ مختصر یہ کہ ہاناوانی نے جزیرے میں شاہی خاندان کے [illegible] لیا تھا، وہ اس [illegible] ہاناوانی کو [illegible] سزائے موت [illegible] جزیرے جاماجی [illegible] کے مطابق اس کی سزائے [illegible] کیا گیا۔ اس

کی شیطانیت سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رہنے کے پیش نظر اس کو آنکھوں سے محروم کر دیا گیا۔ میری بات سمجھ گئے ہوں گے آپ؟"

"یعنی اس عورت کو ہپناسز کی صلاحیت سے محروم کیا گیا۔"

"جی ہاں پچھلے قریباً دو سال سے وہ جزیرے کے ایک محفوظ بندی خانے میں تھی۔ وہ اندھی ہو چکی تھی مگر عملیات کے کچھ ماہرین کا کہنا تھا کہ وہ اب بھی کسی نہ کسی طور اپنی اس صلاحیت کو زندہ رکھ سکتی ہے جو ذہن تسخیر کر لیتی ہے۔"

شاہ زیب نے ایک آہ سی بھری۔ سوچ میں ڈوب کر سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ "پچھلے تین روز سے یہاں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں، ان سے مجھے اور قسطینا کو یقین ہو گیا ہے کہ وہ بدبخت آزاد ہو چکی ہے بلکہ یہاں ہمارے آس پاس پہنچ چکی ہے۔"

اس نے لمحاتی توقف کے بعد میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں جو کچھ ہوا ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ سب نارمل ہے؟ آپ نے ان کتوں کو دیکھا۔ ان کا پیچھا کرنے کا انداز، ہم پر حملہ کرنے کا انداز، کیا وہ سب نارمل تھا؟ نہیں تھا نا...... اور پھر...... عمران کو کیوں بھول رہے ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میری ریڑھ میں سرد لہر دوڑ گئی۔

"اگر میں غلط نہیں کہہ رہا...... اور میرا خیال ہے کہ میں غلط نہیں کہہ رہا۔ عمران جو کچھ کر رہا ہے، اپنے ہوش و حواس میں نہیں کر رہا۔ یہ کہتے ہوئے میرا دل لرز رہا ہے کہ وہ کسی طور اس عورت کا نشانہ بن چکا ہے۔ ہپناسز کا شکار ہو گیا ہے۔ ہم اسے ہپناسز نہیں، سیاہ ہپناسز کہتے ہیں...... مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جب ہم رانی جان کی طرف جانے کے لیے یہاں سے باہر نکلے تھے، غالباً عمران بھی کہیں نکلا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس چار دیواری سے باہر ہوا ہے لیکن فی الحال ہم ان باتوں کی کھوج میں نہیں پڑ سکتے۔"

ایک دم جیسے کوئی نئی بات شاہ زیب کے ذہن میں آئی۔ اپنے ورم زدہ ہونٹ کو ہولے سے دباتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ کھول کر ماہین کو بلایا۔ جب وہ نہیں آئی تو اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے آیا۔ ماہین کی آنکھیں اب بھی اشک بار تھیں۔ شاہ زیب نے نرم آواز میں کہا۔ "ماہین! تم دیکھ رہی ہو یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، کس قدر غیر معمولی ہے۔ اس غیر معمولی صورتحال میں ہمیں بھی معمول سے ہٹ کر سوچنا ہے۔ تم یوں سمجھو کہ ہم اس وقت ایک ایسے دشمن کے نشانے پر ہیں جو

عام دشمنوں سے بالکل مختلف ہے۔ اگر ہم کسی عام بندے کو بتائیں کہ یہاں کچھ دیر پہلے کوٹھی میں کیا واقعہ ہوا ہے تو وہ سمجھے گا، ہم مذاق کر رہے ہیں یا ''پرینک'' وغیرہ۔''

وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے شاہ زیب کی طرف دیکھنے لگی۔ شاہ زیب نے بڑے سنجیدہ لہجے میں ماہین سے پیراسائیکالوجی اور ہپناسز وغیرہ کے بارے میں کچھ باتیں کیں اور پوچھا کہ کیا وہ ان چیزوں کو مانتی ہے؟ ماہین خاموش رہی مگر اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا جواب نفی میں نہیں ہے۔

وہ بولا۔ ''ماہین! میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری اور قسطینا وغیرہ کی لڑائی تھی جو تم سب تک آ پہنچی ہے۔ ہپناسز کی ماہر ایک نہایت خطرناک اور عیار عورت ایک عرصے سے ہمارے ساتھ دشمنی نبھا رہی ہے۔ وہ اس سردارزادے شاہ خانو اور گوھار کی مہربانی سے ہمارے لیے یہاں آ پہنچی ہے۔ خدا کرے...... خدا کرے میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو جائے مگر مجھے لگتا ہے کہ عمران اس کے سحر اثر میں آ چکا ہے۔''

ماہین نے غیر یقینی نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ یوں لگا کہ شاہ زیب کی کہی باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی ہیں۔ تب اس نے ایک سسکی سی لی اور الجھن زدہ لہجے میں گویا ہوئی۔ ''میں آپ دونوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں لیکن اس وقت کچھ بھی میرے بس میں نہیں۔ میں اپنا دم گھٹتا محسوس کر رہی ہوں۔ میں جلد از جلد یہاں سے واپس لاہور جانا چاہتی ہوں۔''

دفعتاً مجھے بھی غصہ آ گیا۔ ''ماہین یہ رونا دھونا بند کرو۔ تم اس طرح ہمیں بھول بھلیوں میں ڈال کر یہاں سے نہیں جا سکتی ہو۔ تمہیں کھل کر بتانا ہوگا، کل رات ہمارے جانے کے بعد یہاں کیا ہوا تھا؟ جو کچھ عمران تمہارے بارے میں کہہ رہا ہے، اسے ماننے کو میرا دل ہرگز تیار نہیں لیکن جب تم خود کہہ رہی ہو کہ وہ سب ٹھیک ہے تو پھر مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ یہ تو پھر تمہارے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی ڈوب مرنے کا مقام ہے۔''

وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

''بند کرو یہ آنسو بہانا۔'' میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔

شاہ زیب نے مجھے تحمل سے رہنے کا اشارہ کیا۔ ماہین کو پینے کے لیے پانی دیا۔ پھر وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ماہین! میں اور تابش صاحب دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ عمران نے تمہارے بارے میں جو کچھ کہا، اس نے تمہیں سخت دکھ پہنچایا۔ اس شدید دکھ کے ردعمل میں تم کہہ رہی ہو کہ وہ جو کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔''

''وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا ماہین۔'' میں نے ڈانٹنے والے لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ کسی طرح کا نشہ کرتا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ وہ بہت زیادہ نشے میں تھا۔ وہ نشہ نہیں تھا مگر سمجھو کہ کوئی اسی طرح کی کیفیت تھی۔''

وہ ایک دم ہچکیاں لیتے ہوئے میرے کندھے سے لگ گئی اور اپنے گرم آنسو میری قمیص میں جذب کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کا دل ذرا ہلکا ہوا تو میں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر خود سے جدا کیا۔ وہ کسی بچی کی طرح سسک رہی تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

وہ اب بھی کچھ بول نہیں رہی تھی مگر اس کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ عمران نے اس پر جو الزامات لگائے ہیں، وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور ان الزامات کو قبول کرنا درحقیقت اس کے شدید دکھ کا اظہار ہی تھا۔

میں نے اس بارے میں زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ماہی! جب کل رات ڈنر کے بعد ہم ڈوگرے کے ساتھ اس کی ساس رانی جان کی کوٹھی کی طرف چلے گئے تو عمران کہاں تھا؟ کیا وہ کوٹھی سے کہیں نکلا تھا؟''

ماہین نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلایا۔ رو دھو کر وہ شبنم سے نکھرے پھول کی طرح نظر آتی تھی۔ وہ اپنی بہن شاہین کی طرح دل موہ لینے والے نقوش رکھتی تھی۔

''کہاں گیا تھا وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، قریبی مارکیٹ کی طرف۔''

''کیا لینے؟''

وہ تذبذب میں نظر آئی۔ ایک لمبے توقف کے بعد اس نے ہچکچاتے لہجے میں جو کچھ بتایا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا، اس کا لب لباب یہ تھا۔

کئی دن سے عمران اور ماہین میں ناراضگی چلی آ رہی تھی، قریب ہو کر ماہین، عمران سے بہت دور تھی۔ جیسے ندی کے دو کنارے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں۔ کوشش کر کے ماہین نے عمران کو منایا تھا۔ اس نے عمران کو ایک ٹائم فریم دیا تھا، کہا تھا کہ وہ چھ ماہ کے اندر اندر اپنے چچا ثاقب کو اس شادی پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ وہ ان کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دے گی، اپنی جان کا واسطہ دے گی۔ چچا

ثاقب نے ہی ماہین کو پالا تھا۔ وہ جہاں بہت سخت گیر تھے وہاں اس سے غیر معمولی محبت بھی کرتے تھے۔ ماہین کی اسی کمٹ منٹ کے بعد ماہین اور عمران میں صلح ہوئی تھی۔ اسی صلح کو سلیبریٹ کرنے کے لیے عمران کوٹھی سے نکلا تھا۔ ماہین کا خیال تھا کہ وہ اس کی پسندیدہ چاکلیٹ اور اسنیکس وغیرہ لینے گیا ہے۔ اس کے آنے میں بہت تاخیر ہوئی تھی۔ ماہین نے پریشان ہو کر اسے فون بھی کیے مگر جواب نہیں آیا۔ کافی تاخیر سے جب وہ واپس آیا تو ماہین اپنے وڈیو میکر اشفاق کے ساتھ بالائی منزل کے وسطی کمرے میں تھی۔ دونوں اپنے یوٹیوب چینل کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ ان سے بات کیے بغیر خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ بعدازاں کچھ ہی دیر بعد وہ ماہین کے کمرے میں پہنچا تھا۔ وہ ہیجانی کیفیت میں تھا۔ اس نے وہ الفاظ کہے تھے جو پگھلے سیسے کی طرح ماہین کے کانوں میں اترے تھے اور وہ سکتے کی حالت میں اسے دیکھتی چلی گئی تھی۔

ماہین کی بات ختم ہوئی تو شاہ زیب نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ماہین! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، تمہارے لیے اس پر یقین کرنا فی الحال مشکل ہوگا۔ شاید تابش بھی اس پر پچاس فیصد ہی یقین کر پائے ہوں گے۔ عمران ایک سخت ٹرانس میں ہے۔ اس نے جو کچھ کہا، تم سمجھو وہ کسی اور نے کہا۔ اس نے نہیں کہا۔ جو تمہیں دل و جان سے چاہتا ہے۔ فی الوقت وہ ہماری نفرت کا نہیں بے حد توجہ اور ہمدردی کا مستحق ہے۔ تم دعا کرو، سب ٹھیک ہوگا۔''

ماہین اب بھی خالی خالی نظروں سے کبھی میری طرف کبھی شاہ زیب کی طرف دیکھتی تھی۔ اتنی جلدی ان باتوں پر یقین کرنا اس کے بس میں نہیں تھا، شاید کسی کے بس میں بھی نہ ہوتا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر سر پر بوسہ دیا اور اسے دوسرے کمرے میں باقی ساتھیوں کے پاس پہنچا دیا۔ میں واپس مڑنے لگا تو وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ ''انکل تابش! اشفاق کا اب کیا حال ہے؟''

مجھے شاک سا لگا۔ اس ڈرامائی دورانیے میں اشفاق کی موت تو ذہن میں دھندلا گئی تھی۔ فی الحال ماہین کو اس بارے میں بتانا بھی مناسب نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''وہ اسپتال میں ہے۔ تم اس کے لیے بھی دعا کرو۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے ایک گوشے میں بیٹھے انوش کو بھی اشارہ کر دیا کہ وہ اس حوالے سے ابھی چپ ہی رہے۔

واپس شاہ زیب کے پاس پہنچ کر میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ اس کے کان تہ خانے سے باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ ''شاہ زیب! گارڈ مختار حسین اور چوکیدار دونوں باہر ہیں۔ کیا ان دونوں کو کسی طرح کا خطرہ لاحق نہیں؟''

''میرا خیال ہے نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ اصل خطرہ آپ سب کو بھی نہیں، صرف مجھے اور قسطینا کو ہے اور غالباً چاچا حشمت کو بھی۔''

''تم تینوں کو کیوں؟''

''میری باتیں آپ کو عجیب لگیں گی مگر وہی کہہ رہا ہوں جس کا تجربہ مجھے اور قسطینا کو بہت عرصے سے ہے اور پورے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے ہے۔ ہم نے جب جاماجی میں اس خطرناک فاحشہ کی آنکھیں ضائع کر دی تھیں تو نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ وہ اب اپنے سیاہ عمل کو استعمال نہیں کر سکے گی، دس فیصد خدشہ موجود تھا۔ اب پتا چل رہا ہے کہ یہی دس فیصد خدشہ حقیقت تھا۔ ہاناوانی اندھی ہونے کے باوجود اپنے عملیات اور SUGGESTIONS کو بحال رکھنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ یقیناً آپ کو میری کئی باتیں حیران کریں گی مگر فی الحال آپ سنتے رہیں۔ یہ عورت ہپناٹزم کی اس اسٹیج پر ہے کہ انسانوں کے علاوہ حیوانات کو بھی مسمرائز کر سکتی ہے۔ وہ ان کو ایسی سجیشنز دینے کے قابل ہے کہ بظاہر بے ضرر نظر آنے والے چرند پرند بھی کسی خاص شخص کے لیے نہایت مہلک ثابت ہو جاتے ہیں۔ ہم نے پرندوں کے بڑے بڑے غولوں کو انسانوں کی آنکھیں نکالتے اور بوٹیاں نوچتے دیکھا ہے۔ ایسے جنونی پرندے اور جانور انسانی جسم کی بُو پر حملہ آور ہوتے ہیں اور جسم یا لباس کی بُو ہی ہوتی ہے جو یہ ہاناوانی اپنی سجیشن میں ان جانوروں کو مہیا کرتی ہے۔''

یہ سب کچھ میرے لیے واقعی ناقابلِ فہم تھا۔ البتہ شاہ زیب جیسے نہایت سنجیدہ اور باخبر شخص کو فوری جھٹلانا بھی میرے لیے ناممکن تھا۔

میں نے موضوع کو تھوڑا بدلتے ہوئے اسے پھر یاد دلایا۔ ''شاہ زیب، تم ہم سب کو اس بیسمنٹ میں لے آئے ہو مگر چوکیدار مختار اور گارڈ دونوں ابھی باہر ہیں۔ ان پر کوئی مصیبت آسکتی ہے۔''

''میرے خیال میں نہیں...... اور میں پھر کہوں گا اصل خطرہ غالباً آپ سب کو بھی نہیں، مجھے، قسطینا اور چاچا حشمت کو ہے۔ ہمارے ہی جسم اور لباس کی بُو کے پیچھے ان جانوروں کو لگایا گیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا جب آپ

کے چاقو کا دستہ کُتے کی پسلیوں میں اٹک گیا تھا اور آپ تقریباً نہتے تھے، کُتے کو تسلط دکھائی دے گئی تھی، وہ آپ کو بالکل نظرانداز کر کے اس کی طرف لپک گیا تھا۔ اگر کوئی اور کتا یا جانور یہاں آ بھی جاتا ہے تو وہ چوکیدار اور گارڈ کو نظرانداز کر دے گا۔“

اسی اثنا میں انوش جٹ اپنا زخمی بازو گلے میں لٹکائے اور گردن پر میڈیکل ٹیپ وغیرہ چپکائے دروازے پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ موجود صورت حال کے سبب دوسروں کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی تعجب کے گہرے سائے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”سرجی! اوپر سے چوکیدار نے کال کی ہے۔ کہہ رہا ہے کہ تینوں کُتوں کی لاشیں ایک گیراج میں رکھ دی ہیں، فرش وغیرہ دھو دیا ہے، اب کیا کرنا ہے؟“

میرے بجائے شاہ زیب نے جواب دیا۔ ”انہیں کہو ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ خود چھت والے کمرے میں چلے جائیں، دروازہ بند کر لیں اور اردگرد نگاہ رکھیں۔ اگر کوئی تبدیلی آئے تو فوراً اطلاع دیں۔“

انوش اثبات میں سر ہلا کر واپس چلا گیا۔ شاہ زیب نے مجھ سے اجازت لے کر سگریٹ سلگایا اور پُرسوچ انداز میں بولا۔ ”تابش صاحب! میں آپ کو اس لڑائی میں گھسیٹنا نہیں چاہتا۔“

”افسوس کی بات ہے شاہ زیب! تم اس لڑائی کو باقی کی صورت حال سے علیحدہ کیوں کر رہے ہو۔ اگر واقعی وہ ہاناوانی نام کی بدنام عورت یہاں پہنچی ہے تو پھر کیوں پہنچی ہے؟ اس لیے کہ ہم نے ایل سی آرگنائزیشن کے درندہ صفت لوگوں سے ٹکر لی ہے۔ جو ہمارے بے گناہ لوگوں کو مار رہے ہیں۔ ہمارے پسماندہ علاقوں کو منصوبہ بندی کے تحت جہالت کے اندھیروں میں دھکیل رہے ہیں۔ یہاں سازشوں کے بیج بو رہے ہیں۔ ہم نے ان کی ایجنٹ گوہار زینت کو سردار حویلی میں سے کھدیڑ کر باہر نکالا تھا۔ تم اس کی عداوت کو موجود سچویشن سے جدا کیسے کر سکتے ہو، یہ ہم سب کی لڑائی ہے، اکٹھے جئیں گے اکٹھے مریں گے۔“

میرے فیصلہ کن لہجے نے شاہ زیب کو خاموش کرا دیا۔ تاہم مجھے محسوس ہوا کہ اس نے دل سے میری بات نہیں مانی۔ اب پانچ بجنے والے تھے۔ سردیوں کی شام تیزی سے پر پھیلا رہی تھی۔ عمران کی موجودہ حالتِ زار کا خیال بار بار میرے دل پر کچوکے لگاتا تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ اسپتال میں اس کے ہاتھوں باقاعدہ ایک قتل ہو چکا تھا اور قتل بھی اس بے گناہ کا جو ہمارا ہم سفر و ہمدم تھا۔ ماتین اسے بھائی کی حیثیت دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرے تصور میں گوندو شیر کے بازو کے ٹکڑے کی پیش گوئی اودھم مچانے لگی۔ زرعی فارم میں اس نے ہم سب کے لیے خطرات کا خدشہ ظاہر کیا تھا لیکن خاص طور سے عمران کے سلسلے میں تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو بمشکل ان خیالات کے شکنجے سے نکالا۔ ہمارے سامنے جو درمیانے سائز کی سرویلنس اسکرین لگی تھی اس پر ان دو سی سی ٹی وی کیمروں کا رزلٹ آ رہا تھا جو کوٹھی کے پورچ اور لان کا کچھ حصہ دکھا رہے تھے۔ اس اسکرین کو دیکھتے ہوئے یکایک شاہ زیب چونکا۔ میں نے بھی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ صرف ایک گھریلو بلی جو سیاہ رنگ کی تھی تیزی کے ساتھ پورچ میں سے گزر گئی۔

اسی دوران میں انوش ایک بار پھر دروازے پر نمودار ہوا۔ زخموں کی وجہ سے اس کا رنگ معمول سے ہٹ کر زرد نظر آتا تھا۔ پریشان لہجے میں بولا۔ ”سرجی! باہر سے چوکیدار کی کال ہے، سن لیں۔“

میں نے فون سنا۔ مختار نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔ ”سرکار! کوٹھی میں تین بلیاں گھوم رہی ہیں۔ بلکہ ان میں سے دو تو کالے رنگ کے بلّے ہیں۔ کافی پلے ہوئے ہیں۔ یہ عجیب عجیب سی آوازیں نکال رہے ہیں۔ ان کے بال کھڑے ہیں۔ ایسے لگتا ہے آپس میں لڑ پڑیں گے یا پھر ہم میں سے کسی پر جھپٹ پڑیں گے پھر ذرا رک کر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”سرجی! ہو نہ ہو، مجھے تو یہ کوئی کالا علم لگ رہا ہے۔ پپ...... پہلے تو یہاں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ہماری اپنی دو بلیاں ہیں۔ وہ سہم کر ایک طرف بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہ پتا نہیں کہاں سے آ گئی ہیں۔“

میں نے موبائل فون کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ شاہ زیب اور انوش بھی اس کی بات سن رہے تھے۔ اسی اثنا میں، چوکیدار مختار اور گارڈ غوری دونوں ہی پورچ میں نظر آئے۔ اس کے ساتھ سیاہ رنگ کا بلّا دکھائی دیا۔ یہ عام گھریلو بلیوں سے زیادہ صحت مند تھا۔ اس کے طور اطوار بھی ٹھیک نہیں تھے۔ وہ اپنے دانت نکوس رہا تھا اور اس کی مدھم غصیلی آواز بھی ”آڈیو، وڈیو“ کیمروں کے ذریعے ہم تک پہنچ رہی تھی۔ موبائل فون بدستور چوکیدار مختار کے کان سے لگا ہوا تھا پھر دوسرا سیاہ بلّا اور براؤن بلی بھی کیمرے کے فریم میں نظر آنے لگے۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ

نارمل حالت میں نہیں ہیں۔

شاہ زیب نے فون میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ چوکیدار مختار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم لوگوں نے کوئی حرکت نہیں کرنی۔ پُرسکون رہو۔ جب تک تم کچھ کہو گے نہیں، یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

چوکیدار اور گارڈ خوف زدہ انداز میں گیراج کی دیوار سے جا لگے تھے۔ گارڈ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس نے انگلی غالباً ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی۔ شاہ زیب پھر بولا۔ ''گارڈ سے کہو رائفل کا بیرل نیچے کر لے۔ دونوں حرکت کیے بغیر کھڑے رہو۔ یہ تم پر حملہ نہیں کریں گے۔'' ایک بلا بار بار اس طرف بھی دیکھ رہا تھا جہاں تہ خانے کا دروازہ تھا۔ پھر وہ کیمرے کی رینج سے نکل کر تہ خانے کی جانب آیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہمیں سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ جانور کی حسِ شامہ اسے یقیناً تہ خانے کی طرف کشش کر رہی تھی۔

اسی دوران میں اوپر پورچ میں گارڈ غوری سے ایک غلطی ہو گئی۔ شاہ زیب نے کہا تھا کہ وہ اپنی رائفل کا بیرل نیچے کر لے مگر اس سے پہلے کہ چوکیدار مختار، شاہ زیب کی یہ ہدایت گارڈ غوری تک پہنچاتا، اس نے گھبراہٹ اور جھنجلاہٹ میں رائفل کا لمبا بیرل کسی لاٹھی کی طرح سیاہ بلے کے منہ پر مارا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنا تیز رفتار اور ناقابلِ مزاحمت تھا کہ ہم دیکھتے رہ گئے۔ سیاہ بلا کسی تیندوے کی طرح اچھل کر گارڈ غوری کے چہرے کی طرف آیا۔ اس کے پہلے حملے نے ہی یقیناً غوری کی ایک آنکھ ضائع کر ڈالی۔ غوری الٹ کر گاڑی کی سائڈ سے ٹکرایا اور پھر فرش پر گرا۔ ہمارے تہ خانے کی طرف آنے والا بلا بھی لپکتا ہوا پورچ میں پہنچا اور کیمرے کے منظر میں نظر آنے لگا۔ تینوں جانور جنگلی درندوں کے سے انداز میں غوری سے چمٹ گئے۔ غوری صرف ایک ہی فائر کر پایا جو براؤن بلی کو لگا پھر اس کی رائفل لڑھک کر دور جا گری تھی۔ غوری کی کربناک آوازیں پورچ میں گونج رہی تھیں۔ شاہ زیب اور میں اپنے پستول نکالتے ہوئے تیزی سے تہ خانے کے دروازے کی طرف گئے اور اسے کھولتے ہوئے باہر نکل آئے۔ پورچ ہم سے کافی دور تھا مگر پہلی نظر میں ہی ہمیں پتا چل گیا کہ غوری کا قصہ تمام ہو چکا ہے۔ ایک بلے کا پورا سر غوری کے چاک شدہ پیٹ میں گھسا ہوا تھا۔ اب ایک اور سفید بلا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ چوکیدار بھاگتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کا رنگ بالکل ہلدی تھا۔ اس سے پہلے کہ جنونی بلے پوری طرح ہماری طرف متوجہ ہوتے، ہم چوکیدار کو لے کر زینے پھلانگتے ہوئے نیچے آئے اور تہ خانے میں گھس کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی جیسے کچھ بھاری پتھر دروازے سے آ ٹکرائے تھے۔ یہ وہ تینوں بلے ہی تھے جو گولی کی رفتار سے ہمارے پیچھے آئے تھے۔ وہ جنگلی جانور نہیں تھے مگر اس وقت جنگلی جانوروں سے بڑھ کر خونخوار لگ رہے تھے۔ کسی شیطان صفت کی غیر معمولی ہپناٹزم صلاحیت نے انہیں نارمل نہیں رہنے دیا تھا۔

یہ ایب نارمل جانور اپنے پنجے دروازے کی نچلی درز سے اندر گھسانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ بار بار اپنے سر دروازے سے ٹکرا رہے تھے۔ یہ منظر اتنا سنسنی خیز تھا کہ زانی اور راشدہ نے باقاعدہ چلّانا شروع کر دیا۔ ماہین بھی سہمی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

میں نے انہیں ڈانٹا۔ ''پے نک مت کرو۔ لکڑی کا یہ سالڈ دروازہ مضبوط ہے۔ یہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

احتیاط کے طور پر شاہ زیب اور پہلوان حشمت نے ایک بڑی ڈائننگ ٹیبل گھسیٹ کر دروازے کے ساتھ لگا دی۔

لڑکیوں کو کچھ تسلی ہوئی تو ہم اس کمرے میں آ گئے جہاں اسکرین موجود تھی۔ ماہین اسکرین پر باہر کا منظر دیکھنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے منع کر دیا اور یہ منظر واقعی دیکھنے کے قابل نہیں تھا۔ ہنڈا کار کی ایک سائڈ پر خون ہی خون تھا۔ یہ بدقسمت غوری کا خون تھا۔ اس کے قریب ہی گاڑی کے پچھلے ٹائر کے پاس براؤن بلی کی لاش بھی پڑی تھی۔ شاہ زیب بے چینی سے کمرے کے مختصر خلا میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد رک کر بولا۔ ''تابش صاحب مجھے قسطینا اور چاچا حشمت کو یہاں سے نکلنا ہوگا۔ کسی مناسب طریقے سے یہ جگہ چھوڑ کر یہاں سے محفوظ دوری پر جانا ہوگا۔ وہ عورت یہیں کہیں آس پاس موجود ہے، بیس تیس کلومیٹر کے دائرے میں ہے۔''

''دیکھو شاہ زیب! اب تم مجھے تکلیف دے رہے ہو۔ ایک بار پھر قسطینا، پہلوان حشمت اور اپنی بات کر رہے ہو۔ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ جو بھی مصیبت آئی ہے، چھوٹی ہے یا بڑی ہے، اس کا مقابلہ ہم اکٹھے کریں گے۔''

وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ تہ خانے کے دروازے سے باہر بلوں کی کریہہ آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ گاہے بگاہے وہ اپنے پنجوں سے دروازے کی لکڑی کو بے طرح کھرچنے لگتے تھے۔ انہیں شوٹ کر دینا ہمارے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ انوش نے تو زخمی ہونے کے باوجود

ایک دفعہ پھر کر قسطینا والی رائفل اٹھالی تھی مگر شاہ زیب نے اسے منع کر دیا تھا۔ ”دیکھو انوش! ہمیں یوں سوچنا چاہیے کہ یہ جانور جو کچھ کر رہے ہیں، کسی کے زیرِ اثر کر رہے ہیں۔ ہمارا اصل دشمن تو کہیں اور بیٹھا ہے۔ وہاں اسپتال میں عمران نے بھی جو کچھ کیا ہے وہ اس نے نہیں کیا، اس سے کرایا گیا ہے۔ آگے بھی جو ہوگا، اس سے کرایا جائے گا۔“

انوش بولا۔ ”شاہ زیب بھائی! لڑکیاں خوف زدہ ہو رہی ہیں اگر ہم نے رات یہیں گزارنی ہے تو کیسے گزاریں گے؟“

”لیکن انوش اس کی کیا گارنٹی ہے کہ اگر ہم نے باہر نکل کر ان جانوروں کو شوٹ کر دیا تو کچھ اور یہاں نہیں پہنچ جائیں گے۔ یہ حل نہیں ہے۔ ہم فی الحال بالکل محفوظ ہیں۔ میں قسطینا سے کہتا ہوں کہ وہ لڑکیوں کو سمجھائے۔“

میں نے بھی تائید کی۔ ”انوش! اس سارے معاملے کے بارے میں جو کچھ شاہ زیب اور قسطینا جانتے ہیں، وہ ہمیں معلوم نہیں۔“

انوش اُلجھا ہوا سا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میرا ذہن ایک بار پھر عمران کی طرف چلا گیا۔ دل کٹنے سا لگا۔

اسی دوران میں ماہین اجازت لے کر پھر اندر آ گئی۔ غم واندوہ کی پہلے والی کیفیت تو قدرے ماند پڑ چکی تھی مگر اب وہ بھی دوسروں کی طرح ڈری ہوئی تھی۔ میں اسے ساتھ والے خالی کمرے کی طرف لے آیا۔ مجھے پتا تھا وہ کیا پوچھنے آئی ہے۔ سر جھکا کر نمناک آواز میں بولی۔ ”تابش انکل! اب کہاں ہے وہ؟“ اس کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

”ابھی اُس کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا ماہی۔ لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ جہاں بھی ہے، اس وقت خیریت سے ہوگا۔ باقی رہی اس کی ذہنی حالت، شاہ زیب کا کہنا ہے کہ اس کے دل و دماغ پر جو اثرات ہیں، وہ بھی بتدریج کم ہوتے جائیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔“

وہ شدید اُلجھن میں نفی کے انداز میں سر ہلانے لگی۔ ”انکل تابش! میں کیا کروں، مجھے ان باتوں پر اب بھی یقین نہیں ہو رہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی ہوش مند شخص کے دماغ پر اتنا سوار ہو کہ اسے اپنے اشاروں پر چلانے لگے۔ ہپناٹزم اور مسمریزم کے بارے میں، میں نے بھی کافی کچھ پڑھا سنا ہے مگر یہ سب تو......“

”ماہی! ہمیں اس بارے میں بہت نہیں سوچنا چاہیے۔ ابھی خود کو تھوڑا وقت دیں، پھر اصل صورتِ حال خود ہی سامنے آ جائے گی۔ بس تم اچھے کی دعا کرو سب کے لیے اور عمران کے لیے بھی۔“

”میں اسے بہت خوش دیکھنا چاہتی ہوں انکل تابش...... ہر حالت میں، ہر قیمت پر۔“ اس کی آنکھوں سے دو موتی اس کے شفاف رخساروں پر رینگے پھر وہ ہولے سے بولی۔ ”میں نے سنا ہے اس نے اشفاق کو بہت بُری طرح مارا ہے۔ اشفاق ٹھیک تو ہو جائے گا نا؟“

”میں نے کہا ہے نا تم حوصلے سے رہو اور بس دعا کرو۔“

وہ پھر اپنی خوب صورت آنکھوں میں آنسو لے آئی۔ ”آپ کو پتا ہے، اشفاق مجھے سسٹر کہتا ہے اور کہتا ہی نہیں سسٹر سمجھتا بھی ہے۔ وہ بغیر کسی لالچ بغیر کسی معاوضے کے میرے ساتھ دربدر ہو رہا ہے۔ اس کی بس ایک ہی خواہش ہے، ہمارا چینل گرو کرے۔ اس کی دھوم ہو۔ اس کے والدین بوڑھے ہیں۔ اس سے شادی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کی منگنی بھی ہو چکی ہے مگر وہ شادی سے پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ ہمارے اس چینل کے حوالے سے بڑی امیدیں باندھ رکھی ہیں اُس نے۔ اس کے بھائی کو بھی پتا ہے کہ وہ کوئی ڈاکیومنٹری بنانے کے لیے میرے ساتھ نوشکی گیا ہوا ہے۔ اگر اس کے والدین کو پتا چلے کہ وہ یہاں زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے تو پتا نہیں ان کی کیا حالت ہو۔“ پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”انکل! وہ ہو جائے گا نا صحت مند؟“

”کافی زیادہ چوٹ ہے ماہی۔ ڈاکٹر پوری کوشش کر رہے ہیں۔ چلو اب زیادہ سوچنا بند کرو۔“ میں نے اس کا شانہ تھپک کر دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

بیسمنٹ میں بسکٹس اور اسنیکس کی شکل میں کھانے پینے کا کچھ سامان موجود تھا۔ ہم نے اسی سے گزارا کر لیا۔

☆☆☆

رات قریباً تین بجے کا وقت تھا جب ہمیں یہ محسوس ہوا کہ کوٹھی کے طول و عرض میں اب مکمل خاموشی ہے۔ کسی کُتّے بلی کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بس کوٹھی میں جو دو پالتو بلیاں موجود تھیں وہ کسی وقت باریک سی آواز نکال کر اپنی خوف زدہ موجودگی کا احساس دلاتی تھیں۔ ٹھیک سے کوئی بھی نہیں سو پایا تھا۔ صرف پہلوان حشمت کے خراٹے گونج رہے تھے۔ شاہ زیب نے آہستہ آواز میں مجھ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں باہر کا جائزہ لے لینا چاہیے۔“

”بہتر ہے کہ میں اکیلا جاؤں۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا کہنا بھی یہی ہے کہ اصل خطرہ ہمیں نہیں ہے۔“

قسطینا کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں مگر وہ بالکل

چوکس نظر آتی تھی۔ وہ اور شاہ زیب دروازے کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ شاہ زیب کے ہاتھ میں اس کا مخصوص سائیلنسر لگا پستول تھا (اس اعلیٰ قسم کے سائیلنسر نے مجھے حیران کیا تھا) میں قسطینا سے رائفل لے کر تہ خانے سے باہر نکل آیا۔ غوری کی کٹی پھٹی لاش سے نظریں چرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کا غلاف اس کی لاش پر ڈال دیا۔ احتیاط سے میں نے کوٹھی کے ہر گوشے کا جائزہ لیا۔ کوٹھی کے اردگرد بھی نگاہ دوڑائی۔ یہ ایک آباد ہاؤسنگ سوسائٹی تھی مگر اس کوٹھی کے اردگرد کچھ پلاٹس خالی تھے، یہی وجہ تھی کہ یہاں تین چار فائرز ہونے کے باوجود کوئی خصوصی طور پر متوجہ نہیں ہوا تھا۔ جائزہ لینے کے بعد میں تہ خانے میں واپس آگیا۔

''گرین سگنل ہے شاہ زیب۔'' میں نے کہا۔

ہم جو پروگرام بنا چکے تھے، اس پر عمل کرنے کا وقت آچکا تھا۔ ہمیں ہر صورت اب اس جگہ سے نکلنا تھا لیکن ایک خاص احتیاط کے ساتھ۔

☆☆☆

فارچیونر گاڑی میں کافی گنجائش ہوتی ہے۔ اس کے شیشے بھی ٹنٹڈ تھے مگر بقول شاہ زیب ہماری حفاظت ایک عجیب ڈھنگ سے ہونا تھی۔ قسطینا کو عمارت کے اندر سے ہی ایک تیز پرفیوم مل گیا تھا۔ وہ یہ پرفیوم گاڑی میں ساتھ لے جا رہی تھی۔ ہم سب زانی، راشدہ راجانی اور ماہین سمیت گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

قسطینا نے کہا۔ ''آپ سے معذرت...... مجھے اور شاہ زائب کو پتا ہے کہ بند گاڑی میں اس تیز پرفیوم کا چھڑکاؤ آپ کو شاید زیادہ اچھا نہیں لگے گا لیکن یہ مجبوری ہے۔''

''مجھے شاہ زیب نے سب بتا دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ دونوں کو جو احتیاطی تدبیر کرنا ہے، وہ کریں۔''

شاہ زیب اور قسطینا اب تک ہاناوانی کے ساتھ جن تلخ تجربات سے گزر چکے تھے، ان سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ ہاناوانی کے کسی ہپناٹائزڈ جاندار کے حملے سے بچنے کے لیے اپنے جسم اور لباس کی بو چھپانا ضروری ہے۔ تیز پرفیوم اس بو کو چھپا سکتا تھا یا بہت کم کرسکتا تھا۔ بالکل بند گاڑی میں تیز پرفیوم کی وجہ سے واقعی سر پر بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ یہ سردیوں کی رات تھی اور چار بجے کا عمل تھا۔ ہم بخیریت کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آگئے تھے اور یہ ایک اچھی پیش رفت تھی۔ راستے میں جہاں کہیں کوئی آوارہ کتا نظر آتا، میں چونکتا اور اسے غور سے دیکھتا کہ وہ نارمل ہے یا نہیں۔ بہرطور سب ٹھیک رہا۔ بہاولپور کے ایک بس اسٹینڈ کے نزدیک ہم نے گاڑی روکی۔ گرومستان کی جواں سال بیوی راشدہ راجانی کو اب ہم سے علیحدہ ہو کر واپس گوٹھ نوشیرا اپنے شوہر کے پاس چلے جانا تھا مگر عین موقع پر راشدہ نے پھر انکار کر دیا۔ اس کا موقف مضبوط اور وزنی تھا۔ اسے پتا تھا کہ اگر گوٹھ نوشیر میں گرومستان کا ظلم وستم تھما ہوا ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ وہ راشدہ کو مغویہ سمجھ رہا ہے اور یہ سمجھ رہا ہے کہ اگر اس کے صف شکنوں نے گوٹھ نوشیر میں حالات مزید خراب کیے یا مولانا کے آخری فرزند وقاص جمالی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو راشدہ زندہ واپس نہیں آئے گی۔

گوٹھ نوشیر سے جو تھوڑی بہت اطلاعات ہم تک پہنچ رہی تھیں، ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ گرومستان کے جھاڑ جھنکاڑ داڑھیوں والے غصیلے صف شکن اور رب پیارے زہری سانپوں کی طرح بس کھول رہے ہیں۔

اچھی بات صرف ایک ہی تھی کہ اکبر خاں وقاص اور اس کے گھر والوں کو کسی نامعلوم جگہ پر لے جا چکا تھا۔ میرے علاوہ انوش نے بھی ایک بار پھر کوشش کی کہ راشدہ کسی طرح چانی کے لیے روانہ ہوجائے مگر ایسا نہیں ہوسکا، آخر ہم پھر چل پڑے۔ ڈرائیونگ میں ہی کر رہا تھا۔ ہمارا ارادہ ملتان پہنچنے کا تھا۔ ہمیں قریباً 95 کلومیٹر سفر کرنا تھا۔ شاہ زیب اور قسطینا کے نزدیک یہ ایک محفوظ فاصلہ تھا۔ وہاں پر ہماری ہمدرد و مددگار میڈم مرینہ ایک اور رہائش گاہ کا انتظام کر چکی تھی۔ اس دفعہ وہ ہماری میزبانی کے لیے اور انوش سے ملاقات کے لیے خود بھی وہاں موجود تھی۔ یہ اس کی تعمیراتی کمپنی کا ایک برانچ آفس ہی تھا جو آج کل خالی پڑا تھا۔ میڈم کے حکم پر اسے ہمارے لیے درست کر دیا گیا تھا۔ انوش نے دو تین بار فون کر کے مرینہ کو بتانا چاہا کہ ہم چل پڑے ہیں مگر رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اب رات کے اندھیرے میں دن کے اجالے کی آمیزش ہوگئی تھی۔ ابھی ہم پوری طرح بہاولپور سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ اچانک دائیں جانب والی ایک چھوٹی سڑک سے دو قدآور کتے برق رفتاری سے نکلے۔ وہ گولی کی طرح ہماری گاڑی کی طرف آئے۔ ان میں سے ایک بُری طرح گاڑی کی سائڈ سے ٹکرایا اور سڑک پر کئی لڑھکنیاں کھا گیا مگر پھر اٹھ کھڑا ہوا اور گاڑی کے پیچھے لپکا۔ دوسرا بھی آندھی کی رفتار سے گاڑی کے پیچھے آرہا تھا۔ اوپر تلے ہونے والے واقعات کے بعد ہم نے مزید حیران ہونا چھوڑ دیا تھا پھر بھی زانی چلا اٹھی تھی۔

ابھی تو سڑک صاف تھی، کتے گاڑی تک نہیں پہنچ سکتے تھے مگر آگے کسی قریبی چوک میں صورتِ حال بدل سکتی تھی۔ شاہ زیب نے جیکٹ سے اپنا سائیلنسر لگا پستول نکالا۔ کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارا، سرد ہوا برچھیوں کی طرح ہمارے چہروں سے ٹکرائی۔ وہ کتوں کو شوٹ کرنے جا رہا تھا اور اس نے کر دیا۔ اس نے صرف دو فائر کیے تھے جو اس کے ماہر نشانہ باز ہونے کی گواہی دیتے تھے۔ اس نے شیشہ پھر چڑھا دیا۔ ہیٹر آن تھا، گاڑی فوراً مناسب حد تک گرم ہوگئی۔

گاڑی کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی جس میں خوف کی نادیدہ لہریں تھیں اور اَن کہے سوالات تھے۔ ہمارا تعلق اکیسویں صدی کے جدید دور سے تھا، ہم پورے ہوش و حواس میں تھے اور ہمیں ایسے تجربات سے گزرنا پڑ رہا تھا جو ذہن میں سما نہیں رہے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی، میں نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے شاہ زیب بھائی؟“ زانی منمنائی۔

”بس اتنا کہوں گا کہ آپ گھبرائیں نہیں، جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہمارے کنٹرول میں ہے۔“

میں نے عقب نما آئینے میں دھیان سے دیکھا۔ پہلوان حشمت جس کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا، اس کا شیشہ ایک آدھ انچ نیچے اترا ہوا تھا۔ شاید پرفیوم کی بوجھل خوشبو نے اسے تنگ کیا تھا اور اس نے تھوڑی سے درز پیدا کر لی تھی۔ اس واقعے کے بعد اس نے خاموشی سے شیشہ اوپر چڑھا دیا۔ میں نے بھی خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ ضروری نہیں تھا کہ شیشے کی اس درز کے سبب ہی یہ واقعہ رونما ہوا ہو۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ جوں جوں ہم بہاولپور سے دور جا رہے ہیں، شاہ زیب اور قسطینا کے اعصاب کی کشیدگی کم ہو رہی ہے۔ وہ جیسے ایک مہلک حصار سے باہر نکل رہے تھے۔ البتہ پندرہ بیس منٹ بعد ایک بار پھر یہ صورتِ حال بُری طرح درہم برہم ہوئی اور اس مرتبہ جو ہوا وہ ہمارے اندیشے سے کہیں بڑھ کر تھا۔ ہاں ایک بات تھی، یہ سب کچھ بہت برا ہونے کے باوجود ”قابلِ فہم“ تھا، ہماری سمجھ میں آ رہا تھا۔ ہم بہاولپور شہر سے دس پندرہ کلومیٹر باہر آئے تھے جب ایک سنسان سڑک پر گہری دھند میں ہمیں سڑک کے عین درمیان ایک گاڑی نظر آئی۔ یہ ایک سیاہ رنگ کی اسٹیشن ویگن تھی اور یوں کھڑی تھی جیسے اس میں اچانک کوئی نقص پڑ گیا ہو، ایک اضافی ٹائر بھی سڑک پر دکھائی دے رہا تھا۔ جب قریب آئے تو پتا چلا کہ یہاں ایک اور ہنڈا کار بھی موجود ہے۔ دونوں کے قریب کچھ افراد کھڑے تھے۔

یکایک میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ ویگن کے پاس جو شخص کھڑا تھا، میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ وہی گہری براؤن آنکھوں والا سیاہ رنگ شخص تھا جس سے ہماری اکلوتی ملاقات صرف دو روز پہلے رانی جان کی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ اب تک کی معلومات کے مطابق یہ غیر ملکی اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ خاص میرے لیے کچھ لوگوں نے انڈیا سے منگوایا تھا۔ ہم رانی جان کی کوٹھی میں اس کی بے مثال سفاکی اور بربریت دیکھ چکے تھے۔

”لو جی ہو گیا سامنا“ شاہ زیب ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”لگ تو یہی رہا ہے کہ کوئی مخبری ہوئی ہے۔“ میں نے کہا اور گاڑی بلیک کلر اسٹیشن ویگن سے بیس پچیس میٹر کے فاصلے پر روک دی۔

”مخبری نہیں ہوئی بادشاہو، اس سے بھی بُرا کام ہوا ہے۔“ انوش جٹ نے عقبی نشست سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ”مرینہ کو پکڑ لیا ہے حرامیوں نے۔“ انوش کراہ کر بولا۔

گہری دُھند میں سے بغور دیکھنے پر مجھے ویگن کی کھڑکی میں ایک ہراساں نسوانی چہرہ نظر آیا۔ غالباً یہی مرینہ تھی۔ (میں نے اور عمران نے اسے سب سے پہلے انوش کی رہائش گاہ میں دیکھا تھا) یہ سب کچھ گہری دھند کے اندر سے کسی ڈراؤنے خواب کی طرح نمودار ہوا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد اسٹیشن ویگن میں بیٹھی مرینہ سڑک پر نظر آئی، مگر اس طرح کہ قوی ہیکل اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ اس کے عقب میں تھا اور اس کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں لے رکھا تھا۔ ایک اے کے 47 مرینہ کی کنپٹی پر تھی۔ قبول صورت مرینہ کی عمر قریباً تیس سال تھی۔ وہ ایک فعال اور مال دار خاتون تھی۔ اس وقت بھی وہ قیمتی لباس میں تھی مگر یہ کٹا پھٹا لباس گواہی دیتا تھا کہ پکڑے جانے کے وقت اس نے مزاحمت کی ہے۔

پھر ایک اور لڑکی نظر آئی۔ اسے بھی عقب سے دبوچا گیا تھا اور سر پر اس کی پی کیپ کے اوپر مشین پسٹل رکھا گیا تھا۔ اسے دبوچنے والے کو بھی میں اور شاہ زیب پہچان گئے۔ وہ انہی پختہ رنگ کے مدراسی گارڈز میں سے تھا جنہیں ہم نے رانی کی کوٹھی میں انیکسی کی پہریداری کرتے دیکھا تھا۔

اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ نہایت کھردری اور گرجدار آواز میں بولا۔ ”میرا سمبندھ انڈین پولیس سے رہا ہے لیکن اب میں فری لانس کلنگ کرتا ہوں تڑ تڑ تڑ۔ جس کی سپاری

پکڑتا ہوں، اس کی آتما خود ہی اس کا شریر چھوڑنے کے لیے پھڑ پھڑانے لگتی ہے پھڑ پھڑ پھڑ۔ میرا نام جوناتھن ہے مگر تم مجھے پیار سے جون بھی کہہ سکتے ہو، بلکہ تم میں سے جس نے جیادہ پیار کرنا ہے وہ ''جان'' بھی کہہ سکتا ہے۔''

میں غور سے اس کے نقوش دیکھ رہا تھا۔ پتا چلا تھا کہ اس کے ماں باپ میں سے کسی ایک کا تعلق اسرائیل سے ہے۔ اس کے کرخت ملاوٹی نقوش بھی یہی گواہی دیتے تھے۔

وہ دوبارہ بولا۔ ''مسٹر تابش اور مسٹر شاہ زیب! اب میں بڑے ادب کے ساتھ تم دونوں سے بنتی کرتا ہوں کہ گاڑی سے باہر آجاؤ۔''

میرا سینہ دہکنے لگا۔ اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی تمنا بڑی دیر سے میرے دل میں تھی۔ میں نے پستول جیکٹ میں لگایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

تن کر کھڑا ہونے کے بعد میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہیں پیار سے جان ہی کہوں گا اس کے ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ تمہارے ''بڑے'' اُلّو کے خاص پٹھے ہیں۔ انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی پرانی دشمنی چکائی ہے۔ تمہیں ایک غلط شخص کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔''

''غلط کو صحیح کرنا ہی تو میرا کام ہے۔ تم بھی کھد کو بہوت جلد صحیح پاؤ گے۔ ایک دم چکا چک۔'' اس نے رائفل کی نال میڈم مرینہ کی کنپٹی میں دھنساتے ہوئے کہا۔ میڈم مرینہ کراہ کر رہ گئی۔

''جان پیارے! ان عورتوں کو چھوڑ دو۔ مرد ہو تو مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔''

''میں فلمی ڈائیلاگ نہیں بولتا...... اور نہ سنتا ہوں۔ تم لوگوں کے پاس صرف دو منٹ ہیں۔ اپنی گاڑی میں سے نکل کر اس اسٹیشن ویگن میں اپنی تشریفیں رکھ لو۔ صرف دو منٹ۔'' اس نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

اب شاہ زیب اور زخمی انوش بھی گاڑی سے نکل آئے تھے۔ میں نے کہا۔ ''جان جی، تمہارے پاس بھی زیادہ منٹ نہیں ہیں۔ انسان کے بچے بن کر ان دونوں عورتوں کو چھوڑ دو اور اس کے بعد جو سانپ نکالنا ہے نکال لو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی گھڑی دیکھنا شروع کر دی۔ میں نے سرگوشی میں انوش سے پوچھا۔ ''یہ دوسری لڑکی کون ہے؟''

''مرینہ کی سگی بہن ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں کو ان حرامیوں نے ملتان والے ٹھکانے سے ہی پکڑا ہے۔ اسی لیے مرینہ کا فون نہیں لگ رہا تھا۔'' اسٹیشن ویگن سے اب چار اور ہٹے کٹے افراد نکل آئے تھے۔ ان کے سیاہ تھوبڑوں پر خشونت اور ہاتھوں میں جدید اسلحہ تھا۔

''میرے سرکار، میرے حجور! اب کیول 40 سیکنڈ بچے ہیں۔'' جوناتھن عرف جون بولا۔

''دیکھو پیارے جان! ان دونوں لیڈیز میں سے کسی کو کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی ہوئی تو تمہاری انتڑیاں تمہارے منہ کے راستے باہر نکالیں گے۔'' شاہ زیب گمبھیر آواز میں بولا۔

جون نے جیسے یہ فقرہ سنا ہی نہیں تھا۔ ''دس سیکنڈ...... پانچ سیکنڈ......''

ابھی ایک دو سیکنڈ باقی ہی تھے کہ اس نے بے دریغ اس لڑکی کی ٹانگ میں گولی ماری جسے انوش نے مرینہ کی بہن بتایا تھا۔ وہ بیس بائیس سال کی لڑکی گولی کھا کر مچھلی کی طرح تڑپی مگر ہٹے کٹے مدراسی کی گرفت سے نہ نکل سکی۔ اس کا ٹراؤزر خون سے تر ہوتا چلا گیا۔ اس کی آہ و بکا بڑی دردناک تھی۔

میڈم مرینہ نے اچانک زور مار کر خود کو چھڑانا چاہا، ناکام رہی اور پلٹ کر جون کے منہ پر تھوک دیا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ غالباً مرینہ کا تھوک جون کے رخسار تک بعد میں پہنچا ہوگا، اے کے 47 کا خوفناک برسٹ اس کی بہن کے سر تک پہلے پہنچ گیا۔ نیلی اور سبز پی کیپ دور جا گری۔ کھوپڑی کے کئی پرخچے اُڑتے اور خون کے چھینٹے اچھلتے میں نے صاف دیکھے۔

میں نے اور شاہ زیب نے ایک ساتھ پستول نکالے۔ جون دہاڑا۔ ''اسٹاپ...... اسٹاپ، ورنہ یہ بھی جائے گی۔ جندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس کی اے کے 47 کی نال مرینہ کے منہ میں تھی۔ جب بہن کی کھوپڑی اُڑتے دیکھ کر وہ چلائی تو اس نال کو منہ کا راستہ مل گیا تھا۔

ہم سکتہ زدہ کھڑے رہ گئے...... مگر جذباتی انوش رکا نہ رہ سکا۔ وہ دیوانہ وار جون کی طرف بڑھا۔ شاہ زیب نے بروقت اسے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ ''نہیں انوش...... یہ اندھا ہو رہا ہے۔''

جون کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنکارا۔ ''اندھا ہو رہا ہوں، مگر اندھا نہیں ہوں۔ یہ اپنی کلائی کی گھڑی نجر آ رہی ہے مجھے۔ تمہارے اگلے دو منٹ شروع ہوئے 30 سیکنڈ گجر (گزر) چکے ہیں۔ ایک منٹ پورا ہونے پر اس کی ٹانگ پر گولی ماروں گا، پھر دوسرے منٹ پر اس کا نازبل بھی اُڑا دوں گا...... بلکہ ٹانگ والا ''اپی سوڈ'' تو بھی لے

لو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بے دریغ مرینہ کی پنڈلی میں گولی داغ دی۔ اس کی کانرائے کی نفیس چینٹ پر خون گلکاریاں کرنے لگا۔ وہ تڑپنے لگی۔ جون نے اب بیرل پھر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

انوش دہاڑ رہا تھا، پکار رہا تھا مگر اس کا کالر بدستور شاہ زیب کی مضبوط گرفت میں تھا۔ اب پہلوان حشمت نے بھی باہر نکل کر انوش کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میڈم مرینہ کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہوتا جا رہا تھا۔ اس عورت نے انوش جٹ کی توقع سے بڑھ کر ہماری مدد کی تھی، قدم قدم پر ہمیں دلیری کے ساتھ سہولتیں فراہم کی تھیں...... اور اب وہ موت کے دہانے پر تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ بھوری آنکھوں والا یہ کالا شیطان وہی کرے گا جو کہہ رہا ہے۔ دو سرا منٹ پورا ہونے میں آٹھ دس سیکنڈ ہی باقی تھے۔ میں نے پستول سڑک پر پھینک دیا۔ تب شاہ زیب نے بھی تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد یہی کیا۔

''سب باہر نکلو...... فوراً فوراً۔'' جون چنگھاڑا۔

شاہ زیب کے اشارے پر قسطینا اور باقی لڑکیاں بھی باہر نکل آئیں۔ پکی رنگت کے مدراسی وندناتے ہوئے ہماری گاڑی میں گھس گئے۔ دو رائفلیں اور ایمونیشن وغیرہ بھی نکال لائے۔ وہ گاڑی میں پھیلی ہوئی تیز خوشبو پر کچھ حیران بھی تھے۔

میڈم مرینہ کی حالت بُری تھی مگر اس کی گردن جون کے شکنجے میں تھی۔ جوناتھن عرف جون کے حکم پر مدراسیوں نے سب کی جامہ تلاشی لی۔ پھر جون دہاڑا۔ ''سب بیٹھ جاؤ اسٹیشن وین میں لیکن پچھلی دو سیٹیں خالی رہیں گی۔ جلدی کرو۔''

وین میں بیٹھنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ہماری ذرا سی مزاحمت سے ہماری بے لوث معاون مرینہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتی تھی۔ ممکن تھا...... بالکل ممکن تھا کہ اس کے بعد ہم جون کو بھی زندہ نہ چھوڑتے مگر مرینہ کو تو واپس نہیں لا سکتے تھے۔ ہمیں ایک بہتر موقع کی ضرورت تھی۔ جون زخمی مرینہ کو گھسیٹ کر دوسری گاڑی میں لے گیا۔ یہ ایک ہنڈا کار تھی۔ مرینہ کی بہن کی مسخ لاش بھی اٹھا کر کار کی ڈکی میں پھینک دی گئی۔ اسٹیشن وین کی عقبی سیٹ پر تین مدراسی بیٹھ گئے۔ تینوں کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں، چہروں پر ماسک تھے۔

☆☆☆

ہمیں جس جگہ لے جایا گیا، وہ میرے اور شاہ زیب کے لیے نئی نہیں تھی۔ ہم پھر بہاولپور شہر میں تھے اور رانی جان کی اس عالی شان رہائش گاہ میں جہاں صرف اور صرف دو دن پہلے تقریب کی رات خون ریز واقعہ ہوا تھا۔ نہ صرف ایک نامی ڈکیت مارا گیا تھا بلکہ رانی جان کا جواں سال شوہر، رانی جان کا بیٹا اور بیٹی بھی قتل ہو گئے تھے۔ ہم درختوں سے گھری اس وسیع و عریض عمارت کو آج دن کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ آج وہ وسیع لان خالی نظر آ رہا تھا جس میں ہم نے دودھیا روشنیوں میں رقص و سرود کے مناظر دیکھے تھے۔ آج ایک طرف طویل دالان میں دو تین نوکر ہی نظر آئے۔ وہ بڑی تجسس بھری نظروں سے اسٹیشن وین کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

گن پوائنٹس پر ہمیں وین سے اتارا گیا۔ کار بھی پہنچ گئی تھی اور اس میں سے روتی چلاتی میڈم مرینہ بھی یہاں پہنچا دی گئی تھی۔ اسے دو مدراسی ڈشکروں نے پوری طرح جکڑ کر کار سے نکالا۔ مرینہ کی زخمی ٹانگ لہولہان تھی اور پاؤں زمین پر نہیں لگ رہا تھا۔ یہ منظر تکلیف دہ تھا۔ جون بھی کار سے باہر آ چکا تھا، اس نے دور ہی سے اپنے بندوں کو اشارہ کیا، وہ ہمیں لے کر کشادہ زینوں کی طرف آئے اور فرسٹ فلور پر لے گئے۔ رانی جان کی یہ خوب صورت اور وسیع رہائش گاہ قدیم اور جدید طرز کا امتزاج تھی۔ ہمیں بالائی منزل پر پہنچایا گیا۔ اسی دوران میں جوناتھن عرف جون بھی وندناتا ہوا اوپر آ گیا۔ تحکمانہ انداز میں اپنے مدراسی گارڈز سے بولا۔ ''زنانہ ڈبا علیحدہ مردانہ علیحدہ۔''

اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے گارڈز نے ماہین، زانی اور راشدہ کو ہم سے الگ کرنا چاہا۔ میرے سینے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''حد سے نہ بڑھو جون۔ بات مرنے مارنے پر آ گئی تو پھر ہم سب میں سے کوئی بھی یہاں زندہ نہیں بچے گا۔''

وہ اپنے مخصوص زہریلے لہجے میں بولا۔ ''میں تو تمہارے آرام کا کھیال کر رہا ہوں۔ یہ تینوں ناریاں یہاں ہوں گی تو بول بول کر تم لوگن کا دماغ چاٹتی رہیں گی۔''

''مسخری مت کر...... حد سے بڑھے گا تو پھر یہاں کچھ نہیں بچے گا۔'' میں نے آتشیں لہجے میں کہا۔ ''میں نے پہلے ہی تجھ سے کہا تھا، مرد ہے تو پھر مردوں کی طرح سامنے آ۔ ان عورتوں کو درمیان میں مت لا۔''

اس نے انگلی سے اپنی کنپٹی کھجائی اور گردن ٹیڑھی کر کے بولا۔ ''ویسے بات تو تم نے بجے (مزے) کی کی ہے۔ مجھے بھی کسی کا دیا اچھا نہیں لگتا۔ مار کر کھانے کا علیحدہ ہی مجا ہوتا ہے۔ کتنی سندر بات کی تھی کسی منگول بادشاہ نے۔ دشمن کو ڈھ

کے میدان میں ڈھیر کرنا اور پھر دشمن کی ناریوں کے ساتھ جشن منانا......واہ واہ......کتنی سندر بات، کتنی سندر......"

کچھ دیر تک وہ انگلی اپنی کنپٹی پر رکھ کر سوچنے والا انداز بنائے رہا، پھر کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکوس کر اپنے مسلح گارڈز سے بولا۔ "ٹھیک کہتا ہے یہ بھگوڑا ڈپٹی۔ اس کی ان بہنوں کو اس کے ساتھ ہی رہنے دو۔ کل پھیسلہ (فیصلہ) کریں گے۔"

اس کا اشارہ سمجھ کر مدراسی گارڈز نے ہم سب کو ایک کشادہ مستطیل کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ جون گھوم کر کھڑکی کے پاس آیا جس میں اسٹیل کی مضبوط گرل تھی۔ خون کے دباؤ سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی سیاہ نظر آنے لگا تھا۔ اپنی بھوری آنکھیں میرے چہرے پر جما کر بولا۔ "تیرا چیلنج قبول کیا ہے بھگوڑے ڈپٹی، اب اپنے کہے سے پھرنا مت۔ کل تجھے سب کے سامنے ماروں گا۔ تجھے مارنے کے بعد ان لڑکیوں پر حق جتاؤں گا۔ بانٹ دوں گا ان کو اپنے مدراسی شیروں میں۔"

وہ اپنی ایڑیوں پر گھوما اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا کھڑکی کے سامنے سے سیڑھیوں کی طرف گیا۔ ابھی سیڑھیوں تک پہنچا نہیں تھا کہ زخمی انوش کسی گھائل پرندے کی طرح کھڑکی سے آٹکرایا۔ جون کو مخاطب کر کے طیش میں چنگھاڑا۔

"اوئے تو ڈپٹی سے کیا لڑے گا۔ میرے سامنے آ، خالی ہاتھوں سے تجھے چیر کر نہ رکھ دوں تو ماں مجھے دودھ نہ بخشے......آ میرے سامنے۔"

جون گھوم کر کھڑکی کے سامنے آیا اور کسی کالے ناگ کی طرح پھنکارا۔ "تیرے جیسے مچھندروں کو تو پہلے ہیجڑا بناتا ہوں پھر وہ میرے پنڈے کی مالش کرتے ہیں اور ہانڈی روٹی میں کھاداماؤں کی مدد کرتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی وہ زینے اتر کر نیچے چلا گیا۔ انوش گرجتا رہ گیا۔ اس کا بازو عمران کی گولی سے زخمی ہوا تھا اور گردن میں جھول رہا تھا، زخمی گردن کی بینڈیج سے بھی پھر خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ سب نے مل کر اسے بمشکل سنبھالا۔ اس مستطیل کمرے میں سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ انوش مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ "اگر اس نے مرینہ کے ساتھ کچھ کیا تو میں اس کے ٹوٹے کر کے کتوں کو کھلاؤں گا......"

☆☆☆

مرینہ اور اس کی بہن کی بدقسمتی تھی کہ وہ جون جیسے بے رحم قاتل کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔ اس کی بہن تو وہیں پر ماری گئی تھی، ہم فوری سرینڈر نہ کرتے تو اس جنونی کے ہاتھوں میڈم مرینہ کی جان بھی چلی جاتی۔ اب ہمیں سوچنے کا موقع مل رہا تھا اور ذہن کئی سمتوں میں خیال کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

اب دوپہر ہو چکی تھی۔ بالائی منزل سے لان کا جو حصہ دکھائی دیتا تھا، وہاں سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر مسلح مدراسی موجود تھے۔ حالات کسی گھن چکر کی طرح ہمیں اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا دشمن سامنے آ رہا تھا۔ سہراب عرف عالی جاہ کی دشمنی ہی کم نہ تھی جو اپنی ڈکشنری میں معافی کا لفظ نہیں رکھتا تھا، اب اس کی مرضی سے یہ ہانا وانی نام کی ڈائن صفت عورت ہم پر مسلط ہو رہی تھی۔ مجھے عالی جاہ کے وہ کبڑے قیدی یاد آئے جو بند پنجروں میں سسک سسک کر مرتے تھے۔ وہ ایک ظالم کے تمام تر خواص پر پورا اترتا تھا۔ پاؤچڈنسل کے چوہوں کے وہ مناظر کوشش کے باوجود ذہن سے محو نہیں ہوتے تھے۔ عالی جاہ کے سوٹڈ بوٹڈ کارندے جنہیں لوپو (بھیڑیا) کہا جاتا تھا، اپنے باس ہی کی طرح درندہ صفت تھے۔

شاہ زیب بھی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا گہری سوچ میں گم تھا۔ عمران کے موجودہ اور سابقہ رویّے کے باوجود وہ اس کے لیے گہری ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا عمران کس باپ کا بیٹا ہے۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب ایک دن پہلے اسپتال میں موجود اشفاق کی جان لینے کے بعد عمران بھاگا تھا اور سیکیورٹی گارڈ نے اسے نشانہ بنانا چاہا تھا۔ شاہ زیب نے جیسے تڑپ کر گارڈ کی رائفل نیچے جھکا دی تھی۔

میرے پہلو میں بیٹھے شاہ زیب نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہیں تابش صاحب؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ اپنی جیکٹ کی جیب سے کچھ نکال کر اس نے میرے ہاتھ پر رکھ دیا......یہ میری وہی گھڑی تھی جو کچھ عرصہ پہلے شاہ خانو نے مجھے گوھار زینت کے اغوا میں پھنسانے کے لیے موقع واردات پر رکھوائی تھی۔ یہ گھڑی اب تک شاہ زیب کے پاس ہی تھی۔ مجھے ایک دو بار خیال آیا تھا مگر میں نے پوچھا نہ تھا۔ شاہ زیب بڑی چاہت سے گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تابش صاحب! میں اس کے حوالے سے آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں، لیکن ابھی نہیں۔ بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی آپ اسے رکھیے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، یکایک بالکل قریب سے تھپ تھپ کی آواز آئی۔ کوئی جانور دوڑ کر

ہماری طرف آرہا تھا، پھر اپنا کُتا دکھائی دیا۔ زالی اور راشدہ چلّا اٹھیں۔ وہ پچھلے پہروں کھنڈروں میں کُتّوں کے ساتھ ہمارے برے تجربات ہوئے تھے، وہ کافی سنگین تھے۔ یہ السیشن کتا تھا، اس نے کھڑکی کے سامنے ایک چکر لگایا اور پھر واپس طرف کھڑا ہو کر اطمینان سے دم ہلانے لگا۔ اس کی گردن میں چمڑے کا پٹا تھا اور چہرے پر وہ وحشت بھی نہیں تھی جو آوارہ کُتّوں میں نظر آتی ہے۔

"یہ پالتو ہے۔ ڈرنے کی بات نہیں۔" شاہ زیب نے زالی اور راشدہ کو تسلی دی۔

کتے کے پیچھے ہی پیچھے ایک عورت اپنے دو تین ملازموں کے ساتھ کھڑکی کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میں پہلی بار رانی جان کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ درمیانی عمر اور تھوڑے بھاری جسم کے باوجود وہ پُرکشش عورت تھی۔ غالباً مسکراتے ہوئے اور خوب صورت لگتی ہوگی مگر فی الوقت تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ آنکھیں بھی متورم تھیں۔ یقیناً یہ ان اموات کا اثر تھا جو صرف "دو دن" پہلے یہاں ہو چکی تھیں۔ ڈکیت سادو کی فائرنگ سے رانی جان کا بیٹا اور بیٹی مرے تھے، جبکہ جوناتھن عرف جون نے پلک جھپکتے میں رانی جان کے جواں سال شوہر اور ایک انچارج گارڈ کو مار ڈالا تھا۔

اب وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی سیدھا میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پنجابی لہجے کی اردو میں بولی۔ "ڈپٹی صیب! بہت سنا ہے تمہارے بارے میں۔ دیکھو آخر اونٹ پہاڑ تھلے آ ہی گیا نا۔"

ایک موچھیل شخص بولا۔ "رانی صاحبہ! کہتے ہیں کہ اس کی کھال گینڈے کی کھال جیسی ہے۔ چھوٹی موٹی مار کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس پر۔ ننگے پنڈے برف پر لیٹتا ہے۔ میں نے گوٹھ کی سردار حویلی میں اسے لڑتے دیکھا تھا۔ آگ کی طرح تپے ہوئے فرش پر ننگے پاؤں کھڑا ہو گیا تھا۔ آرام سے زیادہ بے آرامی اور تکلیف میں خوش ہوتا ہے۔"

رانی بولی۔ "اس طرح کے کم تو پہاڑوں میں رہنے والے بھگتو اور سادھو کرتے ہیں۔ ہاں اگر اس کی ہڈی سخت ہے اور اس کو تکلیف پسند ہے تو ہم اپنے مہمان کے طور پر اس کی پسند کا پورا خیال رکھیں گے۔ پندرہ دن گمانوں کی ہی تو گل ہے۔" رانی جان کے انداز میں چھپی کوئی سنگین دھمکی تھی۔

تب رانی جان نے اچانک ہی پھر ایک تیز نگاہ دوڑائی۔ خاص طور سے شاہ زیب کو دیکھا۔ یقیناً وہ اس کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتی تھی۔

انوش جسٹ نڈھال ہو کر، پین کلر کے زیر اثر تھوڑی دیر کے لیے سو گیا تھا ورنہ وہ ایک بار پھر مشتعل ہو جاتا۔ رانی جان نے اپنے موچھیل ساتھی سے کہا۔ "گلزارے! بڑے نامی گرامی بندے ہیں بھئی یہ ڈپٹی صیب، ان کی ایک تصویر تو اتار لے، یادگار رہے گی۔" یادگار کا لفظ رانی جان نے پھر طنزیہ انداز میں ادا کیا تھا۔ جیسے مجھے بتانا چاہ رہی ہو کہ اب میرا دانہ پانی ختم ہے۔

موچھیل ساتھی نے اپنے قیمتی موبائل سے کھٹا کھٹ میری دو تصویریں اتاریں پھر ایک گروپ فوٹو بھی بنا لیا۔ پھر وہ اپنی قیمتی کامدار شال اپنے سرکش سینے پر پھیلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ میں نے کہا۔ "رانی جان! ایک عورت کی حیثیت سے تم یہ بات یاد رکھنا کہ ہماری ساتھی میڈم مرینہ بہت دکھی حالت میں ہے اور اس وقت تمہارے "نیک دل" مہمان جوناتھن عرف جون کے قبضے میں ہے۔"

وہ بولی۔ "اس کو بھی اپنی عورت والی حیثیت یاد رکھنی چاہیے تھی اور تم جیسے کمین بدمعاشوں کے ساتھ مل کر پُٹھے سیدھے کام نہیں کرنے چاہیے تھے۔ اب تم جون کی داڑھ کے نیچے آ گئے ہو، اب تو جو سامنے آئے گا، بھگتنا پڑے گا۔"

وہ نفرت انگیز نظروں سے ہمیں گھورتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اس کا کتا اس کے پیچھے دم ہلاتا چلا جا رہا تھا۔

ہمیں رات دس بجے کھانا پہنچایا گیا۔ کسی نے ایک لقمہ نہیں لیا۔ میڈم مرینہ کی بہن کی موت اور میڈم کی حالت زار نگاہوں کے سامنے تھی۔ مجھے یقین تھا پہلوان حشمت یقیناً بھوک محسوس کر رہا ہے مگر اس نے مرغن کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ مسلسل انوش کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ گوجرانوالا میں اپنے ہڈی جوڑ اسپتال میں اس نے ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر اور ایکسرے مشین بھی رکھی ہوئی تھی، ڈاکٹر کے ساتھ کی وجہ سے پہلوان کو بھی میڈیکیشن کی سمجھ بوجھ آ گئی تھی۔

رات دو بجے کا وقت تھا، میں بالکل سو نہیں پایا تھا۔ شاہ زیب بھی بس کروٹیں ہی لے رہا تھا۔ اچانک ٹھک ٹھک کی مدھم آواز کھڑکی کے بالکل پاس سے آئی۔ میں اٹھ کر کھڑکی تک گیا۔ شیشے کے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھولا۔ دائیں جانب کھڑکی کے بالکل پاس سے آواز آئی۔ "میری آواز پہنچ رہی ہے؟" یہ ساتھ والے کمرے کی کھڑکی تھی جہاں ہماری والی کھڑکی کی طرح اسٹیل کی مضبوط گرل لگی تھی۔

"کون ہو؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''پہلے آپ بتاؤ، ویسے میرا خیال ہے آپ تابش صاحب ہو۔'' اس دفعہ آواز مجھے کچھ پہچانی سی لگی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک پہریدار گرم چادر لپیٹے کرسی پر بیٹھا بیٹھا ہی اونگھ رہا تھا، دوسرے کے قدموں کی چاپ سیڑھیوں کی طرف سے آرہی تھی۔ شاید وہ چائے وغیرہ لینے نیچے گیا تھا۔ ایک دم میں پہچان گیا کہ ساتھ والی کھڑکی سے کس کی آواز آئی ہے۔ یہ ڈی ایس پی ڈوگرے کا ساتھی اور رشتے دار اے ایس آئی فراست تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر پستول کے دستے سے ایسی ضرب لگائی تھی کہ اس کا کان کنپٹی سے تقریباً آدھا کٹ کر نیچے لٹک گیا تھا۔ بعد میں اسی فراست نے دیوار پر آویزاں گن تک پہنچنے کے لیے میرا چیلنج قبول کیا تھا اور ناکام رہا تھا۔

''تم کو پہچان لیا ہے۔ اے ایس آئی فراست ہو لیکن یہاں کیسے؟''

''پتا نہیں، آپ کو خبر ہے یا نہیں۔ یہاں کوٹھی میں دو دن پہلے سخت فائرنگ ہوئی ہے۔ کئی بندے مارے گئے ہیں۔ ڈوگرے صاحب بھی شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑے ہیں۔ رانی جان کے ایک خاص بندے نے شک ظاہر کیا ہے کہ ڈوگرے صاحب نے اس کے خلاف سازش کی ہے۔''

''اور تم چونکہ ڈوگرے کے خاص چمچے اور رشتے دار تھے اس لیے تمہیں بھی دھر لیا گیا ہے۔''

''ایسا ہی ہے۔'' فراست کی مدھم آواز آئی۔

اسی دوران میں بھاری چاپوں کی آواز ابھری۔ دوسرا پہریدار ہماری جانب آرہا تھا۔ میں کھڑکی سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا پہریدار کندھے سے سیون ایم ایم رائفل لٹکائے، ہاتھ میں دو پیالیاں لیے نمودار ہوا۔ اس نے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر سے ساتھی کو جگایا۔ ''اوئے اٹھ جا کسی چڑسی ماں کے پُتر! دیکھ کیسی کڑک دودھ پتی باداموں والی لایا ہوں، جثہ آگ کی طرح گرم ہو جائے گا تیرا۔''

''زیادہ گرم بھی کر کے کیا کرنا ہے۔ گھر جانے کی چھٹی تو دیتی نہیں مالکن۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے کچھ دور جا کر بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ بعد فراست کی سرگوشی پھر ابھری۔ ''کہاں ہو سر جی؟''

''پاس ہی ہوں بولو۔'' میں نے جوابی سرگوشی کی۔

''ویسے بڑی ہی بُری جگہ پھنسے ہو تابش صاحب، یہ حرامی تو لگتا ہے کہ انسان کی اولاد ہی نہیں یا کوئی جن بھوت گھسا ہوا ہے اس کے اندر۔ بچ کر نکل گئے تو بہت ڈھاڈی قسمت ہو گی آپ کی۔ ویسے آپ کو اس کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے والا چیلنج قبول نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کوئی اور راستہ ڈھونڈتے یہاں سے نکلنے کا۔ اور شاید...... آپ ڈھونڈ ہی لیتے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر فراست کی آواز آئی۔ ''سچی بات کہوں تو وہ یہ ہے تابش صاحب کہ میں دل سے آپ کو مان گیا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ مجھے دس پرسینٹ بھی امید نہیں تھی کہ آپ گن تک پہنچنے والا چیلنج جیت جائیں گے۔ میں پنجاب لیول پر کبڈی کے بہترین کھلاڑیوں میں بھی رہا ہوں۔ مجھے پورا بھروسا تھا خود پر۔''

''اچھا...... تمہارے کان کا اب کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب بہت بہتر ہے۔ زخم سوکھ رہا ہے۔''

ذرا توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''فراست! میرے خیال میں اب ان باتوں کو دہرانے سے فائدہ نہیں۔ اگر ہمیں بات کرنے کا موقع ملا ہی ہے تو کوئی ایسی ٹھوس بات کرو جس سے ہمارے اور تمہارے نکلنے کا راستہ پیدا ہو سکے۔''

''مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، یہ جو کالا تیندوا ہے نا بہت ہی وکھری ٹائپ کا بندہ ہے۔ نام بعد میں پوچھتا ہے گولی پہلے مارتا ہے۔'' کالے تیندوے سے اس کی مراد جونا ٹھن عرف جون ہی تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کے ساتھ جو مدراسی بدمعاش ہیں وہ بھی اپنی اپنی جگہ بھیڑیے ہی ہیں۔ پانی ملائے بغیر شراب پیتے ہیں۔ آدھی آدھی بوتل ایک ڈیک میں چڑھا جاتے ہیں۔ یہ جو جون ہے یہ ناک سے سونگھنے والا نشہ کرتا ہے کسی پاؤڈر کا۔ سنا ہے کہ کالے بچھوؤں سے خود کو ڈسوا لیتا ہے اور اسے کچھ نہیں ہوتا۔ خود بھی تو ایک بچھو ہی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی بدکاری ہو جو اس میں نہ ہو......''

یکایک فراست کو چپ ہونا پڑا۔ ایک پہریدار پھر ہمارے کمرے کے سامنے پوزیشن سنبھالنے کے لیے آرہا تھا۔ میں اپنی کھڑکی سے ہٹ کر واپس فوم کے گدے پر آن بیٹھا۔ پہلوان حشمت کے خراٹے زور شور سے گونج رہے تھے۔ باقی سب سوئے ہوئے تھے۔ شاہ زیب کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پورے کمرے میں ہلکی سی خوشبو تھی۔ یہ چند اگربتیاں ہی تھیں جو شاہ زیب کو اس کمرے کی ایک دراز سے ملی تھیں۔ اس نے احتیاطاً انہیں سلگا دیا تھا۔ مقصد وہی تھا جو فارچیونر گاڑی میں پرفیوم کے

اسپرے کا تھا۔ شاہ زیب اور قسطینا دونوں اس بات پر یقین کر رہے تھے کہ خوشبو انہیں ہاناوانی کی ہپناٹزچیرہ دستیوں سے بچا سکتی ہے۔

میں نے نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن ایک بار پھر عمران اور اس کے مصائب کی طرف چلا گیا۔ ہپناٹزم کی حقیقت سے کسی کو انکار نہیں، مجھے بھی نہیں تھا مگر ہاناوانی کے حوالے سے جو کچھ سامنے آرہا تھا، وہ ناقابلِ گمان تھا۔ اگر پچھلے چند دن میں پیش آنے والے واقعات آنکھوں دیکھے نہ ہوتے تو ہم میں سے کوئی یقین نہ کر پاتا...... اسپتال میں شاہ زیب پر حملہ کرتے ہوئے عمران کے چہرے پر جو تاثرات نظر آئے تھے، وہ ذہن پر نقش ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی برین واشنگ کر دی گئی ہے۔ شاید کچھ لوگ ایسے ہی اپنے ہتھے چڑھے ہوئے نوجوانوں کی ''ذہن صفائی'' کر کے انہیں خودکش بمبار بنا دیتے ہیں۔

مجھے یوں لگا جیسے عمران دانش میرے اردگرد ہے۔ خاموش اور افسردہ۔ اس کی غیر مرئی آواز کانوں میں گونجتی محسوس ہوئی۔ ''تمہیں تو پتا ہے تابی! تمہارے پاس ہوتے ہوئے بھی میں تم سے بہت دور جا چکا ہوں۔ اب کچھ نہیں کر سکتا نہ اپنے بیٹے کے لیے نہ تمہارے لیے۔ اب تو اگر کچھ کرنا ہے تو تم کو ہی کرنا ہے......''

انہی سوچوں کے درمیان اونگھتے اونگھتے میں سو گیا۔ سچ ہے نیند سولی پر بھی آتی ہے۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ کھڑکی سے باہر گراسی لان میں بوندا باندی کے آثار تھے۔ دائیں جانب والے طویل دالان کے محرابی دروازوں میں سے چند افراد نظر آرہے تھے۔ میں نے ذرا آنکھیں سکیڑ کر دیکھا، گہرے سیاہ رنگ کے جون کو دیکھ کر آنکھیں جل اٹھیں۔ تین چار مدراسی گارڈز کے علاوہ دیہاتی لباس والے دو بندے بھی وہاں موجود تھے۔ بارش کی وجہ سے سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ ایک بڑی گول انگیٹھی وہاں دہک رہی تھی۔ تب میں نے ستائیس اٹھائیس سال کی ایک خوب صورت لڑکی کو وہاں دیکھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ لباس کی ہم رنگ جرسی بھی اس کے جسم پر موجود تھی۔ سر پر دوپٹا تھا۔ وہ جون کے سامنے ہی ایک کرسی پر خاموش بیٹھی تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ جون اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی بات پر افسوس کا اظہار یا معذرت کر رہا ہو۔ پھر ایک ناقابلِ یقین منظر دکھائی دیا۔ جون جیسا کرخت و سفاک شخص اس لڑکی کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

لڑکی کا سر بدستور جھکا رہا۔ تب ایک اور چیز نے حیران کر دیا۔ جون نے نیچے بیٹھ کر لڑکی کے پاؤں کو ہاتھ لگائے اور ملتجی لہجے میں کچھ بولنے لگا۔ اب شاہ زیب بھی میرے ساتھ آن کھڑا ہوا تھا اور حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اس سے بھی زیادہ عجیب منظر نے ہمیں حیران کر دیا۔ جون نے لڑکی کے پاؤں سے اس کی جوتی اتاری اور اسے خوبرو لڑکی کے ہاتھ میں پکڑانے کی کوشش کرنے لگا جیسے لڑکی سے کہہ رہا ہو کہ یہ جوتی پکڑے اور اس کے سر پر مارے۔

''حیران ہو رہے ہو سر جی۔'' ساتھ والی کھڑکی سے مدھم آواز آئی۔ یہ فراست ہی تھا۔ رات کی طرح میں بس اس کی آواز ہی سن پایا، شکل نظر نہیں آرہی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے فراست سے پوچھا۔

''یہاں ایسا اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے جی۔ اس کا لیے پر جتنا بھی حیران ہوا جائے، اتنا ہی کم ہے۔ آپ یہ سمجھیں کہ دن میں یہ بندہ اور ہے رات میں کچھ اور۔''

اب ہم دیکھ رہے تھے کہ جون نے جوتی لڑکی کے ہاتھ میں پکڑا کر خود لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور جوتی بار بار اپنے سر پر مار رہا تھا۔ دوپٹا لڑکی کے سر سے سرک گیا تھا اور اس کے لانبے سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے نظر آتے تھے۔ دور سے نظر تو نہیں آتا تھا لیکن لگتا یہی تھا کہ وہ تھر تھر کانپ رہی ہے۔

کئی جوتیاں اپنے سر پر مروا کر اس نے پھر لڑکی سے ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگنا شروع کیں۔ منت سماجت کے انداز میں اس کے گھٹنوں کو چھوا۔ دو تین بار اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ تب اپنی سیاہ جیکٹ اتار کر ایک طرف رکھی، پھر اپنی شرٹ اور بنیان بھی اتار دی اس کا سیاہ فولادی جسم عریاں ہو گیا۔

اب میرے اور شاہ زیب کے علاوہ پہلوان حشمت، قسطینا اور ماہین وغیرہ بھی کھڑکی سے نیچے دالان کے مناظر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''اس کی کمر پر وہ نشان دیکھے آپ نے ہتھے سے سرخ سرخ؟'' شاہ زیب نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''لگتا ہے کہ جلنے کے نشان ہیں...... کافی زیادہ ہیں۔'' میں نے کہا۔

بوندا باندی مسلسل ہو رہی تھی۔ دالان میں رکھی ہوئی انگیٹھی میں جو آگ روشن تھی، وہ صاف نظر آتی تھی۔ یہ فن ہی انگیٹھیوں جیسی تھی جو دو روز پہلے تقریب میں ماحول گرم رکھنے کے لیے رکھی گئی تھیں۔ ایک ایسی ہی انگیٹھی پر گارڈ

گولیاں کھا کر گرا تھا اور جل بھن گیا تھا۔ جوناتھن عرف جون نے انگیٹھی کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس نے انگیٹھی میں سے کچھ نکالا، یہ ایک دہکی ہوئی آہنی سلاخ تھی۔ اس نے سلاخ زبردستی لڑکی کے ہاتھ میں تھمائی، اس کے سینے کی ہچکیاں بتا رہی تھیں کہ وہ اب باقاعدہ رو رہی ہے، بار بار نفی میں سر ہلا رہی تھی مگر جون اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ سلاخ لڑکی کے ہاتھ میں رہی اور ہاتھ جون نے دبوچ رکھا پھر اس نے زبردستی اس دہکی ہوئی سلاخ کو اپنی کمر کے قریب کیا۔ لڑکی کو مجبور کیا کہ وہ اس کی کمر کو داغے جہاں پہلے ہی بہت سے نشان موجود تھے۔ جسم داغا گیا تو اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نظر آئے اور وہ زور سے کراہا بھی، آواز ہم تک پہنچی۔

یہ عمل اس نے دو بار دہرایا اور پھر سلاخ لڑکی کے ہاتھ سے کھینچ کر دور پھینک دی۔ ایک مدراسی جون کی کمر پر کوئی مرہم لگانے میں مصروف ہو گیا۔ جون اپنی ناک کے ذریعے نشیلا پاؤڈر اپنے دماغ کی طرف کھینچنے لگا۔ لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ساتھ والی کھڑکی سے فراست نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ایسے تماشے یہاں کئی دنوں سے لگ رہے ہیں، بڑا منحوس شخص ہے۔“

”لیکن ابھی تو بڑا مظلوم لگ رہا تھا۔“

”مظلوم یہ نہیں، مظلوم لڑکی ہے اور وہ دوسری عورتیں ہیں جن کے سامنے وہ اسی طرح کی عاجزانہ اداکاری کرتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”اس لڑکی کے ساتھ اس نے رات وہی کچھ کیا ہے جو یہ اب اس کے سامنے کر رہا ہے، آپ سے کہا تھا نا کہ رات کا جون اور ہے صبح کا اور۔ اس نے جس طرح لڑکی کی منتیں سماجتیں کی ہیں، ہاتھ جوڑے ہیں، اپنے سر پر اس کی جوتیاں کھائی ہیں، اس کے ہاتھوں اذیت سہی ہے، وہی سب کچھ اس لڑکی کو کرنا پڑا ہوگا۔ یہ اپنے طور پر اس طرح سے اپنے دل دماغ کا بوجھ کم کرتا ہے۔ آپ لوگوں تک اس کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی لیکن میں نے تو یہ سب قریب سے سنا ہوا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح جو اذیت اس لڑکی کو اس سے پہنچی تھی اب خود اس کو بھی پہنچی ہے اور یہ ”انصاف“ ہو گیا ہے۔ یہ سب اس نشیلے پاؤڈر کا کرشمہ ہے جو یہ اپنی ناک کے راستے دن رات اپنے دماغ کو چڑھاتا ہے۔“

میں اور شاہ زیب حیرانی سے سن رہے تھے۔ شاہ زیب نے کہا۔ ”اس لڑکی کے بارے میں کچھ پتا ہے تمہیں؟“

”اس بدنصیب کا نام مقدس ہے...... مقدس زین۔ ایک اسکول ٹیچر کی بیٹی ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اس نے اپنے ضلع سے ٹاپ کیا تھا۔ اس کے دماغ میں ویسا ہی سودا سمایا ہوا تھا جیسا چودھری شہباز اسلم کے بیٹے کے سر میں تھا۔ وہ مارا گیا...... مجھے یقین ہے یہ بھی دو چار دن میں ماری جائے گی...... یا پھر غائب کر دی جائے گی۔“

”تمہارا مطلب ہے، یہ بھی اسکول کھولنا چاہتی تھی؟“

”یہ اپنے علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ دے رہی تھی۔ کچھ اور پڑھی لکھی عورتیں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھیں۔ ایک ریٹائرڈ کرنل صاحب کی بیوی بھی تھی۔ انہوں نے لڑکیوں کے دو اسکول بنا لیے تھے اب تیسرے کی تیاری میں تھیں۔ لڑکیوں کے لیے دست کاری کا ایک سینٹر بھی بنا رہی تھیں۔ پہلے کچھ بااثر لوگوں نے الٹی دے کر ان عورتوں کو روکنا چاہا پھر ان کے پیچھے نامی گرامی غنڈے لگا دیے گئے۔ رانی جان ان غنڈوں کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ ایک موقع پر رانی جان کی بیٹی اور مقدس میں سرِراہ شدید جھگڑا ہوا۔ اس کے کچھ روز بعد ہی دست کاری والے سینٹر سے مقدس زین کو اس طرح اٹھا لیا گیا کہ کسی کو شبہ تک نہ ہو سکا کہ یہ رانی جان کا کام ہے۔“

دفعتاً فراست کو خاموش ہونا پڑا۔ مسلح پہرے دار ٹہلتے ہوئے کھڑکیوں کے سامنے آن بیٹھا تھا۔

میں کھڑکی سے ہٹ کر فوم کے گدے پر بیٹھ گیا۔ مجھے گراسی لان میں وہ جگہ نظر آ رہی تھی جہاں اس دن چودھری اسلم نیم عریاں حالت میں اپنی دل پسند خلوت سے باہر آیا تھا اور فائرنگ سے جہنم واصل ہوا تھا۔ وہ کم عمر طوائفوں کا رسیا تھا اور مر کر بھی ایک طوائف زادی کے اوپر ہی گرا تھا۔

وقفے وقفے سے بارش ہونے لگتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ایک بار پھر فراست سے مختصر بات ہوئی۔ میں نے اس سے ڈی ایس پی ڈوگرے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی معلومات کے مطابق وہ اسپتال میں ہے، ابھی اس کی حالت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وہ بار بار ہم سے یہی کہہ رہا تھا کہ ہم یہاں سے نکلنے اور میڈم کو بچانے کے لیے کوئی اور جتن کر سکیں تو بہتر ہے، ہم جوناتھن کے جال میں نہ آئیں۔ ”اس شخص کے اندر کوئی بدروح ہے۔ کوئی نہایت حیوانی قسم کی طاقت لیے پھرتا ہے یہ بندہ اپنے اندر...... اکثر اس کے مقابل آنے والوں کی ہڈیاں ٹوٹتی ہیں۔ جسم نیلے پڑ جاتے ہیں۔“

ابھی ہماری یہ گفتگو جاری تھی کہ دالان کے ساتھ واقع انیکسی کی طرف ہلچل کے آثار نظر آئے۔ پھر کسی عورت کے

چلانے کی آواز آئی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک عورت بھاگتی ہوئی ٹیکسی سے نکلی ہے۔ اس کے لباس سے فوراً پتا چلا کہ یہ وہی مقدس زین نامی لڑکی ہے جسے ہم کچھ دیر پہلے طویل دالان میں دیکھ چکے ہیں۔ اب دو مدراسی گارڈز اور دو تین ملازم اس کے پیچھے تھے۔ وہ ان سے بچنا چاہتی تھی جو ناممکن تھا، پھر ایک مدراسی نے اسے پیچھے سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اوندھے منہ گری۔ اس کے خوب صورت لمبے بال کیچڑ اور پانی میں لتھڑ گئے۔ میں چونکا، لڑکی کے ہاتھ میں پستول تھا۔ مدراسیوں نے اسے دبوچنا چاہا تو اس نے فائر کیا۔ ایک ہٹا کٹا مدراسی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بارشی پانی میں گرا۔ تب دو فائر مزید ہوئے۔ ان میں سے ایک لڑکی نے اپنے سر پر کیا تھا۔ بارش کے پانی میں تیزی سے خون کی سرخی شامل ہوتی چلی گئی۔ ہم سب دیکھنے کے سوا بھلا اور کیا کر سکتے تھے۔ ''مار لیا اس نے...... مار لیا خود کو۔'' ساتھ والی کھڑکی سے فراست کی تاسف بھری آواز اُبھری۔

ہماری پہرے داری کرنے والے دو اہلکار بھی اسی خونی ہنگامے کو دیکھنے کے لیے نیچے چلے گئے۔ انوش نے وحشت کے عالم میں دروازے کو زوردار ٹھوکریں رسید کیں۔ اس کی مدد کرتے ہوئے پہلوان حشمت نے بھی اپنے کندھے سے دروازے کو ضربیں لگائیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ یہ دو تین کمرے شاید تیار ہی رانی جان کے قیدیوں کے لیے کیے گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دراز قد رانی جان بھی موقع واردات پر نظر آنے لگی۔ ایک ملازم نے بڑی سی رنگ دار چھتری اس کے سر پر تان رکھی تھی۔ ساتھ والی کھڑکی سے فراست کی افسردہ آواز اُبھری۔ سر جی! لگتا ہے کہ اس لڑکی کی جان سستے میں چھوٹ گئی۔ رات ہونے سے پہلے ہی اس نے خود کو آزاد کرا لیا۔ مرنا تو اس نے تھا ہی، آج نہ مرتی دو چار دن بعد مر جاتی۔''

میں کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا۔ رانی جان کے پیچھے ایک ستون کی آڑ میں کھڑے شخص کی جھلک نظر آئی۔ غالباً وہ بھی اوپر ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اس شخص کو میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ شاید گوٹھ نوشیر میں کہیں۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ نظر آیا لیکن اس مرتبہ اس نے اپنی گرم چادر اس طرح سر پر ڈال رکھی تھی کہ میں اس کا چہرہ دیکھنے میں ناکام رہا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا تھا۔ شاید میں نے اسے انوش کے ساتھ دیکھا تھا۔

دوپہر اب سہ پہر میں ڈھلنا شروع ہوگئی تھی۔ بارش چند منٹ کے لیے تھم جاتی، مگر پھر بوندا باندی ہونے لگتی۔ قسطینا نہ جانے کیوں زیادہ فکرمند نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر چار پانچ اگربتیاں کمرے میں سلگا دی تھیں۔ اس کام میں شاہ زیب نے بھی اس کی مدد کی تھی۔

اچانک ایک آواز نے ہمیں چونکایا اور ہم کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔ نیچے گراسی لان میں۔ پورچ کے قریب جوناتھن عرف جون کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی جلتی آنکھیں کچھ اور بھی جلنے لگیں۔ للکارنے والے انداز میں وہ بولا۔ ''ڈپٹی پیارے آجا نیچے۔ بڑا شہرہ سنا ہے تیرا۔ چل آج دیکھ بھی لیں۔ آجا شاباش۔''

پھر ذرا توقف کر کے اس نے ناک میں پاؤڈر چڑھایا اور نشئی لہجے میں بولا۔ ''آجا بادشاہ جادے! اور مت تڑپا۔ اب جرا صبر نہیں ہو رہا مجھ سے۔ اور ہاں کوئی ہوشیاری دکھائی تو مالمہ بہوت کھراب ہو جائے گا۔ یہ مت بھولنا تم لوگن کہ وہ میڈم مرینہ میرے پنجے (قبضے) میں ہے۔ سمجھو گن پوائنٹ پر کھڑی ہے۔ تڑ تڑ اتڑ۔'' اس نے ہاتھ کے ایکشن سے فائرنگ کا اشارہ دیا۔

خوفناک تھوبڑوں والے چار مدراسی گارڈز جدید رائفلوں سے مسلح کمرے کے فولادی دروازے کے سامنے نمودار ہوئے۔ مجھے اور شاہ زیب کو باہر نکال کر دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ انوش بہت بپھرا ہوا تھا مگر دروازہ کھلنے سے پہلے ہی میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ خود کو سنبھالے رکھے۔ ورنہ یہ لوگ گولی چلانے میں بالکل دیر نہیں کریں گے۔

سیڑھیاں اتار کر ہمیں گراسی لان میں لایا گیا۔ پندرہ بیس افراد یہاں نظر آرہے تھے۔ دور ایک بالکونی میں رانی جان بھی کرسی پر بیٹھی نظر آتی تھی۔

شاہ زیب کی طرف دیکھ کر جون بولا۔ ''تیرا ہی نام شاہ جیب ہے نا۔ تو جرور حیران ہو رہا ہوگا کہ تجھے نیچے کیوں بلایا ہے۔ ہو رہا ہے نا حیران؟''

شاہ زیب تن کر کھڑا تھا، خاموش رہا۔ ''میرے ہیرے موتی! تجھے اس لیے بلایا ہے کہ تیری مار اماری کی بھی بہت کھبریں سنی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی آئی لینڈ میں تیرا بڑا جور چلتا ہے...... آج اس جور کو جنانہ (زنانہ) قسم کی ''کم جوری'' میں نہ بدل دیا تو جوناتھن نام نہیں میرا۔ ڈپٹی کے شریر کی بڑی بڑی ہڈیاں توڑنے کے بعد ابھی تجھ سے بھی لڑوں گا۔ تجھے بھی اس کے برابر لمبا لٹاؤں گا...... تو ابھی تھوڑی دیر چھری کے نیچے سانس لے۔''

تب وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ''تجھے کہا تھا نا

کہ مجھے فلمی ڈائیلاگ بولنا پسند نہیں لیکن کبھی کبھی بول بھی دیتا ہوں...... کل تو نے کہا تھا کہ میں ناریوں کو درمیان میں مت لاؤں، مرد ہوں تو مرد کی طرح سامنے آؤں۔ لو آ گیا ہوں۔ اب تم بھی ایک وعدہ کرو۔ ہارنے کے بعد ان تینوں لڑکیوں کو خود میرے حوالے کرو گے۔''

پھر اس نے بڑے کمینے انداز میں اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں اسٹیل کی گرل کے پیچھے زانی، ماہین اور راشدہ کے چہرے نظر آتے تھے۔ اپنی نہایت کھردری داڑھی کھجا کر بولا۔ ''ویسے کچھ جیادہ سندر نہیں ہیں یہ تینوں۔ میرے بستر کے لائق تو بالکل نہیں۔ ان کو اپنے کھدمت گاروں کے حوالے کر دوں گا۔'' اس نے اپنے مدراسی گارڈز کی طرف دیکھ کر میلے دانتوں کی نمائش کی۔

''مجھے لگتا ہے جون! تیرے منہ میں انسان کی نہیں کسی غلیظ جانور کی زبان ہے۔ امید ہے اگلے دو چار منٹ میں تیری یہ پلید شے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔''

اس نے گردن ٹیڑھی کر کے مجھے سرتاپا جلتی نظروں سے دیکھا، حسبِ عادت اپنی بڑھی ہوئی شیو کھجا کر بولا۔ ''تیری عمر تھوڑی جیادہ ہے۔ ترس آ رہا ہے تیری موت پر۔ چل تجھے تھوڑی رعایت دیتا ہوں۔ اپنا صرف ایک ہاتھ استعمال کروں گا تیری ہڈیوں کا چورا کرنے کے لیے۔''

شاہ زیب تین رائفلوں کی زد میں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں صرف تماشا دیکھنا ہے، دخل نہیں دینا۔''

اور پھر وہ لمحہ آیا، جب ہلکی بارش میں، ٹھٹھرے موسم میں، ایک کشادہ لان میں جون اور میں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے دائیں ہاتھ کی پہلی ضرب نے ہی مجھے سمجھا دیا کہ وہ غیر معمولی طاقت کا مالک ہے۔ ایک حیوانی سی بُو آ رہی تھی اس کے جسم سے اور گہری بھوری آنکھوں میں بجلی کی لپک تھی۔

میرے دو بھرپور مکوں کے جواب میں اس نے مجھ پر مکوں کی بارش کر دی، ساتھ ساتھ وہ پھنکار رہا تھا۔ ''بہوت برداشت ہے تجھ میں...... کھبریں (خبریں) ہیں کہ بہوت برداشت ہے تجھ میں......''

اور زندگی میں پہلی بار مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرا پالا ایک غیر انسانی طاقت سے پڑا ہے۔ جہاں اس کے ہاتھ کی ضرب لگتی تھی ہڈی اندر تک جھنجھنا جاتی تھی۔ یہ دو تین منٹ کا معرکہ بلاخیز تھا۔ اگر میں اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکا تو یہ میری برداشت ہی تھی۔ یقیناً اس برداشت نے میرے مقابل کو بھی حیرت میں مبتلا کیا ہو گا اور شاید یہی حیرت تھی جس کے سبب میں اسے کئی کاری ضربیں لگانے اور اس کا غرور متزلزل کرنے میں کامیاب رہا۔ ظاہر ہے ماہین، زانی اور راشدہ کے چہرے میری نگاہوں میں تھے اور یہ چہرے مجھے کسی صورت کمزور نہیں ہونے دے رہے تھے۔ البتہ ایک حقیقت ہر لمحے دل پر بوجھ بڑھا رہی تھی۔ وہ پُرغرور انداز میں اپنا صرف ایک ہاتھ استعمال کر رہا تھا۔ اپنی پوری طاقت اور پورا تجربہ بروئے کار لاتے ہوئے جب میں نے اسے پشت کے بل گرایا اور اپنے دفاع کے لیے اس نے غیر ارادی طور پر اپنا دوسرا ہاتھ استعمال کیا تو مجھے نفسیاتی طور پر زبردست سہارا ملا، مگر اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوا کہ یہ میرے لیے ایک مشکل ترین مقابلہ ہو گا۔ پیچھے ہٹنے کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مرنا تھا یا مار دینا تھا۔

کافی عرصہ پہلے میں نے جارج گورا نام کے ایک سُپر فائٹر سے ایسی ہی مزو یا مارو کی فائٹ کی تھی۔ آج کی فائٹ نے مجھے انڈیا میں ہونے والی وہ فائٹ یاد دلا دی۔ زبردست مارا ماری کے دوران میں ہی دو لمحے کے لیے میری نگاہ شاہ زیب کے چہرے پر پڑی، اس کے تاثرات کچھ عجیب تھے۔ وہ اوپر دیکھ رہا تھا۔ بارش اب تھم گئی تھی...... یوں لگا جیسے وہ بادلوں کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا ہو مگر اس کے فوراً بعد جو کچھ ہوا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ یکایک جنگلی طوطوں کا ایک جھنڈ نمودار ہوا اور ہماری طرف آیا۔ یوں محسوس ہوا کہ ان کا رخ سیدھا شاہ زیب کی طرف ہے۔ یہ دو چار نہیں درجنوں پرندے تھے اور ان کی آوازیں بھی نامانوس لگ رہی تھیں۔ شاہ زیب اکیلا تو نہیں تھا، اس کے اردگرد گارڈز اور رانی جان کے ملازم تھے۔ مدراسی گارڈز اس غیر متوقع اُفتاد سے بے طرح بوکھلائے۔ انہوں نے رائفلوں کے کندوں سے پرندوں کو مارنے کی کوشش کی۔ ایک گارڈ نے کئی فائر بھی کر دیے۔ کئی پرندے شاہ زیب پر جھپٹ پڑے تھے۔ وہ اپنا چہرہ اور سر دونوں بازوؤں میں چھپا کر قریب کھڑی وین میں گھس گیا۔ دس پندرہ طوطے ان گارڈز پر پل پڑے تھے جنہوں نے انہیں نقصان پہنچایا تھا۔ اس افتاد نے ہر طرف بھگدڑ مچا دی۔ گارڈز نے کئی اور راؤنڈ چلائے مگر اس سے کیا ہوتا...... چند پرندے مرے ہوں گے مگر وہ تو امڈتے ہی چلے آ رہے تھے۔

دو پرندے وزنی پتھروں کی طرح جون سے ٹکرائے۔ ایک پرندہ میری گردن کے عقبی حصے سے چمٹ گیا۔ میں نے اسے کھینچ کر زمین پر پٹخا اور پاؤں تلے مسلا۔ جس مدراسی گارڈ نے پہلا فائر کیا تھا، اس کے جسم سے قریباً

درجن طوطے چیختے ہوئے تھے، کئی ایک کی چونچیں گارڈ کے خون سے سرخ ہورہی تھیں۔ وہ گھاس پر گرا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور وہ کوئی اکیلا اس حالت میں نہیں تھا۔ کئی افراد اسی حالت میں تھے۔ میں نے جون کو بھی دیکھا جو اپنا سر اور چہرہ بازوؤں میں چھپا کر ٹیکسی میں پناہ لینے کے لیے بھاگا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیر جیسا درندہ بھی چڑیوں کے غول میں پھنس جائے تو مارا جاتا ہے کچھ دشمنوں پر طاقتور ترین لوگوں کا بس بھی نہیں چلتا۔ جو بدترین بھگدڑ یہاں مچی تھی، اس میں خوف کے علاوہ بے پناہ حیرت کا عنصر بھی شامل تھا۔ بدحواس گارڈز پرندوں پر فائر کرتے تھے جواب میں وہ مزید مشتعل ہوجاتے تھے۔

میرا ذہن گواہی دینے لگا کہ یہ وہی حیوانی خطرہ ہے جس کی بُو شاہ زیب اور قسطینا مسلسل محسوس کررہے تھے۔

دفعتاً مجھے لگا کہ ہمارے لیے قدرت نے یہ ایک بہترین موقع فراہم کیا ہے، میں نے ایک مدراسی کی گری ہوئی کلاشنکوف اٹھائی اور زینوں کی طرف بھاگا۔ میں نے دیکھا درجنوں جنونی طوطے اس کھڑکی سے سر ٹکرا رہے تھے جہاں ہمارے ساتھی بند تھے...... یقیناً وہ قسطینا کے جسم اور لباس کی بُو پر جھپٹ رہے تھے۔ اور شاید پہلوان حشمت بھی خطرے میں تھا۔ میں زینے پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا۔ ہماری نگرانی کرنے والے دونوں مقامی گارڈز میرے چلائے پہلے برسٹ سے ہی ڈھیر ہوگئے۔ میں نے ایک گارڈ کی جیکٹ سے مقفل کمرے کی چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ گارڈز کی دونوں رائفلیں بھی میں اندر لے آیا تھا۔

گراسی لان اب بالکل خالی نظر آرہا تھا، طوطوں پر فائر کرنے والے دو گارڈز کی لاشیں اوندھی سیدھی پڑی تھیں۔ ان کے جسم سے بوٹیاں نوچ لی گئی تھیں، چہرے لہولہان تھے۔ آٹھ دس مردہ طوطے بھی گھاس پر پڑے تھے...... باقی اب اوپر بڑے جھنڈ کی صورت میں چکرا رہے تھے جیسے اپنے اصل شکار کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ پہلوان حشمت کا جسم لرزاں تھا البتہ وہ خود کو باہمت دکھانے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد قریباً تین چار سو پرندوں کے اس جھنڈ نے پرواز کرتے ہوئے رانی جان کی کوٹھی کا ایک چکر لگایا اور شمال کی طرف اوجھل ہوگئے۔

قریباً ایک منٹ انتظار کے بعد قسطینا نے کہا۔ ”تابش صاحب! میرا خیال ہے کہ اب نکلنا چاہیے۔“ اس کا سرخ و سپید چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ مرنے والے دونوں گارڈز کی رائفلوں میں سے ایک میں نے قسطینا اور دوسری انوش کو تھما دی تھی۔

کمرے میں بچی ہوئی دو آخری اگربتیاں قسطینا نے پہلوان کے کوٹ کی پاکٹ میں رکھ دی تھیں۔ ہم زینے اترے، اس دوران میں سیاہ وین میں پناہ لینے والے شاہ زیب اور رانی جان کے کارندوں کے درمیان فائرنگ شروع ہوچکی تھی۔ ہم نے بھی مختلف جگہوں پر پوزیشن لے لی۔ یہاں سے نکلنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم کسی طرح شاہ زیب کے پاس وین تک پہنچ جاتے۔ اندازہ یہی ہورہا تھا کہ وین کی چابی اگنیشن میں ہی ہے مگر فائرنگ شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔

یکایک میرے ذہن میں آیا کہ میڈم مرینہ یہاں موجود ہے۔ اسے یہاں جون جیسے جانور کے شکنجے میں چھوڑ کر جانا ممکن نہیں تھا۔

گولیاں ہمارے دائیں بائیں دیواروں اور ستونوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ شاہ زیب اب وین کی اوٹ میں ہوگیا تھا اور فائرنگ کا جواب دے رہا تھا۔ میں نے انوش سے کہا۔ ”تم اور قسطینا اسی پوزیشن پر رہو، میں ابھی آتا ہوں۔“

انوش کی تیز نگاہیں بھانپ گئیں، وہ بولا۔ ”بادشاہو، یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ کی یہاں زیادہ ضرورت ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ انہوں نے مرینہ کو کہاں رکھا ہے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ میں اسے نکال کر لاسکتا ہوں۔“

ابھی ہمارے درمیان بات ہورہی تھی کہ ایک منظر نے مجھے اور انوش کو بُری طرح چونکایا۔ ہمیں یاد تھا کہ مرینہ نے کون سا لباس پہن رکھا ہے۔ اس لباس کی ایک جھلک ہمیں محرابی دروازوں والے دالان میں نظر آئی۔ مرینہ ایک ستون کی اوٹ میں تھی۔ معلوم نہیں وہ ان لوگوں کے شکنجے سے کیسے نکلی تھی، اس نے اسٹیشن وین کی اوٹ سے شاہ زیب کو فائرنگ کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہم سب اسی طرف ہیں۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ وہ ہماری طرف آنا چاہ رہی ہے۔ اگر ایسا تھا تو خطرناک تھا۔ گولیاں اب تابڑتوڑ برس رہی تھیں۔

میں نے پکار کر مرینہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مرینہ اپنی اوٹ سے نکلی اور بُری طرح لنگڑاتی اور ڈگمگاتی ہوئی ہماری طرف بڑھی۔

انوش نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ سینے کی پوری طاقت سے چنگھاڑا۔ ”نہیں مرینہ......نہیں......“

پتا نہیں کہ آواز اس تک پہنچی یا نہیں لیکن مدراسی

گارڈز کی چلائی ہوئی دو تین گولیاں اس تک ضرور پہنچ گئیں۔ میڈم مرینہ لڑکھڑا تو پہلے ہی رہی تھی...... اوندھے منہ ماربل کے فرش پر گری۔

انوش ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر دوڑتا ہوا اس کی طرف گیا۔ گولیاں اس کے آس پاس سے گزری ہوں گی۔

قسطینا بولی۔ ''تابش صاحب! وہ اسے ریسکیو کرنا چاہ رہا ہے۔ یہ خطرناک ہے۔''

ہم اب انوش کی ہیجانی پیش قدمی تو روک نہیں سکتے تھے...... ہاں اپنی فائرنگ سے اسے کچھ کور (COVER) ضرور دے سکتے تھے۔ ہم نے شدت سے فائرنگ کی اور انوش میڈم مرینہ کو بازوؤں سے کھینچ کر ایک محفوظ اوٹ تک لے آیا پھر اس نے میڈم مرینہ کو کندھے پر لادا اور دوسرے ہاتھ سے اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا ہم تک پہنچ گیا۔

میں، قسطینا، پہلوان اور ماہین دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ مرینہ کی بس دو چار سانسیں ہی باقی ہیں۔ وہ انوش جٹ کی گود میں تھی۔ وہ اس کے بال سہلا رہا تھا۔ خون آلود ماتھا چوم رہا تھا۔ ''نہیں مرینہ جانا نہیں۔ نہیں مرینہ، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہم سب کو ضرورت ہے۔''

لیکن جانے والے اس طرح رکتے تھوڑا ہی ہیں۔

میڈم مرینہ کریکٹر کے لحاظ سے جو بھی تھی مگر ہمارے لیے ایک بے لوث مددگار اور ہمدرد کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہمیں الوداعی نظر سے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

میں نے کلاشنکوف انوش کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ مجھے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اٹھے گا اور اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا مدراسی گارڈز اور رانی کے کارندوں کی طرف لپک جائے گا۔

اس نے غیظ و غضب کی انتہا کو چھو کر فرش پر مُکّے برسائے اور دہاڑیں مار کر رونے لگا۔ اس کے زخمی بازو کی بینڈیج سے خون باقاعدہ ٹپکنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ کسی ایک عورت کا بن کر رہنے والا نہیں تھا مگر مرینہ اس کے لیے خاص اہمیت رکھتی تھی۔ کاروبار ہو، دشمنی ہو یا قانونی پیچیدگیاں میڈم نے ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ یکایک ہم پر ہونے والی فائرنگ نے مزید شدت اختیار کی، فائرنگ کا اینگل بھی خطرناک ہو گیا۔ مدراسی گارڈز دالان کی چھت پر پہنچ گئے تھے۔ شاہ زیب اور قسطینا کے علاوہ میں نے بھی اپنی پوزیشن تھوڑی بدل لی۔ قسطینا سرتاپا ایک فوجی کمانڈر ہی نظر آتی تھی۔ اس کی فائرنگ کا انداز نہایت کارگر اور متاثر کن تھا۔ باقی تینوں لڑکیوں زانی، ماہین اور راشدہ کو قسطینا نے اپنی اوٹ میں رکھا ہوا تھا اور وہ بڑی حد تک محفوظ تھیں۔

ہم نے جس کمرے کے سامنے پوزیشن لے رکھی تھی، اچانک اس کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکیوں میں سے کوئی چلایا۔ میں نے اور قسطینا نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔ یہی لمحہ تھا جب اوپر تلے دو فائر بھی ہوئے۔ میں نے دیکھا راشدہ راجانی کسی شخص سے لپٹی ہوئی ہے اور وہ شخص اپنی گن راشدہ کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا۔ یہ وہی تھا جو صرف تین چار گھنٹے پہلے مجھے لان میں دیگر ملازمین کے ساتھ نظر آیا تھا۔

میرے دماغ میں چنگاری سی چھوٹ گئی۔ مجھے یاد آ گیا۔ یہ میڈم مرینہ کے زرعی فارم کا وہی ملازم ڈرائیور تھا جس نے ایک رات نشے میں دھت ہو کر راشدہ راجانی پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی تھی اور اس جرم کی پاداش میں انوش جٹ نے افضل نامی اس شرابی ڈرائیور کے ہاتھ میں تین گولیاں اتار دی تھیں۔ اس کا ہاتھ تقریباً ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔

انوش سے سزا پانے کے بعد مجھے اس وقت بھی اس شخص کی آنکھوں میں عجب سی کمینگی اور عداوت نظر آئی تھی۔

اب یہی شخص گوٹھ نوشیر اور واشک سے بہت دور یہاں رانی جان کے ملازموں میں شامل تھا۔ یہاں بھی یہ شاید ڈرائیوری وغیرہ ہی کرتا تھا مگر اس وقت وہ ہرگز محض ایک ڈرائیور نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عداوت کی لپک اور ہاتھ میں گن تھی۔ بالکل چھوٹی نال کی یہ امریکن گن نہایت جدید شمار ہوتی تھی اور یقیناً قیمتی بھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ یہ اس شخص نے یہیں کہیں سے پکڑی تھی۔

یہ سارے خیالات پلک جھپکتے میرے ذہن سے گزر گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں کی پوری صورت حال کا نقشہ ذہن کے پردے پر چمک گیا۔ یقیناً اس شخص نے گھات لگا کر انوش پر پشت سے حملہ کرنا چاہا تھا...... راشدہ نے یہ منظر دیکھا تو تڑپ کر اس شخص کے سامنے آئی، اس کی رائفل پر ہاتھ ڈالنا چاہا۔ اس نے دو گولیاں راشدہ کے جسم میں اتار دیں۔ ایک گولی راشدہ کی شہ رگ اور دوسری سینے پر لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ مکروہ شخص دوبارہ انوش پر گولی چلاتا، انوش اُڑتا ہوا سا اس پر جا پڑا۔ وہ پہلے ہی غیظ و غضب کے طوفان میں ایک تنکے کی طرح بہہ رہا تھا۔ راشدہ کو فائر لگنے والے واقعے نے جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر ڈالا۔ اس نے ایک ہی کوشش میں وہ ''ریٹلر'' نام کی امریکن گن افضل کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس کے بعد وہ اس وقت

پر افضل پر گولیاں برساتا رہا جب تک میگزین خالی نہیں ہو گیا۔ افضل کا چہرہ پہچانے جانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ گردن اور کندھوں کے بھی چیتھڑے اُڑ گئے تھے۔ ایسی ہی لاشیں ہوتی ہیں جن کا چہرہ تدفین سے پہلے دیکھنے کے لائق نہیں ہوتا۔

تب وہ راشدہ کی طرف مڑا۔ راشدہ ... وہاں نہیں تھی۔ وہ کہیں دور جا چکی تھی۔ شہ رگ میں لگنے والی بلیٹ کا اینگل ایسا تھا کہ وہ گردن چیرتی ہوئی اوپر سر کی طرف چلی گئی تھی۔

انوش اٹھا اور دیوانوں کی طرح اس گن کی طرف مڑا جو میں نے کچھ ہی دیر پہلے اس سے چھین کر ایک طرف رکھی تھی۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ ”زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اُڑا دوں گا سب کو...... راکھ بنا دوں گا کنجری رانی جان تیرے اس کنجر خانے کو......“

میں اور قسطینا اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ یہاں سے نکلا تو خود بھی مارا جائے گا۔ قسطینا اسے روکنے کے لیے اس سے لپٹ گئی۔ پھر پہلوان حشمت نے بھی آگے بڑھ کر اسے اپنے مضبوط شکنجے میں لے لیا۔

سردیوں کی یہ مختصر شام، بڑی تیزی سے اندھیرے میں بدل چکی تھی۔ اس کی ایک وجہ گہرے بادل بھی تھے۔ تاریکی میں ہر طرف چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں اور دھماکے تھے۔ یہ چنگاریاں اس پگھلے سیسے کی تھیں جو زندگیاں چھینتا ہے۔ شاہ زیب اسٹیشن ویگن کو ریورس کرتا ہوا عین اس جگہ لے آیا جہاں ہم نے ایک دیوار اور ستونوں کی آڑ لے رکھی تھی۔ یہی وقت تھا جب ایک بار پھر تاریک فضا میں بہت سے پرندوں کی شائیں شائیں گونجی اور وہ کوٹھی کے در و دیوار سے ٹکرائے۔

شاہ زیب نے پکار کر کہا۔ ”اندر آجائیں۔“

انوش اب بھی ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ قسطینا نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے پسٹل کے دستے کا جچا تلا وار انوش کی گردن کے پچھلے حصے پر کیا۔ یہ وار شدید نہیں تھا مگر اس میں کمال درجے کی ایکوریسی تھی۔ یوں لگا کہ اگر وہ خالی ہاتھ سے بھی ضرب لگاتی تو شاید انوش اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکتا۔ وہ میرے اور پہلوان کے بازوؤں میں جھول گیا۔ اب ہم انوش سمیت جھک کر تیزی سے چلتے ہوئے اسٹیشن ویگن میں داخل ہوئے۔ میں نے سلائڈنگ دروازہ سرعت سے بند کر دیا پھر بھی تین چار جنونی پرندے اندر گھس آئے۔ ایک نے پہلوان حشمت کی کمر سے بوٹی نوچی۔ دوسرا ماہین سے چمٹ گیا۔ یہ جنگلی طوطے اب صرف پرندے نہیں تھے، موذی درندے تھے۔ انہیں مارنے اور کچلنے میں ہمیں خاصی کوشش کرنا پڑی۔

پرندوں کے اس دوسرے حملے نے جہاں ہمیں متاثر کیا تھا وہاں ہم پر گولیاں برسانے والوں میں بھی افراتفری مچائی تھی۔ سچ کہتے ہیں آدم خور شیر اور چیتے جیسے جانور بھی شہد کی چھوٹی چھوٹی مکھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ پرندے بھی تو اب شہد کی مکھیوں کی طرح ہی تھے بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر۔ یہ موقع ہمارے لیے غنیمت تھا۔ شاہ زیب نے شاید پورے کا پورا ایکسلریٹر دبا پا تھا۔ ویگن زمین سے ایک ایک فٹ اچھلتی اور لہراتی ہوئی رانی جان کی کوٹھی سے نکلی اور سڑک پر آتے ہی مزید رفتار پکڑ گئی۔ بارش اب بند تھی مگر بہاولپور کی سڑکیں گیلی تھیں اور سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ ٹریفک بالکل کم تھا۔ شاہ زیب مشاقی سے ویگن کو دوڑاتا چلا گیا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ جنونی پرندے ہمارا پیچھا چھوڑ چکے تھے۔ ان کے جھنڈ کا ایک حصہ اب بھی ہمارے پیچھے تھا۔ وہ گاہے بگاہے ویگن کی سائڈوں اور عقبی اسکرین سے ٹکرا رہے تھے۔ ویگن کی کھڑکیوں میں گولیوں کے کم و بیش آٹھ سوراخ تھے لیکن غنیمت تھا کہ کوئی شیشہ مکمل طور پر ٹوٹا نہیں تھا۔ زاتی نے تیزی سے اپنی پھولدار شال کے ٹکڑے کیے، ماہین اور قسطینا نے یہ ٹکڑے ان سوراخوں میں اس طرح گھسا دیے کہ سرد ہوا کی آمد بند ہو گئی۔

پھر شاہ زیب کے کہنے پر قسطینا نے ایک اور کام کیا۔ جو دو اگر بتیاں اب تک اس کے پاس تھیں اس نے سلگا کر گاڑی کے دروازوں کی درزوں میں ٹکا دیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہم شہر کی حدود سے باہر نکل آئے تھے مگر پرندوں کی موجودگی ابھی تک ثابت ہوتی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ تعداد اب کم ہو گئی تھی۔ جب کوئی پرندہ گاڑی سے ٹکراتا تو یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ زندہ طوطا نہیں بلکہ کوئی پتھر تھا۔ ایک ایسا پتھر جو گاڑی کے کسی بھی نقصان زدہ شیشے کو چکنا چور کر سکتا تھا۔

یہ بڑے مخدوش لمحے تھے، ہمیں پولیس کے تعاقب کا اندیشہ بھی تھا مگر ابھی تک خیریت ہی گزر رہی تھی۔

”انوش کیسا ہے؟“ شاہ زیب نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

”بے ہوش ہے، لیکن گہری بے ہوشی نہیں۔ ایک گھنٹے سے پہلے ہی ہوش میں آجائے گا۔“ میرے بجائے قسطینا نے جواب دیا تھا۔

انوش کے پہلے زخموں سے بھی ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا

جسے پہلوان حشمت تشویش ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

سب گم صم تھے۔ ابھی تک کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم میڈم مرینہ کے علاوہ راشدہ راجانی کو بھی کھو چکے ہیں۔ وہی راشدہ جسے ہم بس کے ذریعے واپس جانی بھیجنے پر اصرار کرتے رہے تھے مگر اس نے ہماری اور اپنے علاقے کے عام لوگوں کی حفاظت کے لیے واپس اپنے شوہر گرومستان کے پاس جانے سے انکار کردیا تھا۔ اس کی عمر مرنے کی نہیں تھی لیکن قربانی دینے والے اپنی ذات کے فائدے خسارے کہاں دیکھتے ہیں۔ ان کے سینوں میں دھڑکنے والے پُرجوش و نایاب دل انہیں ہر نفع نقصان سے بیگانہ کردیتے ہیں...... وہ چلی گئی تھی۔ اس نے انوش جٹ کو ایک بھائی کا درجہ دیا تھا اور ایک بہن ہی کی طرح اس پر جان نچھاور کردی تھی۔ گرومستان سے جدا ہوکر وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ گرو کے ساتھ رہ کر وہ کتنا بڑا گناہ کررہی ہے۔ ہم نے اس میں بہت خوبیاں دیکھی تھیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اسے خدمت کرکے اور دوسروں کو اچھا کھلا پلا کر ایک انجانی خوشی ملتی تھی۔ اس کی یادیں مختلف ذائقوں کی صورت میں بھی نہ جانے کب تک ہمارے ساتھ رہتیں۔

یکایک میں چونک گیا۔ مجھے لگا کہ وہی ہوا ہے جس کا ڈر تھا۔ ہم ہائی وے پر تھے اور ایک گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے آرہی تھی، ہماری ہی رفتار سے، ہوا میں اُڑتی ہوئی، دائیں بائیں سے بھاری گاڑیوں کو اوورٹیک کرتی ہوئی۔

شاہ زیب نے بھی یہ دیکھ لیا تھا۔ ''کون ہوسکتا ہے؟'' وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔

''وہی باسٹرڈ جون اور اس کے مدراسی...... یا پھر پولیس۔'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی گن سے نیا میگزین اٹیچ کرلیا۔ قسطینا بھی پوری طرح الرٹ نظر آنے لگی۔ یکایک وین میں موبائل کا میوزک گونجا۔ یہ ماہین کا موبائل تھا جو اس نے تلاشی میں بچالیا تھا اور اب اس کی جرسی کی جیب میں تھا۔ اس نے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔ اسپیکر آن تھا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے ماہین کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی بُری طرح چونکا دیا۔ یہ کسی اور کی نہیں عمران کی آواز تھی۔ جو بہت آتشیں اور اجنبی سی تھی۔

''ہیلو...... ہیلو......'' اس نے بار بار کہا۔

ماہین نے جواب نہیں دیا۔ اُس کے رخسار زرد ہو گئے تھے۔ بس سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

اس کو خاموش پا کر وہ بولا۔ ''جانتا ہوں کہ تم راز سب جانتا ہوں۔ اگر سمجھتی ہو کہ تم خاموش رہو گی اور ہمیں جواب نہیں دینا پڑیں گے تو اس کو بھول جاؤ...... میں تمہاری وجہ سے قاتل بنا ہوں، قانون کا مجرم ٹھہرا ہوں۔ تمہاری وجہ سے، صرف تمہاری بے وفائی کی وجہ سے...... اور بے وفائی کا لفظ تو بہت چھوٹا ہے تیری جیسی ''گندے ذہن والی'' کے لیے۔''

ایک دم اس کی آواز کچھ مزید آتشیں ہوگئی۔ ''معاف نہیں کروں گا تجھے، نہیں چھوڑوں گا۔ میری نہیں ہوئی ہو تو کسی اور کی بھی نہیں ہونے دوں گا۔''

''کیا کہہ رہے ہو عمران۔ تم ہوش میں نہیں ہو۔'' وہ بولی۔

''اب ہی تو ہوش میں آیا ہوں۔ مار ڈالوں گا تجھے۔ یہی سزا ہے تجھ جیسی کی اور اگر سمجھتی ہے نا کہ وہ دونوں تجھے بچا لیں گے تو یہ بھی بھول جا...... وہ نہیں بچا سکیں گے۔'' (یقیناً اشارہ میری اور شاہ زیب کی جانب تھا)

''عمران...... عمران......'' ماہین چلائی۔

''سمجھو اب نہیں رہا عمران۔ مر گیا وہ جو تیرے لیے ترستا تھا۔ اب دو گولیاں ہیں میرے پاس۔ ایک تیرے سر میں اتارنے کے لیے اور دوسری شاید اپنے سر میں اتاروں گا۔ میں آرہا ہوں...... تیرے پیچھے۔''

اس کے آخری دو لفظوں نے مجھے بُری طرح ٹھٹکایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں آنے والی گاڑی کی رفتار طوفانی تھی۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا، یہ عمران ہی ہے۔ وہی عمران جو اب اپنے ہوش و حواس میں نہیں۔ بقول شاہ زیب کسی کے مہلک ٹرانس میں ہے۔

فون بند ہوچکا تھا۔ ماہین چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکیوں سے رونے لگی۔ ''عمران یہ کیا ہوگیا تم کو؟ تم ایسے تو نہ تھے۔ تمہارے دل میں تو پیار کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ کہاں کھو گئے تم؟''

میری نگاہ ماہین کی دائیں ہتھیلی پر پڑی۔ وہاں کون مہندی سے چھوٹا سا ''آئی ایم آر'' لکھا ہوا تھا۔ عمران کے نام کے پہلے حروف۔ کتنی حسین آرزوئیں چمکتی رہتی تھیں ماہین کی شفاف آنکھوں میں۔ اور اب یہی عمران ایک خونی دشمن کی طرح ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ ایسا خطرناک دشمن جو میں نے آج تک نہ دیکھا۔ وہ ہمیں مار سکتا تھا، ہم اُسے نہیں مار سکتے تھے۔

تابش اور شاہ زیب کی یکجائی میں خطرناک کھیل کے سنسنی خیز واقعات کا ماجرا اگلے ماہ پڑھیں

سونے اور چاندی کی [illegible] کوئی اہمیت نہیں... اہم بات یہ ہے کہ ان دھاتوں سے [illegible] چیزیں بنانے والے کے ہاتھ سونے کے ہوں... ایسے ہی ایک [illegible] حکمت جو نہایت مشتاقی سے جڑی بوٹیوں سے [illegible] کر رہا تھا... ایک ہی وقت میں دو بیماریاں [illegible] اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر...

دوسروں کی ضرورت پوری کرنے والے معالج کا کاری وار......

# زہریلا مقتول

بشریٰ امجد

اس کی آنکھیں موٹے رخساروں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ تاہم آنکھیں ہر تفصیل کا جائزہ لینے کے قابل تھیں۔ دروازے پر جو بڑا سا نام تھا لکھا تھا...... اس نام میں اس کے لیے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہاں ''خواجہ'' لکھا تھا۔ ساتھ ہی کونے میں سیاہ رنگ سے جو لکھا تھا، وہ دلچسپی کا باعث تھا۔

''مشکل امراض کی ادویات۔''

وہ زیرِلب مسکرایا۔ دروازے پر دباؤ ڈالا اور اندر داخل ہو گیا۔ دکان زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اعجاز نے جائزہ لیا۔ ایک دیوار کے ساتھ پرانی کرسی خالی پڑی تھی۔ کرسی کے پیچھے جو کھڑکی تھی، اس میں سلاخیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اعجاز نے آگے بڑھ کر کھڑکی میں جھانکا۔ اندر ایک سانولا سا جوان آدمی سفید کپڑوں میں بڑے سے لیجر پر جھکا ہوا قلم گھسیٹ رہا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا کوئی دکان میں آیا ہے۔ اس نے لیجر سے سر اٹھایا۔ اس نے خوشگوار انداز میں سر ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

''یس؟''

''میرا نام اعجاز احمد ہے۔''
''اعجاز؟'' اس نے ناشناسائی کے ساتھ اعجاز کا نام لیجر پر لکھا۔ پھر آہستگی سے لیجر بند کیا۔ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ ''اعجاز؟''
''ہاں، اعجاز۔ تم نے پہچانا نہیں؟''
''نہیں، میں کیا کرسکتا ہوں؟''
''اچھا، مجھے منیجر سے ملوا دیں۔'' اعجاز نے کہا۔
''میں ہی منیجر ہوں۔'' وہ بولا۔
''تمہارا نام پرویز ہے؟''
''ہاں۔''
''حیرت ہے۔'' اعجاز بڑبڑایا۔ اس کے چہرے پر کشمکش تھی۔ ''تم سلیم کو نہیں جانتے؟''
وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ ''سلیم کہاں رہتا ہے؟''
''وہ پی آئی سوسائٹی گلستانِ جوہر میں رہتا ہے۔ لنگڑا کے چلتا ہے۔ اسی نے میرے بارے میں بتایا ہوگا۔ دکان کا پتا بھی اسی نے دیا تھا۔'' اعجاز نے بے چینی سے کہا۔
پرویز نے اداکاری کرتے ہوئے کان کھجایا۔ ''اوہ اچھا وہ لنگڑا...... وہ تم کو کیسے جانتا ہے؟''
''میں وہیں دوسرے بلاک میں رہتا ہوں۔'' اعجاز نے اطمینان کی سانس لی۔
''یہاں تو دوائی ملے گی۔ جو تم کہیں سے بھی لے سکتے ہو؟'' پرویز نے سوال کیا۔
''ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں توقع کر رہا تھا کہ میری ملاقات کسی عمر رسیدہ آدمی سے ہوگی۔'' اعجاز نے کہا۔
پرویز نے آنکھیں سکیڑیں۔ ''میرے پیارے دوست کے دوست۔ مجھے بھی عمر رسیدہ سمجھو۔ میں نے برسوں اپنے باپ کے زیرِ نگرانی کام کیا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے کافی تحقیقی کام کیا ہے۔ لہٰذا مجھے بوڑھا ہی سمجھو۔ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔ ادھر سائڈ سے اندر آجاؤ۔''
اعجاز چھوٹا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندرونی کمرا بیرونی کے مقابلے میں بھرا بھرا سا تھا۔ دیواروں پر شیلف بنے ہوئے تھے۔ شیلف چھوٹی بڑی بوتلوں، جارز اور شیشیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف بڑا سا سنک اور کیمیکلز رکھے ہوئے تھے۔ کسی پر لیبل لگا تھا جبکہ بعض بغیر لیبل کے تھے۔
پرویز نے کرسی جھاڑ کر اعجاز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا۔ ''میں نے والد مرحوم سے سیکھنے کے علاوہ اپنے طور پر نئی تحقیقات کے ذریعے مزید ادویات دریافت کیں۔ جن کی معلومات صرف مجھ تک محدود ہیں۔ یہاں ہم اطمینان سے پرائیویٹ گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ سلیم نے متعارف کرایا ہے تو یقیناً تم کسی پیچیدہ مرض کا شکار ہو۔ کھل کر بتا سکتے ہو۔''
اعجاز کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ''میں مریض نہیں ہوں۔'' وہ بولا۔
''کیا مطلب؟ پھر کیوں آئے ہو؟''
''مجھے کچھ خریدنا ہے۔ تم میری مطلوبہ چیز فروخت کرو گے اور میں چلا جاؤں گا بس اتنی سی بات ہے۔''
''اعجاز میاں، یہ شاپنگ سینٹر نہیں ہے۔ یہاں تمہیں دوا مل سکتی ہے۔ مشورہ مفت ہوگا۔ یاد رکھو میں اسپیشلسٹ ہوں۔ میں پوری معلومات کے بغیر قدم نہیں بڑھاتا۔ میرے پاس مختلف نوعیت کے کیس آتے ہیں۔ بعض فیملی سے متعلق ہوتے ہیں۔ مریض خود نہیں آتا۔ اگر ایسا ہے تو مریض کے بارے میں بتاؤ...... یا پھر کوئی شناسا ہوگا۔''
اعجاز کا منہ بن گیا۔ ''دونوں باتیں ہیں۔'' وہ بولا۔
''دو؟'' پرویز نے کان کھجایا۔ ''کہیں پروجیکٹ پر کام کر رہے ہو؟'' اس نے دلچسپی سے اعجاز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
''تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔'' اعجاز نے غصہ دبایا۔
''کیوں نہیں ہونا چاہیے۔'' پرویز نے تیزی سے کہا۔ ''میں یہاں جھک نہیں مار رہا ہوں۔ طریقے سے بات کرو، ورنہ جا سکتے ہو۔ مجھے کام کرنا ہے۔'' پرویز نے دوبارہ لیجر کھول لیا اور قلم اٹھا کے لکھنا شروع کر دیا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ وہاں تنہا بیٹھا ہے۔
اعجاز جھنا گیا۔ وہ خاموشی سے پرویز کو گھورتا رہا۔
''ٹھیک ہے۔'' بالآخر اس نے کہا۔ ''تمہارے طریقے سے بات کرتے ہیں۔''
''آہ......'' پرویز نے سر اٹھایا۔
''لیکن یہ معاملہ سیکرٹ ہے۔ سلیم نے کہا تھا کہ میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں۔''
''اس نے درست کہا تھا۔'' پرویز مسکرایا۔
''میں نے دو کی بات کی تھی۔ ایک میری بیوی ہے۔ نسرین۔'' اعجاز نے کہا۔ ''اس کی عمر چھبیس سال ہے۔ تین سال پہلے ہم نے محبت کی شادی کی تھی۔ سمجھ رہے ہو؟''
''محبت کی شادی۔ سمجھ رہا ہوں۔ مبارک ہو۔ لیکن...... کیا دوسری بھی بیوی ہے؟ اور دونوں مریض کیسے ہو گئیں۔ ویسے محبت خود ایک مرض ہے۔''
اعجاز نے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ وہ سمجھ گیا

تھا کہ اس کا واسطہ ایک قدرے ٹیڑھے آدمی سے پڑ گیا ہے۔ لیکن اعجاز کو اس کی ضرورت تھی، اس کو اعجاز کی نہیں۔ دوسرے سلیم نے یقین دلایا تھا کہ اس کا کام یہاں سے ہو جائے گا۔

''دوسری بیوی نہیں، دوسرا مرد ہے۔''

''اوہ، اب میں سمجھا۔''

''کیا سمجھے؟'' اعجاز نے سوال کیا۔

''یہی کہ تمہیں دوا کی ضرورت نہیں ہے۔'' پرویز دوبارہ مسکرایا۔

''ہاں مجھے وہ چاہیے۔''

''وہ کیا؟ اب تو کھل جاؤ۔''

''ہاں، مجھے زہر درکار ہے۔'' اعجاز نے کہا۔ ''ایسا زہر جس کا بعد میں سراغ نہ لگایا جا سکے۔''

''ڈیئر مسٹر اعجاز، تم مرڈر کی کتابیں پڑھتے رہے ہو۔ جن میں آلۂ قتل زہر ہوتا ہے۔ ایسا زہر جو پوسٹ مارٹم میں ٹریس نہ ہو سکے۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ اتنا سادہ نہیں ہے جتنا محسوس ہوتا ہے۔''

''ہونہہ......'' اعجاز کے چہرے پر ہلکی سی مایوسی نظر آئی۔

''لیکن......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''فکر نہ کرو۔'' پرویز نے ہاتھ اٹھایا۔ ''میں کچھ نہ کچھ کروں گا۔ کیا نام بتایا تم نے اپنی بیوی کا...... ہاں نسرین۔ بلکہ نسرین اعجاز۔ مجھے بتاؤ نسرین کھانے میں کیا پسند کرتی ہے؟''

''کھانے میں؟'' اعجاز سوچ میں پڑ گیا۔

''ایسی چیز جس کی وہ زیادہ شوقین ہو؟'' پرویز نے وضاحت کی۔

''ہاں وہ ڈنر میں سلاد ضرور لیتی ہے۔ ڈنر خواہ کچھ بھی ہو۔'' اعجاز نے جواب دیا۔

''گڈ!'' پرویز چہکا۔

''گڈ؟''

''ہاں، ویری گڈ۔ اب یہ بتاؤ وہ دوسرا آدمی تمہارے گھر آتا ہے؟''

''ہاں، ہر ہفتہ ڈنر پر۔ ہم ڈنر ساتھ کرتے ہیں۔ میرا بس نہیں چلتا کہ اسے گولی ماردوں دونوں کو۔''

''وہ رشتے دار ہے؟'' پرویز نے سوال کیا۔

''ہے کوئی، آگے بات کرو۔''

''کیا وہ بھی سلاد لیتا ہے؟''

''نسرین کڑوے کریلے کھائے گی تو وہ مردود بھی کریلے کھائے گا، سمجھے؟''

زبیلا مقتول

## سیاست داں اور تقریر

سیاست داں (ڈاکٹر سے) ''ڈاکٹر صاحب! میں جب بھی تقریر کرتا ہوں، تو میرا جسم کانپنے لگتا ہے۔''

ڈاکٹر۔ ''کوئی بات نہیں جھوٹ بولتے وقت ایسا ہو ہی جاتا ہے۔''

☆☆☆

## ماں کا حکم

پیریڈ کے دوران ٹیچر نے بچوں سے پوچھا۔

''بتاؤ تم میں سے کون کون جنت میں جائے گا؟''

سب بچوں نے ہاتھ کھڑا کیا۔ لیکن ایک بچے نے ہاتھ کھڑا نہیں کیا۔

ٹیچر نے بچے سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی! کیا تم جنت میں جانا پسند نہیں کرو گے؟''

بچہ معصومیت سے بولا۔ ''سر! میری امی نے کہا تھا کہ اسکول کے بعد سیدھے گھر آنا کہیں اور گئے تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔''

حیدرآباد سے کمیل زاہد کا عذر

''سمجھا...... ویری ویری گڈ، تم ڈنر میں سلاد لیتے ہو؟''

''کبھی، کبھی۔'' اعجاز نے جواب دیا۔

''اس ہفتے تم بھی لازمی لوگے۔ کام ہو گیا۔ سمجھے؟''

''نہیں سمجھا۔'' اعجاز الجھ گیا۔

''کام آسان ہو گیا ہے۔'' پرویز نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''بس تم نے یاد رکھنا ہے کہ ڈنر پر ان دونوں کے ساتھ تم بھی سلاد استعمال کرو گے۔''

''پھر کیا ہو گا؟'' اعجاز کی الجھن برقرار تھی۔

''صبر سے بیٹھو۔'' پرویز نے کرسی چھوڑ دی۔ ''ابھی آیا۔''

وہ عقب میں اسٹور نما چھوٹے کیبن نما کمرے میں چلا گیا۔

اعجاز نے انگڑائی لے کر اطراف میں نظر دوڑائی۔

چند منٹ بعد پرویز واپس آ گیا۔ دو چھوٹی شیشیاں اس نے میز پر رکھ دیں۔ ایک کا رنگ سرخ اور دوسری کا نیلا تھا۔ دونوں کے اندر سیال بے رنگ تھا۔

''سرخ رنگ کی شیشی میں جو زہر ہے، یہ میں نے کبھی سے بنایا ہے۔ کیسے اور کیونکر، وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

''ذائقہ کیسا ہے؟'' اعجاز نے سوال کیا۔

"یہ ذائقہ ہے۔" پرویز نے کہا۔ "سرخ شیشی کا سیال تمہیں سلاد میں ڈالنا ہے۔ سادہ عمل ہے۔ یہ خود پوری طرح سرائیت کر جائے گا۔"

اچانک اعجاز کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ "لیکن میں کیسے استعمال کروں گا؟"

پرویز نے دانتوں کی نمائش کی۔ "بہتر ہے کہ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔ غور سے سنتے رہو۔ جب تین افراد ڈنر کریں گے۔ ڈنر کے بعد دو مر جائیں گے اور ایک سلامت رہے گا۔ لازمی پولیس بچ جانے والے پر شک کرے گی لیکن اگر تیسرا مرنے کے بجائے بیمار ہو جائے گا تو ایسی صورت میں اسے بہت زیادہ مشکوک نہیں سمجھا جائے گا۔ پوائنٹ یہ ہے کہ مسٹر اعجاز کہ تم مرنے کے بجائے علیل ہو جاؤ گے اور علاج کے بعد صحت یاب۔"

"میں نہیں سمجھا۔" اعجاز کی آنکھوں میں سوال تھا۔

پرویز نے نیلے رنگ کی شیشی اٹھائی۔ "آخر یہ کس لیے ہے؟" وہ بولا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ تریاق ہے۔" پرویز نے فخر سے کہا۔ "غیر معمولی اور کمال ہے۔ زہریلی سلاد کھانے سے پہلے تم اسے پی لینا۔ کھانے سے کم از کم چھ گھنٹے پہلے لینا ہوگا۔ تم ہر قسم کے شک و شبہے سے بالاتر رہو گے۔ جب تم سلاد استعمال کرو گے اس وقت تک تریاق کی ہر علامت تمہارے جسم سے غائب ہو چکی ہوگی۔ البتہ وہ اپنا کام کرے گا۔ تم بیمار ہو جاؤ گے۔"

"اور زہریلے سلاد کی علامات؟" اعجاز نے سوال اٹھایا۔

"میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ میں اسپیشلسٹ ہوں۔ ڈنر کرنے والوں کے بدن سے کوئی مائی کا لال کچھ بھی ٹریس نہیں کرسکتا۔" پرویز نے دونوں شیشیاں اعجاز کے آگے کر دیں۔ "لاؤ نکالو چالیس ہزار روپے۔"

"کیا؟ چالیس ہزار؟" اعجاز کا منہ کھل گیا اور آواز خود بخود بلند ہو گئی۔ "اتنی سی دوا کے چالیس ہزار؟"

پرویز کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ "مسٹر یہ دوا نہیں ہے...... یہ نایاب زہر اور تریاق کہیں سے نہیں ملے گا۔"

"تم لوٹ رہے ہو۔" اعجاز نے میز پر ہاتھ مارا۔

"لوٹ رہا ہوں؟ جاؤ کہیں اور سے خرید کے اپنا مسئلہ حل کرو۔" پرویز نے بے زاری سے کہا۔

"ادھر دیکھو۔" اعجاز کا دماغ گرم ہو گیا۔ "میں کسی کی چیز ہزاروں میں نہیں خریدتا۔ مجھے کیا معلوم۔ ہو سکتا ہے ان میں سادہ پانی بھرا ہو؟"

"واہ، بہت خوب۔" پرویز نے تالی بجائی۔ "ایسا کرو کہ سرخ شیشی سے پانی پی لو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"میں کاروباری آدمی ہوں۔ ایسا کچھ نہیں کروں گا بلکہ کاروباری ڈیل کروں گا، پچاس ہزار کیش لے کر نہیں گھوم رہا ہوں۔ پانچ ہزار ابھی دوں گا اور کام ویسا ہوا جیسا کہ تم بتا رہے ہو تو بقیہ رقم بھی ادا کر دوں گا۔ سلیم کی وجہ سے تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔"

پرویز نے پُرسوچ انداز میں ایک طویل وقفہ لیا پھر بولا۔

"یہ میرے کاروباری اصولوں کے خلاف ہے۔ کیا یاد کرو گے پہلی مرتبہ اصول شکنی کر رہا ہوں۔" گویا پرویز نے حامی بھری۔ "لیکن پانچ نہیں دس ہزار۔"

اعجاز نے جیب میں ہاتھ ڈال کر والٹ نکالا پھر دو پانچ ہزار کے نوٹ پرویز کے ہاتھ پر رکھ دیے اور دونوں شیشیاں اٹھا لیں۔

دونوں ایک ساتھ بیرونی کمرے میں آئے۔ باہر نکلتے ہوئے اعجاز نے سائن بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں "خواجہ" لکھا تھا۔

"خواجہ پرویز، تم ہو؟"

پرویز نے نفی میں سر ہلایا۔ "اصل مالک میرے والد مرحوم خواجہ مقصود، میں صرف پرویز ہوں۔ ایک بھائی تھا وہ کم عمری میں فوت ہو گیا تھا۔ میں نے یہ نام نہیں بدلا۔"

"ہونہہ...... پھر ملیں گے۔" اعجاز نے ہاتھ ملایا۔

"خدا حافظ دوست۔" پرویز نے کہا۔

سڑک پر گاڑی کی طرف جاتے ہوئے اعجاز مسرور تھا۔ وہ سیٹی بجاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ پچاس ہزار میں دو شفاف مرڈرز، سودا بُرا نہیں تھا۔

دوسری طرف پرویز اپنی جگہ پر خوش تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دوبارہ اعجاز شکل نہیں دکھائے گا۔ زندہ رہے گا تو ملے گا۔ پرویز کو علم تھا کہ اعجاز خود بھی کوئی باوفا شوہر نہیں تھا۔ دس ہزار خواہ مخواہ مل گئے تھے۔

پرویز نے سرخ اور نیلی شیشیوں کی غلط تشریح کی تھی۔ زہر نیلی شیشی میں تھا۔ وہ سر ہلاتا ہوا میز پر آیا اور لیجر کھولا۔ چند صفحے پلٹ کر اس نے مخصوص ریکارڈ میں چند روز پہلے کی تاریخ کو دیکھا۔ وہاں لکھا تھا۔

"خاص خدمت کے پچاس ہزار وصول پائے۔"

نام کی جگہ نسرین اعجاز لکھا تھا۔ نام کے نیچے نسرین اعجاز یا اعجاز کا پتا لکھا تھا۔ میاں بیوی کا پتا ظاہر ہے ایک تھا۔ ☘☘☘

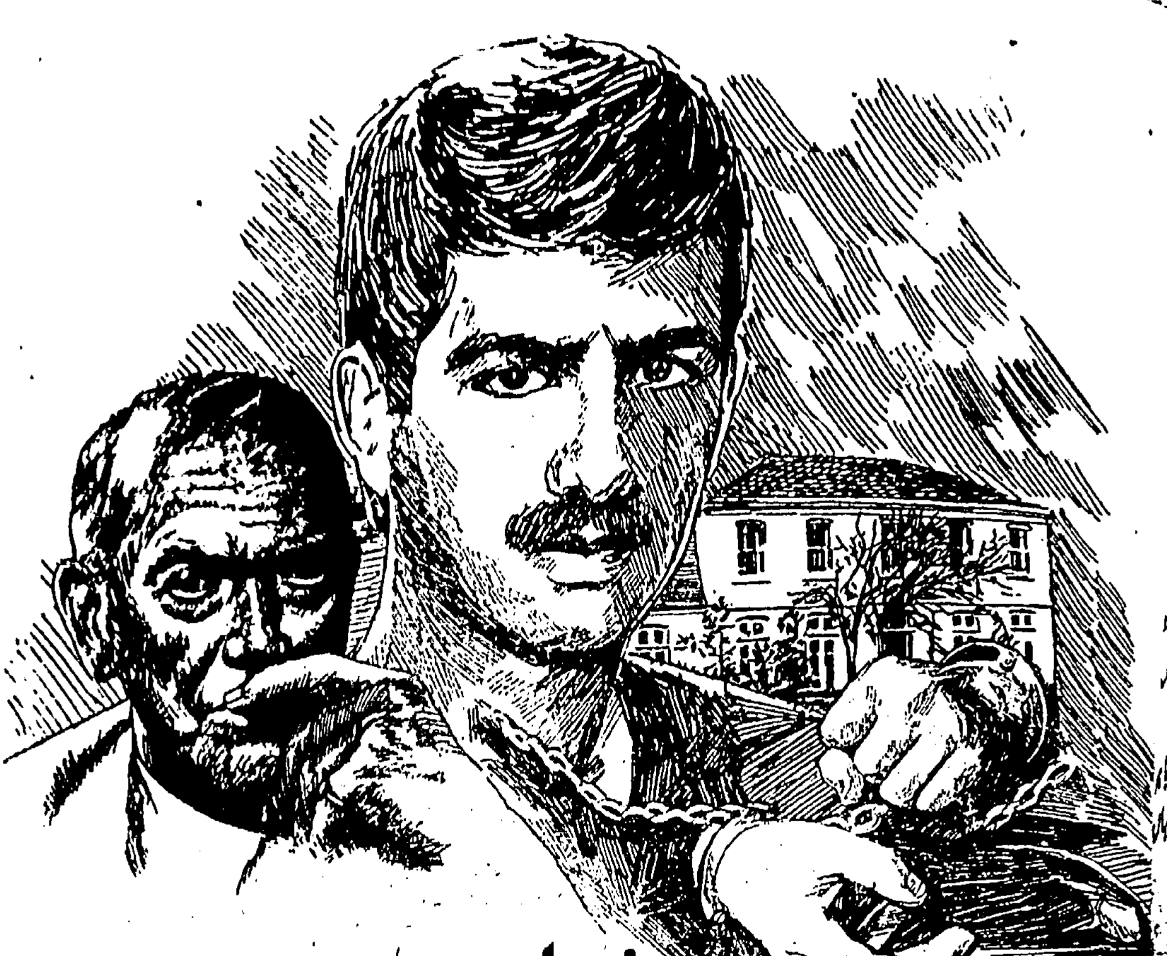

# خدائی فوجدار

**جاوید بسام**

ہر عمل کا ردِعمل ضرور سامنے آتا ہے... جو اکثر ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے... انصاف کے کٹہرے میں فیصلے سنانا بھی ایک ایسا ہی عمل ہے... ایک جج کے فیصلوں کے نتیجے میں رونما ہونے والا سنگین ردِعمل... ایک طرف جج کی نرم مزاجی تھی... وہ موت کی سزا کے حق میں نہ تھا... جان بخشی کے فیصلے کے بعد اس کے اندر عجیب سی کیفیت طاری تھی... ایسا لگتا کہ اس کے اندر کوئی چیز بے چین ہے... ابل رہی ہے... تڑپ رہی ہے... باپ کی اس کیفیت نے بیٹی کو درد و پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا...

پرتجسس...... سنگین جرم کے پیچھے چھپی حقیقت کا سنسنی خیز انکشاف......

نومبر کی ایک کہر آلود دوپہر کو جب ہم اپنے فلیٹ میں آتش دان کے پاس بیٹھے تھے، سولر پونز نے کہا۔ ''انصاف، آج کل ایک نایاب مظہر بن چکا ہے۔ اس لیے نہیں کہ لوگ اسے چاہتے نہیں، بلکہ اس لیے کہ اب اس کی مناسب تعریف ڈھونڈنا دشوار ہوگیا ہے۔ میں اس معاملے پر کچھ یقین سے بات کرسکتا ہوں۔ کیونکہ مملکت کے ایک جج کو بھی اس مسئلے نے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ پارکر، کیا تم فیلڈنگ انسٹرودر نام

نے کسی جج سے واقف ہو؟"
"ہاں، بالکل۔" میں نے بغیر سوچے جواب دیا۔
"یہ بھی جانتے ہو کہ تم نے اس نام کا شخص ... طور پر
ان للوعرض واقعوں کے سلسلے میں دیکھا ہو جو ...
سزائے موت کے خاتمے کے لیے چھپتی رہتی ہیں۔ ...
فیلڈنگ ... ایک جج ہیں اور اگر ان کی بیٹی کی
بات درست ہے تو آج کل سخت ذہنی کرب میں مبتلا ہیں۔
اس معاملے کی اطلاع مجھے تمہارے آنے سے کوئی آدھا گھنٹا
پہلے ملی ہے۔" پونز نے کہا۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لفافہ کھولا اور مکتوب پڑھنے لگا۔

"محترم جناب پونز!
میں چند روز کے لیے لندن میں مقیم ہوں اور اس دوران یہ گستاخی کر رہی ہوں کہ آپ سے ایک ایسے معاملے میں گفتگو کی اجازت چاہتی ہوں جو میرے والد کے لیے باعث تشویش ہے۔ ان کا نام فیلڈنگ السٹرور ہے، اور وہ شہر راس میں ایک جج ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ مقدمات کے فیصلوں کے بعد جو کچھ پیش آیا ہے، اس نے انہیں گہری پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آپ اس خط کے حامل کو جواباً انکار نہ کریں، تو میں آج سہ پہر چار بجے آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو جاؤں گی۔
مخلص، وائلٹ السٹرور۔"

میں نے نظریں اٹھا کر کہا۔ "انتہائی دلچسپ پیغام ہے۔"
"بالکل۔" پونز نے اتفاق کیا۔ "اور یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مس السٹرور جن 'عجیب واقعات' کا ذکر کر رہی ہیں، ان کی بازگشت عوام تک بھی پہنچی ہوگی۔ میں نے اخبارات کھنگال ڈالے ہیں، لیکن اس موضوع پر کوئی واضح اشارہ نہیں ملا کہ آخر جج صاحب کو کیا چیز پریشان کر رہی ہے۔ ہاں، نیوز آف دی ورلڈ کے ایک ہفتے پرانے شمارے میں یہ مختصر خبر ضرور تھی۔"

یہ کہہ کر اس نے اخبار اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ "پرسی ڈکسن کی موت۔"

آج صبح راس، ہارٹ فورڈ شائر میں پرسی ڈکسن کی لاش برآمد ہوئی۔ مسٹر ڈکسن حال ہی میں ہنری آرچر کے مقدمے میں ملوث تھے، جسے چھ ماہ قبل قتل کیا گیا تھا۔ متوفی کی لاش اس کے دفتر میں ملی۔ ڈکسن کو شواہد کی کمی کے باعث بری کر دیا گیا تھا۔ اس مقدمے کی سماعت جج فیلڈنگ ... کی تھی۔"

"میرے خیال میں اس میں دلچسپی ... ہو"
"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔
"مجھے بھی یہ نہایت دلچسپ لگتا ہے۔" پونز نے کہا۔
"ہماری متوقع مہمان نے اپنے خط میں واضح طور پر جج کے عہدے میں لکھا ہے۔" پونز نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "چار بجنے میں ... ہے۔ آؤ تب تک اپنے ... کو دیکھ لیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے پرسکون انداز میں انتظار کرنے لگا۔ میں نے اخبار پڑھنی دوڑائی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ گھنٹی بجی اور مس جانسن ایک نوجوان خاتون کو کمرے میں لائیں۔ وہ تقریباً تیس برس کی گہری سیاہ، پرعزم چمکتی آنکھوں اور پرکشش چہرے والی حسینہ تھی۔

"مسٹر پونز؟" اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام وائلٹ السٹرور ہے۔"

"تشریف لائیے، مس السٹرور۔ ڈاکٹر پارکر اور میں آپ کا انتظار کر رہے تھے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے لیے کرسی آگے کی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور گلے سے لپٹی ہوئی فر کی بو آہستہ سے اتار دی۔ اس کی گھبراہٹ ہاتھوں کی بےقراری سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"میں بڑی مشکل میں ہوں، مسٹر پونز۔" اس نے کہا۔ "اگر میرے والد کو علم ہو گیا کہ میں آپ کے پاس آئی تھی تو وہ سخت ناراض ہوں گے۔ وہ نہایت باوقار مگر اپنے پیشے، یعنی قانون اور انصاف کے معاملے میں حد سے زیادہ اصول پرست انسان ہیں، اسی باعث وہ اکثر کسی بھی ایسی بات سے ناراض ہو جاتے ہیں جو انہیں غیر معمولی محسوس ہو۔"

"آپ نے اپنے خط میں 'عجیب واقعات' کا ذکر کیا تھا۔" پونز نے کہا۔ "اور اب بھی آپ انہی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ کیا آپ کے والد نے خود آپ سے بھی اس بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں مسٹر پونز، معاف کیجیے کہ میں نے بیچ میں بات کاٹی۔ یہی تو اصل مسئلہ ہے۔ کئی ماہ سے میرے والد راتوں کو بےچینی سے اپنے کمرے میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی بھوک مٹ گئی ہے، نیند اُڑ چکی ہے اور وہ روز بروز کمزور اور پژمردہ ہوتے جا رہے ہیں۔"

"بعض اوقات...... وہ اس قدر غیر معمولی انداز میں پیش آتے ہیں کہ انہیں یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ ہم ان سے

بات کر رہے ہیں۔''

''ہم؟'' پونز نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''میری مراد ہے، میں اور میری پھوپھی، سوسن آنٹی، جو ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ والد صاحب کا وزن نمایاں طور پر گھٹ گیا ہے اور جب میں ان سے پریشانی کا سبب دریافت کرتی ہوں تو وہ بس ایک بے دلی سی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ اپنے دل کی بات کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ میں نے ان سے براہِ راست تو کچھ نہیں پوچھا، لیکن اگر وہ بتانا چاہتے تو ضرور بتا چکے ہوتے۔ ابتدا میں، میں سمجھی شاید معاملہ مالی نوعیت کا ہے، مگر بعد میں احساس ہوا کہ ایسا نہیں۔ میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ ان کی دولت بالکل محفوظ ہے، آمدنی میں ایک پیسے کی بھی کمی نہیں آئی۔ والدہ کی وفات پر ہمیں خاصی قیمتی میراث ملی تھی۔ ان کی روزمرہ کی عادات میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی، سوائے ان چند باتوں کے جو میں پہلے عرض کر چکی ہوں۔ اس لحاظ سے میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کی نجی زندگی میں کوئی خاص تغیر رونما نہیں ہوا۔ نہ ڈاک میں کوئی غیر معمولی خط آیا، نہ ہی ان کی حلقے سے باہر کسی سے ملاقات ہوئی۔ وہ صرف انہی رفقائے کار سے ملتے ہیں جنہیں بچپن سے جانتے ہیں۔ اس لیے، مسٹر پونز، میں یہ اندازہ لگانے پر مجبور ہوں کہ ان کی پریشانی ان مقدمات سے متعلق ہے جن کی وہ کبھی سماعت کر چکے ہیں، شاید ان کے فیصلوں کے بعد پیش آنے والے حالات نے انہیں مضطرب کر دیا ہے۔''

''اوہ، تو ڈکسن وہ واحد شخص نہیں جو آپ کے والد کے سامنے پیش ہونے کے بعد مر گیا؟'' پونز نے اچانک سوال کیا۔

''جی نہیں جناب، وہ آخری تھا، تیسرا، اگر درست گنا جائے۔ سب سے پہلی ہیسٹر اسپرنگ۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے بچے کا گلا گھونٹا تھا۔ مگر والد صاحب چونکہ نہایت منصف مزاج انسان ہیں، اس لیے انہیں یہ امکان نظر آیا کہ شاید یہ واقعہ حادثاتی ہو۔ چنانچہ انہوں نے بریت پر اصرار کیا۔ رہائی کے ایک ماہ بعد وہ خود مردہ پائی گئی۔ جیوری نے نتیجہ نکالا کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ وہ شراب پیے ہوئے تھی اور غالباً اپنے بستر میں دم گھٹنے سے چل بسی تھی۔''

''اور دوسرا؟'' پونز نے پوچھا۔

''الجی فوسٹر۔ کوئی آٹھ ماہ پہلے اس نے مسٹر کارٹر کو اپنی گاڑی سے کچل دیا تھا۔ اسے چار ماہ قید اور جرمانے کی سزا ہوئی۔ رہائی کے بعد وہ خود ایک حادثے میں مارا گیا۔ ایک کار نے اسے سڑک پار کرتے وقت ٹکر مار دی، جب وہ مے خانے جا رہا تھا۔ اس گاڑی کے ڈرائیور کا کبھی سراغ نہیں ملا۔''

''اور ڈکسن؟''

''اسے دل کا عارضہ لاحق تھا۔''

''اور وہ کس الزام میں ملوث تھا؟''

''مسٹر آرچر اپنی ہی دکان میں زخمی ہوئے اور لوٹے گئے۔ لگتا ہے کہ وہ مزاحمت کر رہے تھے، تبھی ان کے سر پر کسی سخت چیز سے وار کیا گیا۔ وہ اسپتال میں دوسرے ہی روز چل بسے۔ راس کے تقریباً سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ڈکسن ہی قاتل ہے، مگر والد صاحب نے محسوس کیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک بار پھر 'بری' کا فیصلہ سنایا۔ مجھے معلوم ہے، مسٹر پونز، یہ کچھ عورتوں جیسی باتیں معلوم ہوتی ہیں، مگر میں نے ہر پہلو پر غور کیا ہے اور ان تین واقعات کے سوا کسی اور ربط یا وجہ کا سراغ نہیں پایا اور یہ بھی غالباً محض اتفاق ہی ہے۔''

''واقعی؟'' پونز نے زیرِ لب کہا۔ ''دلچسپ۔ مس انسٹرور، کیا آپ نے یہ واقعات اسی ترتیب سے گنوائے ہیں جس ترتیب سے وہ پیش آئے تھے؟''

''جی ہاں، مسٹر پونز۔'' اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کے لہجے میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔'' پونز بولا۔

''جی...... دراصل میں نے کہا کہ ہیسٹر اسپرنگ سب سے پہلے مری، پھر الجی فوسٹر، اور آخر میں پرسی ڈکسن۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میرے والد نے سب سے پہلے ڈکسن کا مقدمہ سنا تھا، اس کے بعد فوسٹر کا، اور آخر میں اسپرنگ کا۔''

پونز کچھ دیر خاموش رہا۔ ہماری مہمان نے مؤدبانہ سکوت اختیار کیا، مگر اس کی نظریں غور سے پونز کے نحیف چہرے پر جمی رہیں۔ وہ شاید اس کے ذہن میں دوڑتے خیالات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخرکار پونز نے آنکھیں کھولیں اور نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ سب واقعات راس ہی میں پیش آئے تھے؟''

''جی ہاں، مسٹر پونز۔''

''مگر آپ کے والد بہ حیثیت جج مملکت کے دوسرے حصوں میں بھی تو جاتے ہیں؟''

"یقیناً، مسٹر پونز۔"
"کیا ان دوسرے مقامات پر بھی ایسے واقعات پیش آئے ہیں؟"
"میرے علم میں تو نہیں ہیں۔"
"عجیب بات ہے......" پونز نے آہستہ سے کہا۔
"بے حد عجیب۔"
"مسٹر پونز، کیا آپ مجھے اپنے خیال سے آگاہ کریں گے؟"
"میں تسلیم کرتا ہوں، مس انسٹرور کہ آپ کی بیان کردہ باتوں نے میری دلچسپی بڑھا دی ہے اور مجھے خاص طور پر متوجہ کیا ہے، مگر چونکہ آپ کے والد خود اس معاملے کو اتنی احتیاط سے چھپا رہے ہیں، مجھے خدشہ ہے کہ ان سے بالمشافہ ملاقات اتنی آسان نہ ہوگی۔"
"کل وہ راس کی عدالت میں بیٹھیں گے۔ ایک شخص پر مقدمہ ہے جو اپنی بیوی کو اذیتیں دیتا رہا۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ والد صاحب اس کے لیے نرم گوشہ نہیں رکھیں گے۔ اگر آپ چاہیں اور ڈاکٹر پارکر بھی۔" اس نے میری طرف بڑی دلکش مسکراہٹ سے دیکھا۔ "تو میں آپ دونوں کو اپنے گھر کل دوپہر کے کھانے پر مدعو کرتی ہوں۔ وہاں آپ والد صاحب سے بالمشافہ ملاقات کر سکیں گے۔"
پھر وہ پونز سے مخاطب ہوئی۔
"مجھے یقین ہے کہ آپ کا نام خاصا معروف ہے۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو شاید آپ کا کسی اور نام سے جانا بہتر ہوگا مثلاً کنگز کالج کے پروفیسر موریاٹی کے نام سے۔" وائلٹ انسٹرور نے کہا۔
پونز کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "شاندار تجویز۔"
"پیڈنگٹن سے ٹرین صبح نکلتی ہے، مسٹر پونز۔ آپ دوپہر تک راس پہنچ جائیں گے۔ میں آج خود آخری ٹرین سے شام کو روانہ ہوں گی۔"
مہمان کو رخصت کرنے کے بعد پونز پھر عادتاً آتش دان کے سامنے جا بیٹھا۔ کچھ دیر وہ آنکھیں موندے اپنی نفیس انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کیے گہری سوچ میں گم رہا۔ پھر اچانک اس نے نظریں اٹھائیں۔
"پارکر، تمہارا اس سارے قصے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
میں نے کہا۔ "قدرت اپنا [illegible] لیا کرتی ہے۔ شاید یہ جملہ کچھ گھسا پٹا لگے مگر میرا ایمان ہے۔"
پونز نے نیم مسکراہٹ کے ساتھ [illegible] دیا۔ "ہاں

ہے مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھار ہمیں اپنے فیصلے میں شریک ہونے کی چھوٹی سی اجازت دے دیتی ہے۔"
"پونز! تم یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہے ہو؟" میں نے بےیقینی سے کہا۔ "یہ سب محض اتفاقات کا سلسلہ بھی ہو سکتا ہے۔"
"میں تمہاری بات سے انکار تو نہیں کر رہا۔" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ تینوں شاید ان بہت سے لوگوں میں سے ہیں جو جج انسٹرور کے عدالتی رحم و احتیاط کی بدولت سزا سے بچ نکلے۔ ان کے اس خوف سے کہ کہیں کسی بے گناہ کو سزا نہ دے بیٹھیں، اور وہ سب، میرا گمان ہے کہ آج بخیر و عافیت زندہ ہیں۔"
"یہ معقول بات ہے۔"
"مجھے امید ہے کہ مجھ میں کچھ عام فہم باقی ہے۔" پونز نے ہلکے طنز سے کہا۔ "لیکن اگر جج انسٹرور یہ نہیں مانتے کہ یہ سب محض قدرت کی مشیت ہے تو؟"
"میں نے دیکھا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اکثر جج صاحبان خود کو خدا کی مشیت سے خلط ملط کرنے لگتے ہیں۔" میں نے کہا۔
پونز کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "خیر، خیالی اُڑانوں پر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فی الحال ہمارے پاس حقائق بہت کم ہیں۔ اگر تمہاری اہلیہ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کل تم میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"

☆☆☆

اگلے دن کی صبح ہم نے دریائے سیورن کے نیلے پانیوں کو عبور کیا اور جلد ہی راس پہنچ گئے۔ ایک ایسا دلکش قصبہ جو خوش قسمتی سے ابھی صنعتی آلودگی سے پوری طرح محفوظ تھا۔ مس انسٹرور ہمیں پلیٹ فارم پر ملی۔ اس کی کل والی گھبراہٹ بالکل زائل ہو چکی تھی۔ جب وہ ہمیں لے کر اس ہوٹل پہنچی، جہاں اس نے ہمارے کمرے پہلے ہی بک کروا رکھے تھے تو مسکرا کر بولی۔ "مسٹر پونز! گھر میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی، تاہم آپ آج دوپہر کے کھانے پر والد صاحب سے ملاقات کریں گے۔"
"مس انسٹرور! میں اس ملاقات کا شدت سے منتظر ہوں۔" پونز نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔
ہم نے اپنا سامان ہوٹل میں رکھا اور پھر سب ایک گاڑی میں بیٹھ کر شہر کے مضافات کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں ایک شاندار وکٹورین طرز کا مکان ہمارا منتظر تھا جس کے چاروں طرف آہنی باڑھ تھی۔

''بی اماں، ہم یہاں صرف ایک باورچن کے ساتھ رہتے ہیں۔ آنٹی سوسن اکثر دوپہر کے وقت مقامی اسپتال چلی جاتی ہیں۔ وہ تربیت یافتہ نرس ہیں اور ہم باری باری والد کے کاغذات ٹائپ کرتے ہیں۔'' مس انسٹرودر نے وضاحت کی۔

''کیا ان میں مقدمات کی روداد... بھی شامل ہوتی ہیں؟'' پونز نے تجسس سے پوچھا۔

''جی ہاں بالکل، ان کے لیکچرز اور اخبارات کے لیے خطوط بھی۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ وہ سزائے موت کے سخت مخالف ہیں۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' پونز نے سر ہلایا۔ ''درحقیقت میں اسی موضوع پر آج کھانے کی میز پر بات چھیڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''ہرگز نہیں۔ بلکہ شاید یہی بات انہیں اس مستقل اداسی اور فکر سے کچھ دیر کے لیے نکال لے۔''

پونز نے کمرے میں ایک آرام دہ کرسی پر نظر ڈالی جو صاف ظاہر کرتی تھی کہ مالک مکان کی نشست ہے۔ اس کے پہلو میں کتابوں کا ڈھیر رکھا تھا اور ایک کتاب کھلی ہوئی تھی 'خواب میں چلنے کی حالت اور اس کے اسباب'۔ دیگر تین کتابیں بھی اسی موضوع پر تھیں۔

مس انسٹرودر نے ہماری دلچسپی بھانپ لی۔ ''یہی جگہ ہے جہاں وہ اپنی راتوں کا بیشتر حصہ گزارتے ہیں۔ اگر کمرے میں چکر نہ لگا رہے ہوں۔ مسٹر پونز، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جاسکتی ہے؟''

''ہم دیکھیں گے۔'' پونز نے مختصر سا جواب دیا۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ باقی اہلِ خانہ بھی آگئے۔ وہ دونوں ایک ہی کار میں آئے تھے۔ آنٹی سوسن گاڑی چلا رہی تھیں اور انہوں نے اپنے بھائی کو عدالت سے لیا تھا۔

جج کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی، جب کہ سوسن ان سے کوئی دس برس چھوٹی معلوم ہوتی تھیں۔ دونوں کے چہرے سنجیدہ اور حیرت انگیز طور پر ایک جیسے تھے، طویل، ذرا چوڑے، گھوڑے جیسے خدوخال، مضبوط جبڑے، کشادہ لب اور صاف ستھری چمکدار آنکھیں۔

''پروفیسر موریاٹی؟'' جج انسٹرودر نے تعارف کے وقت دہرایا۔ ''کہیں یہ نام پہلے بھی سنا ہے۔ آپ کس مضمون کے استاد ہیں؟''

''سوشیالوجی۔'' پونز نے سیدھی نظریں ان کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ اس فن میں میرا درجہ ایک معمولی طالب علم سے بہتر نہیں۔''

''جی ہاں۔'' انسٹرودر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''انسان کا اصل مطالعہ تو خود انسان ہی ہے۔''

اس کی بیٹی نے بات بدل دی اور سب کو کھانے کی میز کی طرف بلایا۔

کچھ دیر تک موسم اور عام موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی پھر پونز نے کہا۔ ''جناب، اگر مجھ سے غلطی نہیں ہو رہی تو آپ سزائے موت کے خلاف تحریک میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں؟''

جج کے چہرے پر پہلی بار ہلکی سی مسرت کی جھلک اُبھری۔

''جی ہاں۔'' انسٹرودر نے ہلکے لہجے میں کہا۔

''مگر کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اس معاملے کو آپ جس زاویے سے دیکھتے ہیں، وہ کسی طور فطری نہیں؟'' پونز نے پُرسکون مگر نپی تلی آواز میں کہا۔

انسٹرودر کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ ''کس معنی میں، پروفیسر؟''

دیکھیے، سوال کی بنیاد ہی فطرت کے نظام کے خلاف ہے۔ آپ کمزور اور ناقص عناصر کے حقوق کو برتر مقاصد کے مقابلے میں فوقیت دینے کی بات کرتے ہیں اور یہ، ہمیں کئی دہائیاں پہلے جب مسٹر ڈارون نے سمجھایا تھا کہ فطرت میں صرف وہی بقا پاتا ہے جو موزوں اور طاقتور ہو، اور یہی اصول پوری نوعِ انسانی کی بقا کا ضامن ہے۔'' پونز نے اپنے استدلال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

''ایک نئی تھیوری معلوم ہوتی ہے، میں نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا۔'' مس سوسن نے تبصرہ کیا۔

''نئی؟ ہرگز نہیں۔'' پونز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ یہ تو ایک خاصی عام رائے ہے۔ میں ہمیشہ سے سمجھتا آیا ہوں کہ سزائے موت کے مخالفین، یا اصلاحِ مجرم کے پرستار، دراصل درختوں کو دیکھ کر جنگل سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ایک فرد کو بچانے کے نام پر وہ پوری انسانی سوسائٹی کو قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔''

پھر وہ جج کی طرف مڑا۔ ''مسٹر انسٹرودر! کیا آپ اسے گمراہی یا بدعت سمجھتے ہیں؟''

''میرا خیال ہے، یہی چیز ہے جسے آپ ارتقا کہتے ہیں؟'' جج نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''واہ! پھر آپ اپنے نظریات کو کن الفاظ میں بیان کریں گے؟'' پونز نے خوش دلی سے کہا۔

"پروفیسر! میں تو بس ایک عام سا 'انسان دوست' آدمی ہوں۔"

"اوہ ہاں۔" پونز نے گویا تازہ حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے کبھی نہیں سنا کہ ان انسان دوستوں نے کسی ناکامی کا اعتراف کیا ہو، لیکن ان سب، خواہ آپ انہیں فلاحی کہیں، نفسیاتی ماہر یا سماجیات داں کا اصرار ہمیشہ ایک ہی بات پر رہا ہے کہ ان کے خیالات سب سے زیادہ 'انسانی' ہیں اور باقی تمام نظریات انسانیت کے نازک جذبات کی توہین کرتے ہیں۔ وہ ایک گمراہ 'مجرم' کی اصلاح کے لیے درجن بھر صحت مند انسانوں کو قبر میں اتارنے پر تیار رہتے ہیں۔ محض اس لیے کہ اس ایک مجرم کو دوبارہ تعلیم دی جاسکے... میرا خیال ہے، وہ اسی لفظ کا سہارا لیتے ہیں۔ حالانکہ وہی انسانیت پر سب سے بڑا احسان کریں کہ اگر اسے پہلی ہی فرصت میں سزا دے کر ختم کر دیا جائے۔"

ہمارے میزبان کے چہرے پر حیرت اور غصے کا ملا جلا رنگ ابھرا۔ "جناب عالی، یہ خیالات تو عہدِ وسطیٰ کے معلوم ہوتے ہیں۔"

"پھر نعرے بازی، پھر لیبل چسپاں کرنے کا شوق۔" پونز نے چیخ کر کہا۔ "جج انسٹرڈر، میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اگر ہم انسانی معاشرے کی حقیقی بھلائی چاہتے ہیں تو محض دس فیصد آبادی کو بھی سزائے موت دے ڈالنے سے دنیا بہتر ہوسکتی ہے، بشرطیکہ ہم اخلاقی نعرہ بازی چھوڑ دیں۔"

"یہ تو ظلم عظیم ہے، پروفیسر۔" جج نے گھبرا کر کہا۔ "میں یقین نہیں کرسکتا کہ آپ واقعی سنجیدہ ہیں۔"

"میں اس وقت اپنی زندگی کی سب سے سنجیدہ گفتگو کر رہا ہوں۔" پونز نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس وقت تک ہماری میزبان وائلٹ انسٹرڈر کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہو چکے تھے، جب کہ مس سوسن کے لبوں پر مسکراہٹ کی چمک تھی، جیسے وہ اس فکری تصادم سے محظوظ ہو رہی ہوں۔

اگر پونز کا مقصد جج کو طیش دلانا تھا، تو ماننا پڑے گا کہ وہ پوری طرح کامیاب رہا۔ انسٹرڈر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ جس لمحے پونز کا نظریہ اس پر واضح ہوا تھا، اس نے کھانے کا ایک لقمہ بھی منہ میں نہیں ڈالا تھا۔ تاہم وہ ایک بااصول شخص تھا۔ اس نے اپنے ابھرتے ہوئے غصے کو ضبط میں رکھا۔

پونز جس نے شاید اپنی منزل پالی تھی، اب نرمی سے گفتگو کا رخ بدلنے لگا۔

"بہرحال جناب، آپ اپنے اصولوں کے پابند تھا۔ آپ کے فیصلوں میں ہمیشہ نرمی اور انسان دوستی جھلکتی ہے۔"

جج نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں کوشش کرتا ہوں کہ منصف رہوں۔"

"میرے بھائی ہمیشہ ملزم پر رحم کھاتے ہیں۔" مس سوسن نے قدرے تکلف سے کہا۔

"اور مقتول سے وہ رحم چھین لیتے ہیں۔" پونز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خیر، یہی تو انسانی فطرت ہے، کوئی اپنی قبر میں جھانکنا پسند نہیں کرتا۔"

مجھے لگا کہ جج ابھی کسی لمحے پھٹ پڑے گا۔

میں نے بیچ بچاؤ کے لیے کہا۔ "جناب ہماری پیشہ ورانہ دنیا میں بھی یہی اصول ہے کہ زندگی کو بچایا جائے، نہ کہ مٹایا جائے۔"

مس انسٹرڈر کی نظریں کبھی پونز پر جاتیں، کبھی مجھ پر، پھر والد کی طرف اور آخر میں دوبارہ پونز پر۔ وہ خود بھی الجھی ہوئی تھی، مگر میری طرح اسے بھی امید تھی کہ میرا دوست اب اصل مدعا پر پہنچنے والا ہے۔

گویا ہمارے خیالات پڑھ کر پونز نے یکایک سکون سے کہا۔ "خیر جناب عالی، ہمارے نظریات میں مکمل اختلاف ہے۔ مزید یہ کہ، مجھے ماننا ہوگا کہ میں نے اس موضوع کا مطالعہ اتنی گہرائی سے نہیں کیا۔ البتہ مجھے خواب میں چلنے کے مسائل پر کافی تجربہ ہے۔ کیا آپ کبھی نیند میں چلنے کے عادی رہے ہیں؟"

اس سادہ سے سوال کا اثر حیرت انگیز تھا۔ جج کا چہرا یکایک سفید پڑ گیا جیسے کسی نے اس کی پوشیدہ سوچوں کو بے نقاب کر دیا ہو۔

جج کے چہرے پر غصے کی سرخی یوں مٹ گئی تھی، جیسے کسی اَن دیکھی بارش نے سب رنگ دھو ڈالے ہوں۔ وہ پونز کو گھورنے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"جناب، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

وہ صرف سر جھٹک کر رہ گیا، جیسے میرے الفاظ سنے ہی نہ ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ کرسی پیچھے سرکائی۔ مس وائلٹ انسٹرڈر نے پونز پر ایک نظر ڈالی، ایسی نظر جس میں حیرت بھی تھی اور خوف بھی پھر اپنے والد کی طرف بڑھ گئی۔

جج اسی وقار سے اٹھا، جیسے اپنی گمشدہ شان دوبارہ

پالی ہو اور باضابطہ جھک کر بولا۔ ''معاف کیجیے، حضرات۔''

پھر وقار کے ساتھ چلتا کمرے سے نکل گیا۔ اس کی بیٹی فوراً اس کے پیچھے چلی گئی تھی۔

مس سوسن بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے انداز میں ہلکی سی بے چینی اور ملامت کی جھلک تھی۔ وہ بھی جانے ہی والی تھیں کہ پونز نے انہیں روک لیا۔

''مس سوسن!'' پونز نے کہا۔ ''شاید میں غلطی پر ہوں، مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے خیالات اپنے بھائی سے کچھ مختلف ہیں۔''

خاتون نے ایک لمحہ اسے دیکھا، پھر بولیں ''جی ہاں، مسٹر پونز، میں اپنے بھائی سے مکمل اتفاق نہیں رکھتی۔ کبھی کبھی مجھے تشویش ہوتی ہے کہ لوگ اکثر... کیا کہتے ہیں کہ آپ... 'قانونی موشگافیوں' کے سہارے انصاف سے بچ نکلتے ہیں۔ البتہ، جیسا کہ میرے بھائی اکثر یاد دلاتے ہیں، میں قانون کی تعلیم یافتہ نہیں، لہٰذا بحث میں شاید بھٹک جاتی ہوں۔''

پونز نے نرمی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے درمیان اس اختلاف سے کوئی تلخی پیدا ہوتی ہے؟ یا انہیں آپ کے خیالات کی وضاحت پسند نہیں؟''

''نہیں، ایسا نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ بس نرمی سے یاد دلاتے ہیں کہ انصاف کی نمائندگی وہ کرتے ہیں، میں نہیں۔ اور پھر ہنستے ہوئے کہتے ہیں کہ عورتیں اکثر ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو جاتی ہیں، جیسے میں خود، ہیری کے معاملے میں ہو گئی تھی۔ وہ میرا دوست تھا، بہت قریبی دوست......''

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی اور حرکات میں بے چینی جھلکنے لگی۔ وہ بولی۔ ''فیلڈنگ...... وہ سب کو بس یوں ہی جانے دیتے ہیں۔''

تاہم اس نے خود پر قابو پایا اور پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''معاف کیجیے، مجھے اب چرچ جانا ہے۔''

پونز اور میں کھڑے ہو گئے جب وہ کمرے سے نکل گئیں تو ہم تنہا رہ گئے، میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ ''پونز! میں برسوں سے تمہیں جانتا ہوں، میں نے تمہیں کبھی آج جیسا نامناسب رویہ اختیار کرتے نہیں دیکھا۔''

وہ خاموشی سے سر ہلانے لگا مگر چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

''آہ...... تم اتنی خاموشی سے یہ سب برداشت کر رہے ہو؟'' میں نے غصے سے کہا۔


بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ مارچ 2026ء کی جھلکیاں

**مرجع خلائق**

اس ولی کامل کی داستان جس کے معتقد پوری دنیا میں موجود ہیں

**شہنشاہ**

اس نے ایک چھوٹی سی غلطی کی اور برسرِ حکومت رہتے ہوئے بھی مجبور بنا دیا گیا

**یاد ماضی**

اردو ادب کے ایک صاحب طرز ادیب کی جہدِ مسلسل کی داستان

**باکمال اداکارہ**

فلمی دنیا کی بہت سی حیران کر دینے والی خفیہ باتیں

**ہرجائی**

اس بیوی کا احوال جو شوہر کو دھوکا دیتی رہی عجیب انداز سے، دلچسپ سچ بیانی

اس کے علاوہ

طویل کہانی **جان بچا... شکار کہانی...**
**شکاری کا شکار** اور بھی بہت سی پراثر سچ بیانیاں، دلچسپ سچے قصے، معلومات بھری رودادیں

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

"کیوں نہیں، میں نے سب سچ ہی تو کہا ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

اسی لمحے دروازہ کھلا، مس وائلٹ انسٹر در واپس آئی۔ اس کی آنکھیں بھڑک رہی تھیں اور ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

پونز نے ایک لمحے میں صورت حال کو بھانپ لیا۔

"مس انسٹر در، اگر میری گفتگو آپ کو بدتمیزی لگی ہو تو معافی چاہتا ہوں، لیکن آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ اس کی ٹھوس وجوہ تھیں۔ آپ کے والد اپنی تمام یقین دہانیوں کے باوجود، ان مقدمات کے بارے میں شکوک رکھتے ہیں جن سے آپ واقف ہیں اور جب تقدیر نے ان مجرموں کے ساتھ، جنہیں انہوں نے آزاد کیا، کچھ عجیب انداز میں معاملہ کیا، تو وہ اس گمان میں مبتلا ہو گئے کہ شاید وہ خود نیند میں چلتے ہوئے اسی تقدیر کا آلۂ کار بن گئے ہیں۔ جب میں آج اس کمرے میں داخل ہوا تو میں نے ان کی میز پر خواب میں چلنے کے موضوع پر کچھ کتابیں دیکھیں، تو بس ایک اندازہ لگایا اور وہ ٹھیک نکلا۔"

وائلٹ انسٹر در کرسی پر بیٹھ گئی، چہرے پر شرمندگی اور خوف کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"مسٹر پونز، میں نہیں جانتی کہ آپ سے کیا کہوں...... لیکن مجھے ڈر ہے کہ آپ نے میرے والد کے خدشات کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیے ہیں۔"

"میری عزیز، میں نے ابھی آغاز ہی کیا ہے۔ اگر اجازت دیں تو اپنی تحقیق آگے بڑھانا چاہوں گا، مگر یہاں نہیں۔"

مس انسٹر در فوراً ہال میں گئی جہاں ہمارے کوٹ لٹک رہے تھیں۔ دروازے میں رُک کر پونز نے پوچھا۔

"ویسے، کیا آپ کو علم ہے کہ آپ کے والد کبھی رات کے وقت گھر سے باہر جاتے ہیں؟"

اس کا چہرہ کچھ زرد سا ہو گیا۔ "ہاں، شاید ایک یا دو بار ایسا ہوا ہو۔"

پونز نے اطمینان سے سر ہلایا۔ "آپ کی خالہ چرچ چلی گئی ہیں۔ میرا خیال ہے آج شام کوئی تقریب ہے؟"

"ضروری نہیں مسٹر پونز، میری خالہ گوشہ نشین مزاج کی ہیں، اپنا زیادہ تر وقت رفاہی کاموں، اسپتال اور چرچ میں گزارتی ہیں۔"

پونز نے سوالات جاری رکھے: "میرا خیال ہے مسٹر ڈِکسن کے مقدمے کی تفتیش حال ہی میں ہوئی تھی؟"

"جی مسٹر پونز۔"

"کیا آپ مجھے اس انکوائری افسر کا نام بتا سکتی ہیں؟"

"جی ہاں، ڈاکٹر ایلن کرٹن، کنگز ہیڈ روڈ۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہاں چھوڑ سکتی ہوں۔"

"نہیں، ہم پیدل چلے جائیں گے یا ضرورت پڑی تو ٹیکسی لے لیں گے۔ شکریہ مس انسٹر در۔ بہتر ہے آپ اپنے والد کے قریب رہیں۔ اگر وہ دلچسپی لیں تو آپ ہمارے چھوٹے سے راز کا ذکر کر سکتی ہیں۔"

گھر سے کچھ دور نکل کر میں نے کہا۔ "پونز...... یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ انسٹر در جیسے خیالات رکھنے والا شخص، محض کسی اندرونی وسوسے کے زیرِ اثر، اس طرح کا قتل کر سکے جیسا تم نے بیان کیا ہے۔"

"پارکر! تم خود ایک طبیب ہو، ذرا بتاؤ، کیا طبی نقطۂ نظر سے ایسا خواب میں چلنے والا فعل، یعنی سومنمبولزم کے عالم میں قتل بالکل ناممکن ہے؟" پونز نے خشک لہجے میں کہا۔

"ایسے واقعات گزرے ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ طبی لحاظ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کوئی شخص حتیٰ کہ غنودگی یا تنویمی حالت میں بھی وہ کام نہیں کرتا جس کی جرأت وہ بیداری میں نہ کر سکے۔"

پونز خاموش ہو گیا۔ "میں انسٹر در کے مزاج سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔" اس نے بالآخر کہا اور ہم چپ چاپ ڈاکٹر ایلن کرٹن کے مکان تک پہنچ گئے۔

ڈاکٹر کرٹن ایک خوش مزاج چھوٹے قد کا آدمی تھا، گلابی رخسار، چاندی جیسے بال اور باتونی طبیعت۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مسٹر سولر پونز، راس تشریف لائیں گے۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے ہمیں اندر بلا لیا۔

"دیکھیے ڈاکٹر صاحب۔" پونز نے کہا۔ "مجھے ایک طرح سے چیلنج کر دیا گیا ہے۔ میں پرسی ڈِکسن کے معاملے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔"

"ڈِکسن؟ وہ تو ایک اوباش شخص تھا۔" کرٹن نے بیزاری سے کہا۔

"کیا وہ طبعی موت مرا؟"

"جی ہاں، ہماری تفتیش کے مطابق اس کا ہارٹ فیل ہوا تھا۔"

"کیا کسی تشدد یا چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا؟"

"ذرہ برابر بھی نہیں، الا یہ کہ آپ ان نشانات کی بات کریں جو ہونے چاہیے تھے۔"

پونز نے دلچسپی سے ابرو اچکائے۔ "ڈاکٹر کرٹن وہ کون سے نشانات تھے؟"

''دیکھیے مسٹر پوئرز، وہ اسپتال میں دو دن رہا۔ ظاہر ہے، اسے انجکشن لگایا گیا ہوگا۔''

''صرف ایک ہی انجکشن؟''

''جی ہاں، صرف ایک۔''

''تو غالباً آپ نے اس معاملے کی تحقیق میں اس کا طبی ریکارڈ بھی دیکھا ہوگا؟''

کرٹن مسکرایا۔ ''ابھی تک میرے پاس موجود ہے۔ کیا دیکھنا پسند کریں گے؟''

''یقیناً۔''

ڈاکٹر اپنی کرسی سے اٹھا، پچھلے کمرے میں گیا اور ایک فائل ہاتھ میں لے کر واپس آیا۔ اس نے فائل پوئرز کے سپرد کی۔ وہ غور سے ورق پلٹنے لگا۔

''ہم...... بلڈ پریشر ایک سو بہتر بٹا ایک سو ایک۔ یہ کچھ زیادہ نہیں؟''

''بے شک زیادہ ہے۔'' کرٹن نے سر ہلایا۔ ''لیکن اس کے مزاج اور حالت کے لحاظ سے غیر معمولی نہیں۔ اسے سڑک پر بے ہوش پایا گیا تھا۔ ابتدائی طور پر ہم نے کسی دورے یا حملے کا شبہ کیا۔ نبض ہلکی اڑتالیس۔ سانس لینے میں دشواری۔ آکسیجن اور برف۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بس، وہ نشے میں دھت تھا، مسٹر پوئرز۔ میں نے پہلے ہی کہا، وہ ایک رذیل آدمی تھا۔ دل کا بند ہونا کوئی عجب بات نہیں۔''

پوئرز نے فائل مجھے دے دی۔ میں نے بھی بغور دیکھی، کچھ غیر معمولی نظر نہ آیا۔ وہی عام سا طبی بیان جو ہر اس مریض کے کیس میں لکھا جاتا ہے جو بے ہوشی کی حالت میں لایا جائے، سانس اکھڑا ہوا ہو، نبض بے ترتیب ہو، اور فشارِ خون بلند۔

پوئرز نے پھر سوال کیا۔ ''کیا آپ نے ہیسٹر اسپرنگ کے کیس کی بھی تفتیش کی تھی؟''

''یقیناً'' ڈاکٹر کرٹن نے جواب دیا۔ ''ایک عام واقعہ، خاتون دم گھٹنے سے مری تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا بچہ بھی اسی طرح مرا تھا۔ اس وقت اسے صرف جج انسٹردر کی نرمی کے باعث بری کر دیا گیا۔''

''میری سمجھ کے مطابق، اس کیس میں بھی کسی جرم کا سراغ نہیں ملا؟''

کرٹن نے پُرزور انداز میں نفی کی۔ ''بالکل نہیں۔ کوئی محرک، کوئی نشان، کچھ نہیں۔''

''سمجھ گیا۔''

کرٹن ہنستے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں مسٹر پوئرز، آپ ایک لاحاصل کوشش میں لگے ہیں۔ دونوں واقعات معمولی تھے۔ تفتیش بس رسمی کارروائی تھی، جسے ہم نے پوری احتیاط سے مکمل کیا، مگر اس سے زیادہ کچھ نہ نکلا۔''

نصف گھنٹے بعد ہم واپس ہوٹل سوان پہنچے۔ پوئرز آرام دہ انداز میں بیٹھ گیا اور مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں ڈکسن کی فائل میں کچھ غیر معمولی لگا؟''

''نہیں، کچھ نہیں، بالکل معمول کی کارروائی۔ میں نے سیکڑوں ایسے کیس دیکھے ہیں۔ کسی چوٹ یا خراش کا نشان تک نہیں۔ شاید وہ گرا بھی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور کچھ؟'' پوئرز نے نرم مگر معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''پوئرز، میں نے اپنی زندگی میں ایسی ہزاروں فائلیں دیکھی ہیں۔'' میں جھنجلا اٹھا۔

''تب تو تمہیں انہیں خاص توجہ سے دیکھنا چاہیے تھا۔'' پوئرز نے وہی طنزیہ سکون سے کہا جو ہمیشہ میرے اعصاب پر سوار ہو جاتا تھا، جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ میں نے کوئی اہم بات نظر انداز کر دی ہے۔

مجھے یہ خیال بالکل بے معنی لگا، کیونکہ میں نے ڈکسن کی فائل پوری احتیاط سے دیکھی تھی اور اس کی تفصیلات تقریباً ازبر تھیں۔

پوئرز کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''ایک دلچسپ معما ہے۔ افسوس ہوگا اگر ہمیں اسے ادھورا چھوڑنا پڑا۔''

''آہا!'' میں نے کہا۔ ''ویسے پوئرز، جانے سے پہلے تمہیں جج انسٹردر سے معافی ضرور مانگنی چاہیے۔''

''بالکل میرا ابھی یہی ارادہ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کل ناشتے کے بعد۔ اگر اس وقت تم سو رہے ہوئے تو میں اکیلا راس جا کر چند باتوں کی تصدیق کر لوں گا۔''

☆☆☆

اگلی صبح...... صبح سویرے ہم انسٹردر کے گھر پہنچے۔ دروازہ اس کی بیٹی نے کھولا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے بائیں ہاتھ نے اچانک منہ کو چھوا، جیسے آنے والی چیخ کو دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔

''صبح بخیر، مس انسٹردر!'' پوئرز نے کہا۔ ''اگر میں غلط نہیں تو آپ کے والد گھر پر ہی ہیں؟''

''جی مسٹر پوئرز، وہ آنٹی سوسن کے ساتھ ناشتا کر رہے ہیں۔''

''بہت خوب! مجھے ان سے فوری طور پر بات کرنی ہے۔ کیا آپ نے انہیں ہمارے چھوٹے سے فریب کے بارے میں بتا دیا تھا؟''

''نہیں جناب، میں نے فیصلہ کیا کہ نہ بتاؤں۔''

"کوئی حرج نہیں۔" پونز نے مسکرا کر کہا۔

وہ کچھ جھجکتے ہوئے ایک طرف ہوگئی، مگر پونز بلاتوقف براہِ راست ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔

ہمیں دیکھ کر میزبان نے حیرت چھپانے کی بھی کوشش نہ کی۔ وہ اُٹھنے ہی والا تھا کہ پونز نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "برائے کرم، مسٹر انسٹرڈر، اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ سب سے پہلے، میں آپ سے کل کے رویے پر معذرت چاہتا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے پروفیسر......" جج نے پُرعزم لہجے میں کہنا چاہا، مگر پونز نے بات کاٹی۔ "جناب، میرا نام موریارٹی نہیں۔ میرا نام سولر پونز ہے اور میں پروفیسر بھی نہیں ہوں۔"

یہ نام سنتے ہی جج کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ واضح تھا کہ وہ اس نام سے بخوبی واقف ہے۔ مگر اس کے چہرے پر اب خوف کے بجائے ایک عجب سی راحت کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

"تو اب سب کچھ واضح ہوگیا؟" اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"جی، مگر افسوس کہ شاید ویسا نہیں جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔" پونز نے جواب دیا۔

"پولیس کی تفتیش؟" جج نے سوال کیا۔

"نہیں، نجی تفتیش۔" پونز نے کہا۔

"تو انہیں قتل کیا گیا تھا؟"

"میرے یقین کرنے کی وجوہ ہیں کہ ایسا ہی ہوا، لیکن قاتل کوئی خواب میں چلنے والا شخص نہیں تھا۔ اپنے ضمیر کو پریشان نہ کیجیے، مسٹر انسٹرڈر۔ ممکن ہے دیگر قتل بھی ہوئے ہوں، قتل جو دراصل سزا کے روپ میں لیے گئے، لیکن نئے ممکنہ مجرم قاتل کے ہاتھ نہیں آئے۔ میرا خیال ہے، جب اس نے پہلی بار اپنے شکار کو سزا دی تو اس کے اندر کا انتقام پورا ہوگیا۔"

پونز کی آواز اب سرد اور متوازن تھی۔ "قاتل کو یہ سب حالات بخوبی معلوم تھے، وہ ایسی معلومات تک رسائی رکھتا تھا جو نہ عدالت میں ظاہر ہوئیں، نہ اخباروں میں چھپیں۔ وہ شخص یا تو چرچ کے پہلو میں واقع ہیسٹر اسپرنگ کے گھر میں داخل ہوا، یا پھر اسے بہلا پھسلا کر وہاں لے گیا، اور جب وہ نشے میں تھی، اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اسی نے موقع دیکھ کر ابلی فوسٹر کو گاڑی تلے روند ڈالا، ممکن ہے یہ کام موقع پر ہی کیا گیا ہو۔ اور یہی قاتل تھا جس کے پاس اتنا وقت تھا کہ پرسی ڈکسن کی رگ میں ایک معمولی سی ہوا کا بلبلہ داخل کر دے، ایسا غیر مشکوک عمل جو ظاہری چوٹ کے بغیر موت لے آئے۔"

"نرس!" مس وائلٹ حیرت سے چلائی۔

پونز نے اچانک رخ موڑا کہا۔ "گزشتہ شام جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی بہن عین اس وقت اسپتال میں نرس کے فرائض انجام دے رہی تھیں، جب پرسی ڈکسن کو رہائی ملی تھی، تو میں نے ان کی گاڑی کا بغور معائنہ کرنے کی جسارت کی۔"

"نہیں! سوسن نہیں!" جج انسٹرڈر چیخ اٹھا۔

وائلٹ نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ جبکہ مس سوسن پونز کی طرف ایک تکبر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔

"مسٹر پونز! میری گاڑی پر جو ڈینٹ ہیں، وہ کسی اور وجہ سے بھی ہوسکتے ہیں اور جہاں تک ایمبولزم (رگ میں ہوا کے بلبلے سے موت) کا تعلق ہے، اس کا پتا لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ کسی بھی عدالت میں یہ مقدمہ پیش کریں گے تو جج کے سامنے گھنٹوں دلائل دینے کے باوجود وہ قائل نہ ہوں گے اور مجھے بری کردیں گے۔ برادر فیلڈنگ کیا ایسا نہیں ہے؟" اس نے کہا۔

جج انسٹرڈر اپنی بہن کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے پتھر کی مورت بن گیا ہو۔ وائلٹ بھی خاموش تھی، یقین نہ آتا تھا کہ پونز کا الزام اتنا سنگین ہوسکتا ہے۔

پونز نے نرمی مگر قطعیت سے کہا۔ "مس انسٹرڈر، میرے پاس ثبوت ہیں۔"

سوسن نے آنکھوں میں ہلکی سی چمک کے ساتھ رخ موڑا اور کہا۔ "واقعی؟ ایسے ثبوت جو میرے بھائی کو قائل کرسکیں۔ حالانکہ وہ خود اس مقدمے کی پیروی نہیں کریں گے؟ مجھے شک ہے۔ وہ تو آج بھی یقین نہیں رکھتے کہ ان تینوں کو مرنا چاہیے تھا۔"

"یہ خدا کی مرضی تھی۔" جج انسٹرڈر نے جوش میں آکر کہا۔

"اور آپ اس مرضی کے علمبردار بنے!" اس کی بہن نے چیختے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے ان کی زندگیاں بچائیں اور تم...... تم نے انہیں مار ڈالا!"

"ابھی ثابت نہیں ہوا۔" مس سوسن نے پُرسکون مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی، میرا نہیں خیال کہ مسٹر پونز اپنی تھیوریوں کے ساتھ عدالت میں جائیں گے اگر ان کے

پاس ٹھوس حقائق ہوتے، تو وہ اس کہانی کو ہمارے سامنے [illegible]
آخر بیان نہ کرتے؟ مسٹر پوئرٹ! کہانی غلط کہہ رہی ہو [illegible]"

"اس معاملے کا ایک دوسرا انجام بھی ممکن ہے۔ تنہائی اور نظر بندی۔" پوئرٹ نے متانت سے کہا۔

"یہ انتظام کیا جا سکتا ہے۔" جج انسٹرودر نے بھاری آواز میں کہا۔

"اوہ، نہیں!" وائلٹ نے چیخ کر کہا۔

"لگتا ہے کہ وائلٹ کو ایک سنسنی خیز مقدمے کی توقع تھی......" سوسن نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "دنیا میں پاگل خانوں سے زیادہ باہر پاگل ہیں جو آزاد گھوم رہے ہیں، ایسے جو معصوم دکاندار کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔"

"ہنری؟" انسٹرودر مدھم آواز میں بڑبڑایا۔

"جی ہنری آرچر، ڈکسن کا شکار۔" پوئرٹ نے وضاحت کی۔ "وہی محترمہ سوسن کا عزیز دوست، جس کی موت نے ان کے اندر اس جنون کی چنگاری بھڑکائی اور جس نے انہیں ایک خفیہ جلاد بنا دیا۔"

سوسن کے ہونٹوں پر ایک کڑوی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

"اوہ میری بہن! تم نے کیا کر ڈالا!" جج انسٹرودر کی زبان سے یہ الفاظ سسکنے کے انداز میں نکلے۔

پوئرٹ نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "اجازت دیجیے ہمیں ریل گاڑی پکڑنی ہے۔"

☆☆☆

ہم ریل گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے تھے، جو ہمیں لیے لندن کی طرف دوڑا جا رہا تھا، پوئرٹ نے میری بے توجہی پر تبصرہ کیا۔

"دیکھو یار ہیسٹنگز! اصل اہمیت اس بات کی نہیں تھی جو کیس رپورٹ میں لکھی گئی تھی، بلکہ اس بات کی تھی جو نہیں لکھی گئی تھی۔ کریفن نے انجکشن کے سوراخ کا ذکر تو کیا، مگر رپورٹ میں کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ کون سی دوا دی گئی تھی۔ یہ ماننا مشکل ہے کہ محترمہ سوسن اپنی رپورٹ میں کچھ یوں لکھتی ہوں کہ ایک ہوا کا بلبلہ رگ میں داخل کیا گیا ہے۔"

پھر وہ [illegible] بولا۔ "کوئی بھی ان تینوں کو قتل کر سکتا تھا، مگر سوال یہ ہے کہ ان مجرموں کو جنہیں جج انسٹرودر نے بری کیا تھا، [illegible] کیوں چھوڑ دیا گیا؟ جواب بالکل واضح ہے۔ یہ تینوں صرف اس لیے مارے گئے کہ وہ قاتلہ کی پہنچ کے دائرے میں تھے اور [illegible] کہ جج انسٹرودر عدالت [illegible] دوسرے [illegible]

[illegible]
ملازمت تھا جہاں پر ڈکسن کو داخل کیا گیا۔ البتہ ڈکسن کی موت اچانک جذبے کا نتیجہ تھی، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلے سے سوچا سمجھا جرم ہو۔ میں ذاتی طور پر پہلا امکان زیادہ قریب سمجھتا ہوں، کیونکہ اگر یہ قتل منصوبہ بندی کے ساتھ ہوتا تو مس سوسن کو اس کے گھر پر نظر رکھنی پڑتی جس سے شک پیدا ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے جج انسٹرودر کا 'خواب میں چلنے' والا خوف صرف ایک نقاب ہو، جس کے پیچھے وہ اپنی بہن کے افعال کو چھپانا چاہتے ہوں۔ کیونکہ وہ یقیناً جانتے تھے کہ ان کی بہن ان کے عدالتی نرم مزاجی کے نظریے سے سخت اختلاف رکھتی ہیں۔"

پوئرٹ نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر گویا ہوا۔

"اصلاً یہ معاملہ بہت سیدھا تھا۔ ان تمام مقدمات میں سزائے موت کو معاف کرنے کی واحد معقول وجہ قاتلہ کی اپنی انفرادی تعبیر انصاف تھی۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اکثر ایسے جذبات رکھتے ہیں۔ جب ہمیں لگتا ہے کہ انصاف کا ترازو غلط سمت جھک گیا ہے۔ مگر ہم ان خیالات کو حقیقت میں نہیں بدلتے۔ مس سوسن پر یہ دباؤ برسوں سے تھا، لیکن ہنری آرچر کی موت نے اس دباؤ کو عمل کی چنگاری میں بدل دیا۔ ہم کبھی یہ نہیں جان پائیں گے کہ یہ سب قتل اچانک جنون کا نتیجہ تھے یا سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ممکن ہے اس نے اسپرنگ اور فوسٹر کے قتل صرف اس لیے کیے ہوں کہ ڈکسن کے قتل کو چھپایا جا سکے اور اس قتل کا محرک تو بالکل واضح تھا۔ ہنری آرچر سے اس کی گہری وابستگی، شاید دوستی، یا پھر ایک خفیہ عاشقانہ لگاؤ۔"

یہ کہہ کر پوئرٹ نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "خیر جو بھی ہو، اس واقعے میں ایک نہایت سنگین اخلاقی سبق پوشیدہ ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ انہیں دوسروں کی زندگی بچانے کا خدائی حق حاصل ہے، تو لازمی طور پر کچھ دوسرے لوگ یہ یقین کرنے لگیں گے کہ انہیں دوسروں کو موت دینے کا حق حاصل ہے۔"

سو! پوئرٹ صحیح کہہ رہا تھا۔ میں نے گردن ہلائی اور کھڑکی سے باہر ساتھ دوڑتے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔

❖❖❖

# دلیر

حسام بٹ

**پینتالیسویں قسط**

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید وبند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانہ اسیری نے ایک طرف اس کے دل ودماغ پر صدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحر بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصد حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو مشیت قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزار فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیق سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ٹولہ دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں

کاٹیج کے اندر ہونے والے ساعت شکن دھماکے نے آرکٹک ریجن کی اس بستی میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ برف زار کوہ و دمن لرز کر رہ گئے تھے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ خوابیدہ لانگ ایئربین میں ایک حشر برپا ہوگیا ہو لیکن اصل محشر تو ان دونوں کے اندر بپا ہوا تھا۔ رک سیک کے وجود میں بجنے والی سیل فون کی اس گھنٹی نے جاسم اور ساکورا کے دماغ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ وہ بے یقینی سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

"ناممکن...... یہ نہیں ہوسکتا......" ساکورا نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ "میں نے اپنے سیل فون کو کھول کر بیگ میں رکھا تھا۔ اس میں کسی کی کال کیسے آسکتی ہے؟"

"مگر کال تو آرہی ہے اسی لیے تو گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔" جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ "رابرٹ والا سیل فون میری جیب میں ہے اور وہ وہاں خاموش پڑا ہے۔ تمہیں اپنا بیگ کھول کر دیکھنا چاہیے مگر اس سے پہلے یہاں سے نکلو......"

تبھی اس کے کروبن کے پاس ہاتھ بجنے کا مجرے نکل کر کاٹیج نمبر آر۔ تھرٹی کی "خراج پرستا" کا عمل شروع کرتے، وہ دونوں جائے وقوعہ کی مخالف سمت چل پڑے۔ رک سیک کے اندر سے نکلنے والی گھنٹی کی آواز مزید چند سیکنڈ تک ان کی سوچ میں کہرام مچاتی رہی پھر ایک میسج ٹون کے بعد خاموشی چھا گئی۔ جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ساکورا! رکنا نہیں۔ پہلے ہم ایک محفوظ مقام پہ جائیں گے۔ اس کے بعد رک سیک کھول کر اس غیر متوقع اور پُراسرار گھنٹی کا راز جاننے کی کوشش کریں گے۔"

"اوکے..... میں سمجھ گئی!" ساکورا نے کہا اور پوچھا۔ "کس طرف جانا ہے؟"

"واپس اپنے پڑاؤ کی طرف...... میرا مطلب ہے، ڈاک بنگلے کی سمت......" جاسم نے جواب دیا۔ "موساد کی پوری ٹیم اپنے منطقی بھیانک انجام کو پہنچ چکی ہے۔ اب گیسٹ ہاؤس ہمارے لیے سب سے زیادہ امن و سکون کی جگہ ثابت ہوگی۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو ثوبان!" وہ تائید

انداز میں بولی۔

واپسی کے سفر میں ان کی رفتار معمول سے زیادہ تھی اور اس کے دو اسباب تھے۔ نمبر ایک، وہ ایک کامیاب مہم سے سرخ رُو لوٹ رہے تھے۔ نمبر دو، انہیں جلد از جلد خود کو متاثرہ علاقے سے دور کرنا تھا۔ اس دوران میں جاسم نے رابرٹ والے سیل فون کو بھی سوئچ آف کردیا تھا۔

''کیا اب میں بیگ کو کھول کر چیک کروں؟'' لگ بھگ تین سو میٹرز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ساکورا نے استفسار کیا۔ ''میرے ذہن میں ایک طوفان بپا ہے ثوبان......!''

وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ ساکورا نے جس طوفان کا ذکر کیا تھا، وہ اضطرار کی صورت اس کی آواز سے بھی جھلک رہا تھا۔ شاید اس کی زندگی میں پُراسرار اور انہونے واقعات کا گزر نہیں رہا تھا اسی لیے وہ حد سے زیادہ متجسس اور متوحش دکھائی دے رہی تھی مگر جاسم ان باتوں کا عادی تھا۔

''اگر تم سے برداشت نہیں ہورہا تو ٹھیک ہے، تم اپنی تسلی کے لیے بیگ کھول کر دیکھ لو۔'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اگر صبر کرسکتی ہو تو ڈاک بنگلے میں پہنچنے کے بعد اطمینان سے چیک کرلینا۔''

''ثوبان! یہ ایسا معاملہ ہے کہ مجھ سے صبر نہیں ہورہا۔''

''اوکے۔'' جاسم نے رکتے ہوئے کہا۔

ساکورا بھی تھم گئی۔ اس نے رک سیک کھول کر اپنے سیل فون تک رسائی حاصل کی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مذکورہ سیل فون کھلی ہوئی حالت میں جوں کا توں پڑا تھا۔ بیٹری، باڈی کے باہر اور سم کارڈ دوسری طرف......!

''امپاسبل......!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ ناقابلِ یقین ہے ثوبان!'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم خود دیکھ لو، اس حالت میں کوئی سیل فون بھلا کیسے اپنا فنکشن کرسکتا ہے؟''

صورتِ حال واقعتاً عجیب اور ماورائے فہم تھی۔ ساکورا کبھی اپنے سیل فون کو اور کبھی جاسم کو دیکھ رہی تھی۔ جاسم کو اس بات کا احساس تھا کہ جب تک وہ اپنی تسلی نہیں کرلے گی، اس کی سوچ پراگندہ اور ہوش وحواس مختل رہیں گے۔

''جو لوگ تمہیں ٹریک اینڈ ٹریس کرسکتے تھے، ان میں سے ایک بھی باقی نہیں بچا......'' جاسم نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا تم بے دھڑک اپنا سیل فون آن کرسکتی ہو۔''

جاسم کا یہ مشورہ ساکورا کو بہت پسند آیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے اپنا سیل فون اسمبل کرنے کے بعد آن کرلیا۔ اگلے ہی لمحے مذکورہ سیل فون کے ڈسپلے پر ایک لمبی مس کال اور ایک میسج ظاہر ہوگیا۔

''انہیں اوپن کرو۔'' جاسم نے کہا۔

ساکورا نے فوراً یہ کام کرڈالا۔ وہ کال اور میسج ایک ہی نمبر سے موصول ہوئے تھے اور وہ نمبر تھا...... تھری، سکس، نائن!

''تھری سکسٹی نائن'' کے نمبر نے جاسم کے دماغ میں ایک خوشگوار دھماکا کیا اور اس کی سوچ ٹھنڈی روشنی میں نہا گئی۔ اس کے ساتھ ہی وقت اچھل کر ساڑھے تین سال پیچھے چلا گیا۔ وہ دو ہزار بیس کے فروری کا آخری ہفتہ تھا جب عالمِ رویا میں جاسم نے ایشتار سے ایک اہم ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ جاسم کو اچھے سے یاد تھا۔

وہ دونوں کسی تیز رفتار ٹرین میں محوِ سفر تھے اور حُسنِ اتفاق، اس ٹرین میں ان دونوں کے سوا اور کوئی بھی مسافر موجود نہیں تھا۔ جاسم کو ٹیلی پورٹیشن کے حوالے سے بریف کرتے ہوئے ایشتار نے ''تھری سکسٹی نائن'' کی اہمیت کو اجاگر کیا تھا۔ اس نے جاسم کو کی نوٹ کے ایک تین روزہ خاص عمل کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ بیش بہا سبق جاسم کی یادداشت میں محفوظ تھا۔

''یہ کی نوٹ تین زبانوں (سمیرین، ماین اور عربی) کو ایک خاص انداز میں ملانے کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ تمہیں تین رات تک اس کی نوٹ کو مخصوص تعداد میں پڑھنا ہے یعنی پہلی رات تین بار، دوسری رات چھتیس دفعہ اور تیسری رات تین سو انہتر مرتبہ۔ بس، تمہارا کورس مکمل ہو جائے گا...... وغیرہ!''

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جاسم کے دماغ سے گزر گئے۔ اگلے ہی لمحے ساکورا کی اُلجھن زدہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اسی سے مخاطب ہوکر کہہ رہی تھی۔

''ثوبان! تین ڈیجٹ والے نمبر سے کال یا میسج، اس سے پہلے کبھی میرے فون پر نہیں آیا اور پھر اس میسج کا مضمون بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں صرف ایک لائن پڑھ سکتی ہوں جو کہ انگریزی میں ہے۔'' پھر اس نے وہ لائن پڑھ کر جاسم کو سنادی۔ ''وہی پرانا تین راتوں والا عمل اور اس مرتبہ کوئی شرط یا پابندی بھی نہیں......!'' وہ لحہ بھر کے لیے رکی پھر سیل فون جاسم کی جانب بڑھاتے ہوئے اپنی بات مکمل کردی۔ ''یہ میرے لیے بالکل اجنبی زبان ہے، تم دیکھو ذرا۔ شاید تمہاری سمجھ میں آجائے۔''

جاسم نے ساکورا کے ہاتھ سے سیل فون لینے کے بعد اس کے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی تو صورتِ حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ ساکورا نے جسے اجنبی زبان کہا تھا، وہ دراصل ایک نیا ''کی نوٹ'' تھا جو ثوبان کے نام کی مناسبت سے ترتیب دیا گیا تھا۔ ''ث عنقی ظوم عظیم عن فوادرا۔''

یہ سمجھنے میں جاسم کو کوئی وقت یا دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ تھری سکسٹی نائن سے آنے والا وہ میسج صرف اور صرف اسی کے لیے تھا۔ کوئی اسے یہ بتانے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ ثوبان کی حیثیت سے دوبارہ ٹیلی پورٹیشن کی صلاحیت حاصل کرسکتا ہے اور اس بار اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی بھی عائد نہیں ہوگی۔ جاسم کے لیے یہ خفیہ پیغام ایک نئی زندگی کی نوید کے جیسا تھا مگر وہ یہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ کون اس پر یہ مہربانی کررہا تھا؟ ایشتار اس دنیا کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے مریخ پر جاچکی تھی۔ راشد ظاہری بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا تھا۔

تو کیا...... یہ میسج ابوریان کی طرف سے ہے؟'' اس نے اضطراری انداز میں سوچا۔ ''یا پھر حرقہ یمانی نے میری مدد کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھادیا ہے۔''

اس سنسنی خیز خیال نے جاسم کے تن بدن میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نے پلک جھپکتے میں یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ آج رات ہی سے اس پُراسرار عمل کا آغاز کردے گا۔

''تم کہاں کھو گئے ثوبان......؟'' ساکورا کی استفساریہ آواز نے جاسم کو چونکا دیا۔ ''وہ نامانوس زبان والی لائن تمہارے پلے پڑی کہ نہیں......؟''

''تمہاری طرح میں بھی......!'' جاسم نے اپنی اندرونی کیفیت کو کمالِ ہنرمندی سے چھپاتے ہوئے مطمئن انداز میں جواب دیا۔ ''اس تحریر کو سمجھنے سے قاصر ہوں ساکورا۔ لگتا ہے، یہ کوئی نیٹ ورک پرابلم ہے......''

''ہاں......شاید!'' ساکورا نے متذبذب انداز میں کہا۔ ''مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے ورنہ تھری سکس نائن کوئی درست نمبر ہے اور نہ ہی یہ میسج میرے لیے کوئی معنی رکھتا ہے۔''

ساکورا کے بالعکس وہ میسج جاسم کے لیے کس قدر اہم اور پُرمعنی تھا، وہ اس کے بارے میں سرِدست ساکورا کو کچھ نہیں بتاسکتا تھا۔ سو، وہ مزید کسی بحث میں پڑے، تیز رفتاری سے ڈاک بنگلے کی سمت بڑھنے لگے۔

''کیا اس بنگلے تک آمدورفت کے لیے کوئی باقاعدہ راستہ یا سڑک نہیں ہے؟'' جاسم نے پوچھا۔ ''یہ تو ہو نہیں سکتا کہ معزز سرکاری مہمانوں کو یہاں قیام کرنے کے لیے ہمارے طرح گھٹنوں گھٹنوں برف سے گزرنے کے بعد اس گیسٹ ہاؤس تک رسائی حاصل ہوتی ہو۔''

''لانگ ایئر بین کی دوسری صاف اور شفاف سڑکوں کی طرح سٹی سینٹر سے اس گیسٹ ہاؤس تک پہنچنے کے لیے بھی ایک راستہ موجود تھا۔'' ساکورا وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن سالوں سے کسی کا اس طرف آنا نہیں ہوا اس لیے وہ چھوٹی سڑک برف کی موٹی تہ کے نیچے دب کر انسانی نگاہ سے اوجھل ہوچکی ہے۔ اس وقت ہم اسی سڑک کے اوپر چل رہے ہیں۔''

''اوہ......!'' جاسم نے ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد پوچھا۔ ''یہاں کی حکومت نے اس سڑک کی صفائی کی ضرورت محسوس نہیں کی؟''

''نہیں!'' ساکورا نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''حکومتی سطح پر اس گیسٹ ہاؤس کو آسیب زدہ قرار دیا جاچکا ہے اور کسی انسان کو اس جانب آنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ سو، برف کے نیچے گم ہوجانے والی اس سڑک کی بازیافت کے بارے میں بھی نہیں سوچا گیا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' جاسم نے سرسری انداز میں کہا۔

ان لمحات میں جاسم کا ذہن مسلسل ٹیلی پورٹیشن کی حیرت انگیز صلاحیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ پُراسرار میسج کس پہنچی ہوئی ہستی نے ساکورا کے سیل فون تک پہنچایا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ میسج جاسم کے لیے تھا۔ وہ پچھلے تیس، بتیس گھنٹے سے، اس صلاحت کے کھوجانے کے باعث حد درجہ ملول اور دل شکستہ تھا مگر قدرت کے کام بھی نرالے ہوتے ہیں، وہ جب کسی کو نوازنا چاہتی ہے تو اس کا حسنِ انتظام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

''رابرٹ نے گتّے کی موت مرنے سے پہلے تمہارا کام آسان کردیا ہے ثوبان!'' ساکورا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جس بندے نے تمہیں موساد کی قید میں پہنچایا تھا، وہ کل کسی وقت یہاں پہنچنے والا ہے اور...... تم اپنی جس دوست سے ملنے نیویارک جانا چاہتے تھے، وہ آج شام نیویارک سے روانہ ہوگی اور پرسوں رات میں کسی وقت لانگ ایئر بین پہنچا دی جائے گی۔ کیا یہ تمہارے لیے بہت بڑی خوش خبری نہیں ہے؟''

جب رابرٹ اپنی جان بخشی کے بدلے میں جاسم کو یہ اہم معلومات فراہم کررہا تھا، ساکورا بھی گن بدست وہاں موجود تھی۔ اس نے جاسم کی ہدایت کے مطابق، رابرٹ کو

گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔

''ہاں، بالکل......!'' جاسم نے اثبات میں جواب دیا۔ ''رابرٹ اگرچہ موساد کا تربیت یافتہ ایجنٹ تھا لیکن اس کے کردار نے مجھے متاثر نہیں کیا۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو، جان......؟'' ساکورا نے پوچھا۔

''کوئی بھی شخص کڑی ٹریننگ لینے کے بعد کسی بھی سیکرٹ ایجنسی میں ایک مقام حاصل کرسکتا ہے مگر اصل شے ہے وفاداری......!'' جاسم نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''اور وفاداری ہاتھ پاؤں کی طاقت اور پھرتی میں نہیں بلکہ انسان کے خون میں شامل ہوتی ہے لیکن افسوس کہ رابرٹ کی رگوں میں بے وفائی کا گندہ خون دوڑ رہا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے اس نے مجھے یہ حساس معلومات دے کر موساد سے صریحاً غداری کی ہے۔ وہ میرا دشمن ہی سہی مگر اس کا یہ فعل انتہائی گھٹیا اور قابلِ مذمت ہے۔''

بات کے اختتام پر جاسم کا لہجہ خاصا کڑوا ہو گیا تھا۔ ساکورا نے خیال آرائی کی۔

''ہوسکتا ہے، رابرٹ نے تم سے غلط بیانی کی ہو...... وہ تمہیں گمراہ کرکے اپنے لیے آسانیاں حاصل کرنا چاہتا ہو؟''

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔'' جاسم نے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کے بیان کی سچائی کو ہم بہ آسانی چیک کرسکتے ہیں۔''

''وہ کیسے بھلا؟'' ساکورا پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ ہفتے میں صرف دو فلائٹس لانگ ایئربین کے ائرپورٹ پر لینڈ کرتی ہیں۔'' چلنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے بیان کے مطابق، کل اتوار اٹھائیس اکتوبر کی دوپہر ناروے سے ایک فلائٹ آنے والی ہے جو اگلی صبح یعنی پیر انتیس اکتوبر کی صبح واپس جائے گی۔ پیر سے نیا ہفتہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیر تیس اکتوبر یعنی پرسوں رات کوئی اور فلائٹ بھی یہاں آئے گی۔ اگر ہم رابرٹ کے بیان کو درست مان لیں تو کل دن میں ایمشل تھیوڈور اور پرسوں رات میں بلوما لانگ ایئربین پہنچنے والی ہے۔'' وہ سانس ہموار کرتے کی غرض سے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''گیسٹ ہاؤس پہنچنے کے بعد تم اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہو جانا۔ ان فلائٹس کی آمد اور ان پر سوار مسافروں کی لسٹ تک رسائی حاصل کرنا تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا...... ہے نا؟''

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''ہاں، میں یہ کروں گی۔''

''تمہیں آج کی تاریخ میں اور بھی بہت کچھ کرنا ہے ساکورا......!''

''ہاں بتاؤ...... تم جو کہو گے، میں وہ ضرور کروں گی۔''

''ہمارے تمام معلوم دشمن کیفرِ کردار کو پہنچ چکے ہیں لہٰذا فی الوقت لانگ ایئربین میں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم اپنا سیل فون آن رکھ کر بے فکری سے کہیں بھی آزادانہ گھوم پھر سکتی ہو۔ بنگلے پر تھوڑا آرام کرنے کے بعد تم میرے بتائے ہوئے ضروری کاموں کے لیے باہر نکلو گی۔''

''نکلوں گی......'' جاسم کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ پوچھ بیٹھی۔ ''مگر یہ تو بتاؤ، مجھے کرنا کیا ہے؟''

''وہی تو بتانے جا رہا تھا اور تم نے بات کاٹ دی۔ خیر......!'' جاسم نے رسان بھرے انداز میں کہا۔ ''تم میرے لیے ایک سیل فون خریدو گی، کنکشن کے ساتھ...... میرا مطلب ہے سم کارڈ بھی لینا ہے۔ دوسرے، تین چار دن کے لیے گروسری اور دیگر اشیائے خورد و نوش بھی چاہیے ہوں گی کیونکہ یہاں کا کام ختم کیے بغیر میں کہیں جانے والا نہیں ہوں اور تیسرے......!'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی ہم نے کاٹیج نمبر ''آر۔ تھرٹی'' میں جو بھی کیا ہے، اس کا ردِعمل جاننا بھی ضروری ہے۔ تم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ اس بستی کے لوگ اور لانگ ایئربین کی انتظامیہ اس واقعے کو کیسے لے رہی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا......؟''

''ہاں، میں سمجھ گئی۔'' ساکورا نے جواب دیا۔ ''اور کچھ؟''

''فی الحال اتنا ہی...... باقی باتیں رات میں کریں گے۔''

حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے وہ دونوں گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ اس وقت گھڑی کے مطابق، صبح کے سات بج رہے تھے۔ یہ لوگوں کی بیداری کا وقت تھا مگر رابرٹ کے کاٹیج پر ٹوٹنے والی قیامت نے آج سب کو علی الصباح اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا اور ان سب میں سفید، فربہ پولر بیئر بھی شامل تھا۔

''یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' گیسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے پر براجمان قطبی ریچھ پر نگاہ پڑتے ہی ساکورا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ کھا پی کر چلا گیا تھا تو میں سمجھی تھی کہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا مگر......!''

''ساکورا! اس قطبی ڈبّے اکبر کو تم سے عشق ہوگیا ہے۔''

جاسم نے گہری مگر مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''دیکھو...... تمہاری چوکھٹ پر کس طرح یہ مجاور بنا بیٹھا ہے۔''

''مذاق کر رہے ہو نا......؟'' ساکورا نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''ہاں......!'' جاسم نے جواب دیا۔

''پھر حقیقت کیا ہے؟''

''حقیقت بہت ہی سادہ ہے ساکورا......!'' جاسم نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ہماری غیر موجودگی میں یہ بھالو اس گیسٹ ہاؤس کی نگرانی اور حفاظت کرے گا۔''

''تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو؟'' ساکورا نے حیرت بھرے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا پولر بیئر نے تمہیں اس بارے میں بتایا ہے؟''

جاسم کے پاس اس سوال کا کوئی معقول اور تسلی بخش جواب نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں جو آیا، وہ اس نے کہہ دیا تھا۔ جب سے وہ قطبی ریچھ اس کی زندگی میں آیا تھا، جاسم اس کی ذات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بے اختیار مگر پُراعتماد ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی اس عجیب و غریب کیفیت کو خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ تاہم ساکورا کی تسلی کے لیے جواب دینا بھی ضروری تھا۔

''وہ لمحات تو تمہیں یاد ہوں گے جب پچھلی رات یہ پولر بیئر ہمارے دروازے پر آیا تھا۔'' جاسم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' ساکورا نے اثبات میں جواب دیا۔ ''تم نے دو موٹی فروزن فش اسے کھلا دی تھیں اور یہ درندہ تین کلوگرام سے زیادہ وزن کی مچھلیاں اپنے معدے میں اتارنے کے بعد یہاں سے چلا گیا تھا۔''

''ساکورا......!'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس معصوم محافظ کے لیے درندہ اور حیوان جیسے الفاظ استعمال کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارا حافظہ ٹھیک سے کام کر رہا ہے تو تمہیں یہ بھی اچھی طرح یاد ہوگا کہ شکم سیری کے بعد جب یہ جانے کے لیے مڑا تھا تو میں نے آواز دے کر اسے روک لیا تھا اور اس سے کہا تھا......'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''ہم دوست ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔''

''ہاں، ہاں......تم نے ایسا کہا تھا۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔

''بس، تو ثابت ہو گیا ہے یہ قطبی ریچھ ہماری حفاظت کا فریضہ انجام دے گا اور ہم اس کے بھوجن کا خیال رکھیں گے۔'' جاسم نے پوری قطعیت سے کہا۔ ''لہٰذا تم مارکیٹ سے اس کی خوراک بھی لے کر آؤ گی۔ جب تک ہم اس گیسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں، یہ سفید فربہ ریچھ ہمارے ڈسپوزل پر ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟''

اس مختصر سے عرصے میں ساکورا، ثوبان (جاسم) سے اس قدر متاثر ہو چکی تھی کہ اس نے ترنت جواب دیا۔ ''ایک دم ٹھیک ثوبان!''

جاسم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ساکورا اس کی وضاحت سے مطمئن ہوئی تھی یا نہیں۔ بہرکیف، مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے وہ چپ چاپ گیسٹ ہاؤس کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

اٹھائیس اکتوبر، ہفتے کا دن اپنی مخصوص رفتار سے شام کی سمت رواں دواں تھا۔ ایسٹ بینک، یروشلم اولڈ سٹی کے علاقے ماؤنٹ زائن (جبل صہیون) میں واقع اونچی چھتوں والی قدیم طرزِ تعمیر کا شاہکار اس نادیدہ اور حصار کشیدہ پُراسرار عمارت کے اندر ڈینئل کارمی کی حالت دیدنی تھی۔ وہ پچھلی رات کے آخری پہر سے جاگ رہا تھا۔ عمارت کے اندر ابھرنے والی قدموں کی مخصوص چاپ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور...... اب لگنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کارمی نے اپنے اس سنسنی خیز تجربے کے بارے میں ہرزل یافو کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یافو اس کا دستِ راست تھا لیکن اس نے یافو کو اس راز میں شریک کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اپنے اندر ہی وہ یہ معلوم کرنے کی سعی میں مصروف تھا کہ اس نے کسی انسان کے قدموں کی جو آواز سنی تھی، اس کی کوئی حقیقت بھی تھی یا وہ محض اس کی سماعت کا دھوکا تھا؟

وہ جس قدر سوچ رہا تھا، اس کا ذہن اتنا ہی زیادہ الجھتا چلا جا رہا تھا۔ تمام تر کوشش اور غور و فکر کے باوجود بھی وہ اسی مقام پر کھڑا تھا جہاں گزشتہ رات کے آخری پہر میں تھا۔ اس غیر یقینی اور نامانوس صورتِ حال میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا اضطرار بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ زندگی میں وہ کبھی ایسی اضطرابی اور بے بسی کی کیفیت سے نہیں گزرا تھا۔ وہی بات کہ کوئی تجربہ اچھا ہو یا برا، جب پہلی بار اس سے واسطہ پڑتا ہے تو انسان کی حالت کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔

دوپہر دو بجے ہرزل یافو نے اپنے گرو ڈینئل کارمی کے پاس آکر اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔ ”عالی جاہ! رونن بار آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

رونن بار اسرائیلی سیکیورٹی ایجنسی ”شن بیت“ کا ہیڈ تھا۔ کارمی نے اس کے ذمے ایک اہم کام لگا رکھا تھا۔ رونن بار کے حکم پر پچھلے چوبیس گھنٹے سے آئی ایس اے (اسرائیلی سیکیورٹی ایجنسی) معروفِ عمل تھی اور...... رونن بار، ڈینئل کارمی کے حکم کا غلام تھا۔

”ٹھیک ہے، آپ اس سے میری بات کرا دیں۔“ کارمی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور فون کا اسپیکر بھی آن کر دیں۔“

یافو نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اگلے ہی لمحے سیل فون کے اسپیکر سے رونن بار کی آواز ابھری۔ عقیدت اور احترام سے لبریز سلام کرنے کے بعد رونن بار نے کہا۔

”میتھو باد! ہم نے بلوما کے حوالے سے اپنی تحقیق مکمل کر لی ہے۔ وہ یہودی نہیں پکی مسلمان ہے اور اس کا اسلامی نام ”حسنیہ“ ہے جبکہ اس کے باپ آشکار کا اصلی نام ”عبدالرحمٰن“ ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹی یہودی بن کر ایک طویل عرصے سے ہمیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ درحقیقت یہ فلسطینی مجاہد ہیں بلکہ...... اشکار (عبدالرحمٰن) کے لیے تو ”تھا“ کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ کر اس دنیا سے جا چکا ہے۔“

”مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تمہاری ٹیم نے عرق ریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔“ ڈینئل کارمی نے سپاٹ آواز میں کہا اور پوچھا۔ ”کیا یہ معلوم ہو سکا کہ حسنیہ کب بلوما بنی تھی؟“

”جی، ہم نے اس کا بھی پتا لگا لیا ہے۔“ رونن بار نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔ ”جب وہ تھرڈ اسٹینڈرڈ کی اسٹوڈنٹ تھی، اس وقت اسکول کے ریکارڈ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔ تب یہ باپ بیٹی مسلم کوارٹر میں رہتے تھے۔ بعدازاں وہ لوگ جوئش کوارٹر میں شفٹ ہو گئے تھے۔“

مزید ایک، دو اہم سوالات کے بعد ڈینئل کارمی نے یافو کو سیلولر رابطہ موقوف کرنے کا اشارہ کر دیا۔ یافو نے حکم کی فوری تعمیل کے بعد کارمی کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

”آئزک شالوم کو فون لگائیں......!“

یافو کی پھرتی کے طفیل بلوما (حسنیہ) کا ٹیم لیڈر آئزک شالوم، ایک منٹ کے اندر لائن پر تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد کارمی نے معتدل انداز میں کہا۔

”زیرِ زمین ہونے والے حادثے کی وجہ سے کھدائی کا کام روک دیا گیا ہے۔ ابھی اس پروجیکٹ کو آگے بڑھانے کے بارے میں نہیں سوچنا۔“

”جو حکم عالی جاہ......!“ آئزک شالوم نے فرمانبرداری سے کہا۔ ”میں نے اپنی [illegible] نگرانی میں بلوما کے باپ اشکار کی قبر کو کھلوایا تھا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اشکار کی قبر میں رکھا ہوا کاسکٹ خالی تھا۔ بعدازاں جب مسلمانوں کے قبرستان میں......“

”یہ ساری معلومات پرانی ہو چکی ہیں۔ شالوم!“ کارمی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم جان چکے ہیں کہ بلوما اور اس کا باپ اشکار دراصل فلسطینی مجاہد تھے جو یہودی بن کر، ہماری ناک کے نیچے ہمیں دھوکا دے رہے تھے۔ بہرحال، اشکار یعنی عبدالرحمٰن اس دنیا سے جا چکا ہے اور اس کی بیٹی بلوما ہماری کسٹڈی میں ہے۔ ہم اس کی زبان کھلوانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ اس باپ بیٹی نے ہمارے ساتھ جو کیا ہے، وہ کسی بھی صورت میں قابلِ معافی نہیں ہے۔ تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا گیا کہ......“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ دو تین گہری سانسیں لیں پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

”تم اس پروجیکٹ کے لیے ایک نئی ٹیم تشکیل دو گے۔ پتا نہیں، بلوما نے یا اس کا جو بھی نام ہے، اپنی ٹیم کے کس کس رکن کے ذہن میں بغاوت کا زہر ٹپکایا ہوگا۔ تم اس مہم کے لیے جو نئی ٹیم بناؤ گے، اس میں شامل ہر کسی کا بیک گراؤنڈ اچھے سے چیک کرنا۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔“

”میں سمجھ گیا عالی جاہ!“ آئزک شالوم نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے ہمیں ہر رسک کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔“

ڈینئل کارمی کے اشارے پر یافو نے کال اینڈ کر دی۔

ڈینئل کارمی، دجال لعنتی کی مجلسِ شوریٰ میں کھل کھلا کر بولا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر جگہ وہ نہایت ہی اختصار سے بات کرتا تھا۔ اس کے زیادہ تر معاملات کو نمٹانا ہرزل یافو کی ذمے داری تھی مگر آج وہ ذہنی طور پر خاصا الجھا ہوا تھا اس لیے وہ معمول سے ذرا ہٹ کر پیش آرہا تھا۔ گزشتہ رات والا سنسنی خیز تجربہ اس کی سوچ اور حواس کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ شاید وہ لاشعوری طور پر اسی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خلافِ معمول ”معروف“ نظر آرہا تھا۔ اس کے خلجان اور ذہنی پراگندگی کا عالم یہ تھا کہ چند منٹ پہلے رونن بار نے اسے بلوما کا اصلی نام بتایا تھا مگر

آ کر، شالوم سے بات کرتے ہوئے اس نے بلوما کے حوالے سے کمانڈر کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے ''یا اس کا جو بھی نام ہے'' جیسے مبہم جملے کا سہارا لیا تھا۔

ہرزل یافو، کارمی کا شب و روز کا ساتھی تھا۔ وہ کارمی کے مزاج اور عادات سے بخوبی واقف تھا۔ یہ بات اسے بھی کھٹک رہی تھی کہ ہمیشہ پُرسکون اور بااعتماد رہنے والا میخوبار اچانک اتنا مضطرب اور مشتعل کیوں ہو گیا تھا؟ یافو اپنے آقا کی اس بے نام پریشانی کو سمجھنا چاہتا تھا مگر استفسار کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

سہ پہر تک کارمی کا معاملہ انیس بیس کے فرق سے ایسا ہی دگرگوں رہا، پھر اچانک اس بے کلی میں بہت زیادہ تیزی آ گئی۔ کارمی کے ایما پر یافو متعدد بار ڈیوڈ بارنیا سے رابطے کی سعی کر چکا تھا مگر اس کوشش میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بارنیا کا نمبر مسلسل سوئچڈ آف آ رہا تھا۔ کارمی، ثوبان اور حُسنیہ کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ ہونا چاہتا تھا لیکن بارنیا اس کی رسائی سے باہر تھا۔ اس سچویشن نے کارمی کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ڈیوڈ بارنیا سے آخری بار رابطہ گزشتہ روز شام میں ہوا تھا اور وہ بھی کارمی سے نہیں بلکہ یافو سے اس کی بات ہوئی تھی اور اس بات چیت میں موساد کے چیف ڈیوڈ بارنیا نے اپنی ناکامی، رسوائی اور ہزیمت کو چھپانے کے لیے منہ بھر کر جھوٹ بولا تھا۔

ٹھیک پانچ بجے سہ پہر ہرزل یافو کے نمبر پر بارنیا کی کال آ گئی۔ یافو نے فوراً کال کو پک کرنے کے بعد اسپیکر آن کر دیا۔ مذکورہ سیل فون یافو اور کارمی کے درمیان رکھا ہوا تھا۔

بارنیا کے ''ہیلو'' کہتے ہی کارمی اس پر برس پڑا۔ ''غیر ذمے داری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے بارنیا!'' کارمی نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم کل رات سے غائب ہو۔ تمہارا فون مسلسل بند آ رہا ہے۔ میں بلوما اور ثوبان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور تم......!''

''ہدالتو......!'' بارنیا نے لجاجت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''میں وہاں کے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بس اسی لیے میں رابطہ نہ کر سکا۔''

کارمی کے شانے اور سننے ہوئے کان یکایک کھڑے ہو گئے۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کہاں کے حالات؟''

''وہاں...... میرا مطلب ہے...... لانگ ایئربین!''

''ٹھیک طرح ثوبان کے حالات کیوں نہیں کہہ رہے......؟'' ہدالتو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جی...... ہاں...... وہی......!'' بارنیا نے لکنت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

کارمی نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے وہاں......؟''

کارمی کے کرخت استفسار کے جواب میں بارنیا نے بلا کم و کاست آرکٹک ریجن میں پیش آنے والے خون ریز اور دھماکا خیز واقعات سے کارمی کو آگاہ کر دیا اور آخر میں کہا۔ ''میخوبار! میں نے تین اسپیشل کمانڈوز کو لانگ ایئربین بھجوا دیا ہے۔ وہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے ثوبان کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے عالی جاہ......!''

''بارنیا! تم پچھلے کچھ عرصے سے مجھے مسلسل مایوس کر رہے ہو۔'' کارمی نے بیزاری سے کہا۔ ''سیدھی طرح اس سچائی کا اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ تمہاری موساد کی کارکردگی کو زنگ لگ چکا ہے۔ اسے کسی سان یا سوہان کی ضرورت ہے۔''

''عالی جاہ! ثوبان کا معاملہ بہت ٹیڑھا ہے......''

بارنیا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کارمی نے پوچھا۔ ''کیا ٹیڑھ ہے، اس کے معاملے میں؟''

''مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ ثوبان کوئی انسان نہیں...... وہ جن ہے یا پھر...... اسے کسی غیبی قوت کی مدد اور تائید حاصل ہے۔'' بارنیا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میرے لوگوں نے اسے بے بس کر کے ڈین کے اندر الٹا لٹکا دیا تھا۔ وہ پوری طرح ان کے قابو میں تھا۔ پھر اچانک اس منحوس نے بازی پلٹ دی۔ اس ٹیم میں دس افراد شامل تھے۔ ثوبان نے ان سب کو ختم کر دیا اور...... ان کے دونوں ٹھکانوں کو بھی تباہ و برباد کر کے رکھ دیا...... اور......!''

''یہ تم نے کیا ''اور، اور'' لگا رکھی ہے؟'' کارمی نے جھڑکا۔

''ڈین کے اندر ساکورا نامی ایک جاپانی شیف بھی تھی۔ ثوبان اسے بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے۔'' بارنیا نے بتایا۔

''یہ اس کم بخت کا پرانا طریقۂ واردات ہے۔'' کارمی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کچھ عرصہ پہلے سینٹ ہیلینا میں اس نے ڈیوڈ کی عورت ایبکیل کو بھی بہلا پھسلا کر اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ ایبکیل وہی اتھیسٹ لڑکی تھی جس نے ثوبان کی محبت میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ثوبان نے اس کا نام آمنہ رکھا تھا۔''

''آمنہ سب میرین کے اندر اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے ہدالتو!'' بارنیا نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ثوبان کو میں

برف زار کے اندر دفن کر دوں گا۔ میں نے جو تین کمانڈوز لانگ ایئر بین روانہ کیے ہیں بلکہ مجھے یقین ہے، وہ اب تک وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ وہ لوگ ثوبان کو تلاش کر کے بڑی دردناک موت دیں گے۔“

”بارنیا! تمہارے دس کمانڈوز مل کر بھی ثوبان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے بلکہ وہ ان کا دھڑن تختہ کر کے کہیں غائب ہو چکا ہے۔“ کارمی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ تین نووارد کمانڈوز کیا کسی ثوبان جیسے جن یا بلا سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں یا پھر وہ بھی ماورائی علوم کے ماہر ہیں۔ ہر غیبی طاقت کا منہ توڑ جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہیں؟“

ڈینئل کارمی موساد کے چیف کو بھگو بھگو کر رسید کر رہا تھا۔ وہ ثوبان کے معاملے کی نزاکت اور حساسیت سے بہ خوبی آگاہ تھا اور مانتا تھا کہ اس فلسطینی دہشت گرد کی پشت پناہی انتہائی خفیہ طریقے سے کی جا رہی ہے۔ اس نے ثوبان (جاسم) کے سورس تک رسائی حاصل کرنے کی بہتیری کوشش کی تھی مگر ابھی تک اس کاوش میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی تھی۔

”میخو باد! میں اس مشن کی ناکامی کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا۔“ بارنیا نے ندامت آمیز انداز میں کہا۔ ”اگر آپ مجھے ایک موقع اور دیں تو میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔ ثوبان اور ساکورا لانگ ایئر بین سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔ میں نے حکومتی سطح پر ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ......!“

”بارنیا! بلند بانگ دعوے نہیں، کچھ کر کے دکھاؤ......!“ کارمی نے بارنیا کی دکھتی رگ دباتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”اگر نہیں کر سکتے تو بھی مجھے صاف صاف بتا دو۔ میں اسٹیٹ سیکریٹری آف یونائیٹڈ اسٹیٹس سے بات کر کے یہ کیس......!“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی عالی جاہ......!“ بارنیا نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ”موساد کسی بھی طرح ”سی آئی اے“ سے کم نہیں ہے۔ آپ مجھ پر پورا بھروسا رکھیں۔ میں کل صبح تک آپ کے سارے گلے شکوے دور کر دوں گا۔“

ڈینئل کارمی نے یو ایس اسٹیٹ سیکریٹری سے رابطے کے بعد اس معاملے میں سی آئی اے کی مدد حاصل کرنے والی بات کر کے ڈیوڈ بارنیا کو بیچ چوراہے کے، بے لباس کر دیا تھا۔

ویسے یہ کسی شرمندگی یا خفت والی بات نہیں۔ دنیا بھر کی سیکرٹ ایجنسیز پیچیدہ معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرتی رہتی ہیں لیکن بارنیا کا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ سب میرین ڈولفن ٹو۔ کلاس سے لے کر مینجنر۲ اور مینجنر۳ سے لے کر لانگ ایئر بین تک جاسم نے قدم قدم پر موساد کے سیٹ اپ کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھا تھا۔ بارنیا جیسے سفاک اور بے رحم چیف کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوتا، اگر جاسم کی سرکوبی کا ٹاسک اس سے چھین کر کسی اور کو دے دیا جاتا۔ وہ ایسی پیشہ ورانہ سبکی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے بارنیا......!“ کارمی نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنے ہو۔ اپنی قوم کا پہلا حق ہے۔ میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں لیکن ذہن میں رکھنا کہ یہ آخری موقع ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......“

”جی عالی جاہ!“ بارنیا نے مسکینیت بھری آواز میں کہا۔ ”میں اس موقع کو کسی بھی قیمت پر نہیں گنواؤں گا۔“

”شاباش!“ کارمی نے نرم لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ”بلوما کا کیا اسٹیٹس ہے؟“

”بلوما نیویارک والی ٹیم کی تحویل میں ہے۔“ بارنیا نے بتایا۔ ”لگ بھگ دو گھنٹے کے بعد اس کی فلائٹ ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ موساد کے ایجنٹس کی نگرانی میں ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گی۔“

نیویارک اور اسرائیل کے مقامی وقت میں کم و بیش چھ گھنٹے کا تفاوت ہے۔ بلوما والی فلائٹ دوپہر ایک بجے کی تھی یعنی اس وقت اسرائیل میں شام کے سات بج جاتے۔

”اس زحمت کی اب ضرورت نہیں رہی بارنیا......!“ کارمی نے خشک لہجے میں کہا۔ ”ثوبان تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ جب تک وہ موساد کی کسٹڈی میں تھا، تمہارے ایجنٹس اس کی زبان سے کام کی کوئی بات اگلوا نہیں سکے۔ بلوما کو جس مقصد سے لانگ ایئر بین بھیجا جا رہا تھا، وہ سراسر ثوبان سے متعلق تھا۔ سو، وہ مقصد اب فوت ہو چکا ہے۔ لہٰذا......!“ لمحاتی توقف کر کے اس نے دو گہری سانسیں لیں پھر ان الفاظ میں بات مکمل کر دی۔

”تم پہلی فرصت میں بلوما کو نیویارک سے یروشلم پہنچانے کا بندوبست کرو اور اس سلسلے میں کوئی کوتاہی یا بے احتیاطی قابل برداشت نہیں ہو گی۔“

”جو حکم عالی جاہ......!“ ڈیوڈ بارنیا بس اتنا ہی کہہ سکا۔

یافو، کارمی کے موڈ اور مزاج سے مکمل طور پر آشنا تھا۔ چنانچہ بارنیا کے جواب کے ساتھ ہی اس نے سیلولر رابطہ برخاست کر دیا۔

اس واہیات صورت حال نے ڈینئل کاری کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اس کے چہرے سے ناگواری جھلک رہی تھی۔ اس نے یافو کی طرف دیکھتے ہوئے بیزار کن انداز میں کہا۔

''آپ ذرا یاہو کو لائن پر لیں......''

''جی جہاں پناہ......!'' یافو جلدی سے بولا۔

قبل اس کے کہ یافو نیتن یاہو کو فون لگاتا، اس کے نمبر پر کال آنے لگی۔ اس نے کاری کی جانب نگاہ اٹھا کر مؤدب لہجے میں کہا۔

''ایمشل تھیوڈور ہے عالی جاہ!''

''ٹھیک ہے، پہلے اسی سے بات کر لیتے ہیں۔''

کاری اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اگلے ہی لمحے سیل فون کے اسپیکر سے ایمشل تھیوڈور کی آواز نشر ہوئی۔ وہ ہرزل یافو سے مخاطب تھا۔

''محترم! میں آقا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

یافو نے کال اٹینڈ کرتے ہی فون کو اسپیکر پر ڈال دیا تھا۔ کاری نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں ایمشل! میں بات کر رہا ہوں۔''

''میخوباد! میں نے دس منٹ پہلے ناروے کے کیپٹل آزلو کے معروف ''گارڈرموئن'' ائرپورٹ پر لینڈ کیا ہے۔'' ایمشل نے مطلع کرنے والے انداز میں کہا۔ ''آج کی رات آزلو کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں گزاروں گا۔ کل صبح کی فلائٹ سے لانگ ایئربین روانہ ہو جاؤں گا۔ کل کی رات ثوبان اور اس کی دوست بلوما کی زندگی کی آخری شب ثابت ہوگی۔''

''ایمشل! بلوما کی اصلیت ہم پر عیاں ہو چکی ہے۔'' کاری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ فلسطینی مسلمان حُسنیہ ہے۔ وہ اور اس کا باپ عبدالرحمن، طویل عرصے سے یہودی بن کر ہمیں دھوکا دے رہے تھے۔ میں نے بلوما یعنی حُسنیہ کو واپس یروشلم بلا لیا ہے۔ اسے لانگ ایئربین بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ثوبان اب وہاں نہیں ہے۔''

کاری کا آخری جملہ دھماکے دار اور سنسنی خیز تھا۔ ایمشل نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''مکرمی! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''ثوبان نے موساد کی لانگ ایئربین والی پوری ٹیم کو موت کے گھاٹ اتار کر آزادی حاصل کر لی ہے۔'' کاری نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''کوئی نہیں جانتا، وہ اس وقت کہاں ہوگا۔''

''محترمی! اور کوئی جانے یا نہ جانے لیکن میں نے اپنے شکار کی اچھے سے خبر رکھی ہوئی ہے۔'' ایمشل نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''وہ مسلسل میرے نادیدہ ریڈار پر ہے۔''

''کیا وہ سوالبار کے اندر ہی کہیں چھپا بیٹھا ہے؟'' ڈینئل کاری کے سوال میں حد درجہ اضطرار پایا جاتا تھا۔

''جی ہاں۔'' ایمشل نے اثبات میں جواب دیا۔

''لانگ ایئربین پہنچنے کے بعد، میں اپنے علم سے اس کی درست لوکیشن بھی ٹریس کرلوں گا۔ پھر بہت مزہ آئے گا عالی جاہ۔ ایک دن......صرف ایک دن کے بعد ثوبان اور اس کی ساری اکڑفوں خاک میں مل کر قصۂ پارینہ بن جائے گی۔''

ایمشل کے پُرجوش دعوے نے کاری کا سیروں خون بڑھا دیا۔ موجودہ حالات میں براخا کا برادرِ کلاں ایمشل تھیوڈور، کاری کی آخری اُمید تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ثوبان کی زندگی کا چراغ گل کرنے سے پہلے اسے بے پناہ اذیت سے گزارے گا۔ کاری کے تئیں، یہ ایمشل کا حق بھی تھا۔ اپنی اکلوتی ہمشیرہ براخا کے ساتھ ہونے والی بہیمانہ بربریت کا بدلہ لینے کا اختیار اسے حاصل تھا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں ڈینئل کاری کے ذہن سے گزر گئے۔ اگلے ہی لمحے اس نے معتدل انداز میں کہا۔

''ثوبان نے موساد کی ٹیم میں شامل ایک جاپانی لڑکی کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے ایمشل۔ اس لڑکی کا نام ساکورا ہے۔ وہ ان لوگوں کی شیف تھی۔''

''آپ فکر نہ کریں ہدمالتو......!'' ایمشل نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''بلوما نہ سہی، ساکورا سہی۔ ثوبان کے ساتھ ہی میں اس جاپانی شیف کا بھی حشر نشر کر دوں گا۔''

ایمشل کی باتوں نے ڈینئل کاری کے حوصلے کی بیٹری چارج کر دی تھی۔ اب وہ اندر سے خود کو خاصا مطمئن اور پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ دو، چار ضمنی باتوں کے بعد اس نے ایمشل کو اپنی نیک خواہشات اور دعاؤں کے سائے میں ''بائے بائے'' کر دیا۔

''ہمارا شکاری میدان میں اتر چکا ہے یافو......!'' کاری نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ ''وہ اپنے شکار کو دوڑا دوڑا کر مارے گا۔''

''بالکل...... عالی جاہ!'' یافو نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''ثوبان اسی عبرت ناک سلوک کا مستحق ہے۔''

آئندہ پانچ منٹ میں ہرزل یافو نے اسرائیل کے

پرائم منسٹر نیتن یاہو کو فون لگانے کے بعد اسپیکر آن کر دیا۔ بات ظاہر ہے، کارمی کو کرنا تھی۔ سو، کسی تمہید یا سلام دعا کے بغیر اس نے یاہو سے پوچھا۔

''ڈیوڈ بارنیا کب تک موساد کا چیف رہے گا؟''

''اسرائیلی سیکرٹ سروس موساد کا چیف پانچ سال کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔'' یاہو نے بہ صد احترام جواب دیا۔ ''ڈیوڈ دادی بارنیا نے جون دو ہزار اکیس میں یہ عہدہ سنبھالا تھا۔ مئی دو ہزار چھبیس تک وہ اس پوزیشن پر رہے گا۔''

''مطلب، ابھی مزید تین سال تک اسے جھیلنا پڑے گا؟''

یاہو کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ڈینئل کارمی کس تناظر میں ڈیوڈ بارنیا کے بارے میں بات کر رہا تھا، کارمی سے سوال کرنے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ سو، کسی اطاعت گزار غلام کے مانند اس نے کہا۔

''یس سر......!''

''یاہو! بارنیا سے کہہ دینا کہ ثوبان کے حوالے سے مجھے فون کرنے کی زحمت نہ کرے۔'' کارمی نے روکھے پھیکے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ بلوما کو یروشلم بھیج دے۔ تم اس سے رابطہ کر کے تفصیلات معلوم کر لینا۔ بلوما کو کڑی قیدِ تنہائی میں رکھنے کے انتظامات تمہیں کرنا ہوں گے۔ میں بعد میں تم سے بات کروں گا۔''

''میخوباد! آپ کے حکم کی تعمیل مجھ پر لازم ہے۔'' یاہو نے فرمانبرداری سے کہا۔

کارمی نے یافو کو کال اینڈ کرنے کا اشارہ کر دیا۔

یاہو نے سیل فون ایک طرف رکھا اور موجودہ صورتِ حال پر غور و فکر کرنے لگا۔ وہ کارمی سے سوال پوچھنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا مگر اس حوالے سے اس کے سوچنے پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ اس کی سوچ میں متعدد سوالات قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔

''میخوباد! ثوبان کی سرکوبی کے لیے موساد سے مدد لے رہے تھے، پھر انہوں نے بارنیا سے قطع تعلق کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ کیا ثوبان اب ان کا مسئلہ نہیں رہا یا پھر وہ موساد کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں؟ آخر وہاں سوالبار میں چل کیا رہا ہے......وغیرہ۔''

''کیوں نہ میں بارنیا ہی سے پوچھ لوں۔'' اس نے بے ساختہ خود کلامی کی۔ ''وہی میرے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہے۔''

یاہو نے دوبارہ سیل فون اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن بارنیا کو کال کرنے سے پہلے ہی اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون کے ڈسپلے نے بتایا کہ دوسری جانب ڈیوڈ بارنیا ہے۔ اس نے فوراً وہ کال پک کر لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہیلو بارنیا! میں تمہیں ہی فون کرنے والا تھا۔''

بارنیا، یاہو کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے پریشانی بھرے لہجے میں بولا۔ ''یاہو! ایک بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے......''

''کیا اس گڑبڑ کا تعلق سوالبار سے ہے؟''

''نہیں......میں نیو یارک کی بات کر رہا ہوں۔''

''تو تم نے مجھے کیوں کال کی ہے؟'' یاہو نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''اس اہم معاملے کو تو ماؤنٹ زائن والے آقا دیکھ رہے ہیں۔ تم وہاں رپورٹ کرنے کے پابند ہو۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' بارنیا نے اضطراری لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن میخوباد موساد کی حالیہ کارکردگی سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔ میری ہمت نہیں ہو رہی وہاں بات کرنے کی۔''

''مطلب......معاملہ خاصا سنگین ہے؟''

''ہاں......میں نے اسی لیے تم سے رابطہ کیا ہے۔'' بارنیا نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم میخوباد کے بہت قریب ہو۔''

''تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی بارنیا۔'' یاہو نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن پتا تو چلے کہ تمہیں کس سلسلے میں میرے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''بلوما......!'' بارنیا نے یاہو کی سماعت میں ایٹمی دھماکا کرتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔ ''اچانک کہیں غائب ہو گئی ہے۔''

بنجامن نیتن یاہو گنگ سا ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

آرکٹک ریجن کی فضا پر نازل ہونے والی چار ماہ طویل پولر نائٹ نے وہاں کے ماحول کو سحر آگین خوابیدگی میں جکڑ رکھا تھا۔ گھڑی اور کیلنڈر کی نادیدہ روشنی میں وہ اٹھائیس اکتوبر کی شام تھی اور وقت لگ بھگ سات بجے کا تھا۔ شب و روز کے اس حیرت انگیز نظام کے بارے میں سوچتے ہوئے جاسم کے ذہن میں ایک اچھوتے خیال نے انگڑائی لی اور اس کے رگ و پے میں ایک خوشگوار سنسنی دوڑ گئی۔

''ایشتار نے مجھے تین راتوں والا جو عمل بتایا تھا، اس کا تعلق تین بھرپور نیندوں سے تھا کیونکہ نان پولر دنیا میں انسان عموماً رات ہی کو اپنی نیند پوری کرنے کے لیے سوتا

"مگر میں اس وقت ناراتھ پول پر ہوں اور اس خطے میں چار ماہ کی رات شروع ہو چکی ہے۔" اس نے وضاحت کی۔ "اگر میں اسے ایک رات تصور کر لوں تو دوسری رات کے عمل کے لیے مجھے چار ماہ انتظار کرنا پڑے گا اور یہ کوئی معقول بات نہیں۔ تو پھر میں کیا کروں......؟"

"سیدھی سی بات ہے۔" اس نے خود سے سوال کیا تھا۔ اسے اپنے اندر ہی سے جواب بھی مل گیا۔ "مجھے تین بھرپور نیندوں کو تین راتوں پر محمول کرنا چاہیے۔ اس طرح میں بہتر گھنٹوں کے بجائے چالیس یا پھر پینتالیس گھنٹوں میں تین بار گہری نیند لے کر اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہوں۔"

اس آئیڈیا کے اندر منطق کا بھرپور عمل دخل تھا اس لیے اس کے دل میں گھر کر گیا۔ اگر وہ چھ سات گھنٹے کی بیداری کے بعد اتنے ہی وقت کی ایک نیند لے لیتا تو اس کا مسئلہ کم و بیش چالیس گھنٹے میں حل ہو سکتا تھا۔

وہ پُراسرار میسج ساکورا کے نمبر پر موصول ہوا تھا لیکن جاسم نے اسے ٹیلی پورٹیشن کے بارے میں بتانے کے بجائے اس حوالے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور یہ کئی زاویوں سے اس کے حق میں تھا۔

وہ دونوں اس وقت گیسٹ ہاؤس کے اندر ڈنر کر رہے تھے۔ سالوں سے غیر آباد رہنے کے باعث وہاں کا الیکٹرک سپلائی سسٹم فعال نہیں رہا تھا۔ موسم کی سختی کا مقابلہ کرنے کے لیے آتشدان روشن تھا اور اسی روشنی سے دیگر امور کو بھی جیسے تیسے انجام دیا جا رہا تھا۔ ساکورا ایک تجربہ کار شیف تھی۔ ڈنر اسی نے تیار کیا تھا۔

"یہ کون سی ڈش ہے۔" جاسم نے پوچھا۔ "میں نے اس طرح کا کھانا پہلے کبھی نہیں کھایا۔"

ساکورا نے بتایا۔ "یہ جاپان کی نیشنل ڈش "سوشی میشی" ہے جسے عام طور پر سوشی ہی کہا جاتا ہے۔"

بات کے اختتام پر وہ اداس ہو گئی۔ اس کی اداسی میں دکھ سے زیادہ نفرت کا عنصر نمایاں تھا۔ جاسم نے اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو فوراً بھانپ لیا اور کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

"کیا ہوا ساکورا......!" جاسم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "تم اتنی ڈسٹرب کیوں نظر آ رہی ہو۔ سوشی کا ذکر کرتے ہوئے تمہارے انداز میں تلخی کیسے شامل ہو گئی۔ کیا جاپان کے اس قومی پکوان کے ساتھ تمہارے ماضی کا کوئی ناخوشگوار واقعہ جڑا ہے۔"

"ثوبان! میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ موساد والوں کے ڈین میں آنے سے پہلے میں ایک جاپانی ریسٹورنٹ "ٹوکا" میں بطور شیف کام کرتی تھی۔" وہ زہر گھولتے ہوئے کڑوے لہجے میں بولی۔ "جیفری سے وہیں پہ میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سوشی کھانے ٹوکا آیا کرتا تھا۔ میرا دماغ خراب ہوا تھا کہ میں اس کی جھوٹی محبت کے فریب میں آ گئی۔ جیف نے مجھے ٹوکا چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور میں ڈین میں آ گئی۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ڈین کے اندر میری حیثیت کسی قیدی سے زیادہ نہیں ہے اور جیف کی محبت بھی اس کی ہوس کا ایک خوش نما نام تھا۔"

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔ ساکورا، جاسم کو اپنی ناکام محبت اور جیفری کے دھوکے کے بارے میں مختصراً بتا چکی تھی اور یہ بھی کہ وہ پچھلے ایک سال سے ڈین میں ان لوگوں کے ساتھ تھی۔

"ساکورا! تمہارے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کرنے والا جیفری اپنے قرار واقعی انجام کو پہنچ چکا ہے۔" جاسم نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "وہ ایسے ہی بھیانک سلوک کا مستحق تھا۔ اس کم ظرف اور کمینے انسان کے بارے میں سوچ کر تم اپنے آپ کو دکھی نہ کرو۔"

"ثوبان! تم نے جیف کو جس بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے، اس نے میرے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے۔" وہ ممنونیت بھری نظر سے جاسم کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "آری گاتو......!"

"یو آر ویل کم ساکورا!" جاسم نے اس کے شکریے کے جواب میں کہا۔ "ماضی کے کڑوے تجربات کو یاد کر کے اپنے حال کو زہر آلود بنا لینا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ جیف پر لعنت بھیجو اور مجھے سوشی کے بارے میں بتاؤ۔ میں اس لذیذ اور خوش ذائقہ ڈش کے اجزائے ترکیبی سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔"

جاسم کو جاپانی ڈش سے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں تھی جیسا کہ وہ ظاہر کر رہا تھا۔ یہ محض ساکورا کا دھیان بٹانے کے لیے تھا۔ جاسم اسے دل گرفتگی والی حالت سے باہر لانے کا خواہش مند تھا اسی لیے اس نے ساکورا سے سوشی کی ریسیپی کے بارے میں سوال کیا تھا۔

"روایتی جاپانی ڈش "سوشی میشی" دراصل سرکے میں بھیگے ہوئے چاولوں سے تیار کی جاتی ہے جس میں چینی، نمک اور مختلف قسم کی سبزیوں کے علاوہ گوشت اور انڈے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ گوشت میں عموماً سی فوڈ کا استعمال کیا جاتا ہے مگر میں نے تمہاری خاطر اس میں تھوڑی تبدیلی کی ہے۔"

''مثلاً کس قسم کی تبدیلی؟'' جاسم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''سوشی کی تیاری میں کچے گوشت کا استعمال کیا جاتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں نے اس میں شامل مچھلی کو پہلے الگ سے فرائی کرلیا تھا۔''

''آری گاتو ساکورا......!'' جاسم نے بے ساختہ کہا۔

''ثوبان! تمہارے منہ سے جیپنیز سن کر مجھے اچھا لگا۔'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم بہت تیزی سے پک کررہے ہو۔ اگر تم میرے ساتھ رہے تو میں تمہیں اپنی زبان سکھا کر ہی رہوں گی۔''

''ساکورا! میں ایک فلسطینی مسلمان ہوں۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مسلمان کچا گوشت کھانے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس سوشی میں شامل فش کو فرائی کرکے تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے......آری گاتو!''

جاسم نے دوبارہ اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

ساکورا کا موڈ ٹھیک ہو چکا تھا۔ سوشی سے دو، دو ہاتھ کرتے ہوئے وہ ایمشل تھیوڈور کو گھیرنے، پچھاڑنے اور رگیدنے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ ساکورا دن میں تین، چار گھنٹے سٹی میں گزار کر آئی تھی۔ جاسم کی ہدایت کے مطابق اس نے تمام اہم معلومات اور ضروری سامان خرید لیا تھا۔ کچھ چیزیں وہ رابرٹ والے کاٹیج ''آر۔تھرٹی'' سے بھی اٹھا لائے تھے جن میں زود اثر اسپرے، ایڈہیسیو ٹیپ اور بھری ہوئی گنز شامل تھیں۔ ساکورا جو سامان خرید کر لائی تھی، اس میں ''الیکٹروشاک ویپنز'' خاصے کی شے تھی جس کے استعمال سے اپنے دشمن کو وقتی طور پر مجبور اور بے دست و پا کیا جاسکتا تھا۔

''تمہارا شکار ایمشل کل صبح نو بجے ناروے سے فلائی کرے گا۔'' ساکورا نے بتایا۔ ''دو گھنٹے کے بعد اس کی فلائٹ گیارہ بجے لانگ ایئربین کے ائرپورٹ پر لینڈ کرے گی۔''

''میرا نہیں، ہمارا شکار......!'' جاسم نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اس مشن میں تم مجھ سے الگ نہیں ہو۔ ایمشل ہم دونوں کا دشمن ہے۔''

جاسم کے اس اپنائیت بھرے انداز پر ساکورا محبت پاش نظر سے اسے تکنے لگی۔ ان لمحات میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ جاذبِ نگاہ اور نکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جاسم جم کر اسے دیکھنے لگا۔

''میں نے ٹورازم ڈپارٹمنٹ کے ساتھ بھی کچھ عرصہ، ٹورسٹ گائیڈ کی حیثیت سے کام کیا ہے۔'' ساکورا نے بتایا۔ ''ایمشل کی لینڈنگ سے پہلے ہی میں ایک گاڑی کے ساتھ ائرپورٹ پہنچ جاؤں گی پھر اسے پک کرنے کے بعد اس کے ہوٹل پہنچادوں گی۔ اس طرح ہمیں ایمشل کے ٹھکانے کی لوکیشن معلوم ہوجائے گی جس کے بعد ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔''

''ایمشل تھیوڈور دنیا کے سب سے خطرناک جادو ''قبالہ'' کا ماہر ہے۔'' جاسم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھنے کی غلطی نہیں کرنا، ورنہ وہ تمہیں ٹریپ کرلے گا اور ہمارا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔''

''واتاشی او شنجیتے......!''

''واتاشی او شنجیتے......؟'' جاسم نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''مجھ پر بھروسا رکھو......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے ساتھ رہ کر میں بھی خطروں سے کھیلنا سیکھ جاؤں گی۔ اس کی جادوئی آنکھوں سے بچاؤ کے لیے میں سیاہ چشمہ لگالوں گی۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر پُراعتماد لہجے میں بات مکمل کردی۔

''میں اپنے تعلقات استعمال کرکے ٹورازم ڈپارٹمنٹ سے ایک کیب حاصل کرلوں گی۔ ایمشل کو ائرپورٹ سے اٹھا کر اس کے ہوٹل تک پہنچانا میری ذمے داری ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ثوبان۔''

ساکورا کے جی داری سے بھرپور مردانہ انداز نے جاسم کو متاثر کیا۔ اس کے قد کاٹھ اور پورٹیبل سائز کو دیکھ کر بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ پاکٹ سائز لڑکی اندر سے اتنی مضبوط اور بہادر ہوگی۔ ویسے پچھلے چوبیس، تیس گھنٹوں میں ساکورا نے اپنی پھرتی اور ذہانت سے متعدد بار یہ ثابت کیا تھا کہ وہ جاسم کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

بہادر انسان، نڈر اور حوصلہ مند انسانوں کو پسند کرتے ہیں اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جاسم بھی ان لمحات میں ساکورا کو تک رہا تھا اور اس کے دیکھنے میں ستائش سے زیادہ انسیت جھلکتی تھی۔ بچی دکھائی دینے والی ساکورا اندر سے سچی اور پکی تھی۔

''ٹور آپریٹنگ ڈپارٹمنٹ آف سوالبار سے کیب حاصل کرنے میں اگر تمہیں کوئی دشواری پیش آئے، میرا مطلب ہے پیسوں کی ضرورت ہو تو بلاتکلف بتا دینا۔'' جاسم نے کہا۔ ''سیل فون میرے ہاتھ میں آگیا ہے۔ میں یہ

آسانی کہیں سے بھی رقم کا بندوبست کرلوں گا۔"

"فی الحال تو اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے، دوٹوک انداز میں بولی۔ "میری کریڈٹ لمٹ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میں آسانی سے مینج کرلوں گی اور جب واقعتاً ضرورت ہوئی تو تم ہی سے مانگوں گی ثوبان...... اس دنیا میں تمہارے سوا میرا اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔"

ساکورا کے آخری جملے نے جاسم کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجادی تاہم اس گھنٹی کی آواز میں ایک خاص قسم کی لذت پائی جاتی تھی۔ وہ گھنٹی خطرناک کم اور طرب ناک زیادہ تھی......

"ٹیلوما کی فلائٹ کے بارے میں کچھ پتا چلا......؟" جاسم نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس فلائٹ کی آمد پرسوں پیر کی رات دس بجے متوقع ہے مگر اس کی پسنجرز لسٹ ابھی اپ ڈیٹ نہیں ہوئی۔"

"اوکے۔" جاسم نے کہا۔ "صبح والے واقعے کو لے کر لانگ ایریزینن میں کیا چل رہا ہے؟"

"کوبے نمبر" "آرتھرنی" میں جو ہوا، وہ سب کے لیے ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز ہے۔" ساکورا نے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے بتایا۔ "دو دھماکا اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاری نے عوام سے زیادہ یہاں کی انتظامیہ کو تشویش میں ڈال دیا ہے۔ وہ اس سانحے کی وجوہات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

ڈنر کے بعد ساکورا کچن کی جانب بڑھ گئی۔ وہ گیسٹ ہاؤس اگرچہ مہمانوں سے غیر آباد پڑا تھا لیکن اس کا سامان [illegible] کے اندر داخل ہو کر سامان [illegible] نکال سکے۔ علاوہ ازیں ساکورا نے اپنی ضرورت کا [illegible] سامان بھی خرید لیا تھا۔

"کھانے کے بعد [illegible] جاپان [illegible] ہے۔" ساکورا، جاسم کے [illegible] بولی۔ "آپ کسی بھی ہوٹل چلے جاؤ [illegible] لازمی چیز کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔"

"بہت خوب!" جاسم [illegible] ہوئے [illegible] کہا۔ "جاپان [illegible] روایت [illegible] ہے [illegible]

میں اس راز کو جاننا چاہتا ہوں۔"

"عام طور پر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ دنیا کی آبادی میں اضافہ ہورہا ہے۔ بہت کم ممالک نے اپنی آبادی کو بڑھنے سے روک رکھا ہے۔ جاپان کا معاملہ بالکل الٹ ہے اس کی آبادی میں مسلسل گھٹاؤ دیکھنے میں آرہا ہے۔"

"ثوبان! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس وقت جاپان کی آبادی لگ بھگ ساڑھے بارہ کروڑ ہے جس میں سوا چھ کروڑ شنتومت، پونے چھ کروڑ بدھ مت، پچیس لاکھ کرسچین، ڈھائی لاکھ مسلمان اور باقی دیگر اقوام ہیں مگر ہر سال ان اعدادوشمار میں کمی آرہی ہے اور اس کی چند بنیادی اور ٹھوس وجوہات ہیں۔"

"میرا سوال انہی وجوہ کی جان کاری کے بارے میں تھا۔" جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں سمجھتا ہوں تم سے زیادہ اچھے انداز میں اور کوئی اس کی وضاحت نہیں کرسکتا۔"

"جاپان کی تیزی سے کم ہوتی آبادی کی چند اہم وجوہات ہیں۔" ساکورا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جاپان کا پاسپورٹ بہت طاقتور ہے لہٰذا جاپانی شہریوں کو کہیں بھی آنے جانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جاپان میں پچاس فیصد ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے ہیں، دس فیصد ستر سال سے اوپر اور بیس فیصد ہنڈریڈ پلس میں ہیں۔ باقی بچے بیس فیصد تو اس میں جوان اور ادھیڑ عمر زیادہ ہیں جبکہ بچے انتہائی کم تعداد میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جاپان کی ینگ جنریشن، ویسٹرن کلچر کی فین ہے اس لیے وہ سب سے زیادہ تعداد میں اپنے ملک کو چھوڑ کر یورپ، امریکا اور دوسرے مغربی ممالک میں سیٹ ہورہے ہیں اور سب سے اہم سبب [illegible]" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر معتدل انداز میں کہا۔

"جاپان کا فیملی سسٹم پوری طرح تباہ ہوچکا ہے ثوبان!"

"میں [illegible] سمجھا نہیں [illegible]" جاسم نے اُلجھن زدہ نظر سے ساکورا کی طرف دیکھا۔

"جاپان میں شادی کا رجحان لگ بھگ ختم ہوگیا [illegible]" اس [illegible] کہا۔ "اس لیے وہاں بچے اور نوعمر بہت کم نظر آتے [illegible] شادی سے گریز کی وجہ [illegible] تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ جاپانی کم از کم پندرہ

اورزیادہ سے زیادہ بیس گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں، اس کے بعد معیاری گزر بسر ممکن ہو پاتی ہے چنانچہ جاپانی شادی ایسے جھنجٹ اور بچوں جیسے بکھیڑے افورڈ نہیں کر سکتے۔ معاشی اور معاشرتی مسائل انسان کو مشین بنا کر رکھ دیتے ہیں ثوبان!"

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ جاپان کی ترقی کا راز ایمان داری، انصاف پسندی اور اَن تھک کڑی محنت میں چھپا ہوا ہے۔" جاسم نے کہا۔ "میں نے سنا ہے، دوسری جنگِ عظیم میں امریکا کی ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہیروشیما اور ناگاساکی کی خوفناک تباہی کے بعد، بادشاہِ وقت نے یہ اعلان کیا تھا کہ آج کے بعد جاپان کبھی کوئی جنگ نہیں لڑے گا۔ شہنشاہ نے جاپانی قوم کو پیغام دیا تھا کہ وہ ہتھیار پھینک کر اوزار اٹھالیں۔"

"ثوبان! تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔" ساکورا تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "شاہِ وقت کے حکم کے مطابق، جاپانی قوم نے ہتھیار کو اپنی زندگی سے نکال کر اوزار (سائنس اینڈ ٹیکنالوجی) سے ناتا جوڑ لیا تھا اور آج ہم باقی دنیا سے نصف صدی آگے ہیں۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن تمہاری ایک بات مجھے ہضم نہیں ہوئی......"

"کون سی بات؟" ساکورا نے سوالیہ نظر سے دیکھا۔

"چاہے کتنی بھی زیادہ مصروفیت اور مہنگائی کیوں نہ ہو مگر انسان اپنی فطری ضروریات سے منہ نہیں موڑ سکتا۔" جاسم نے کہا۔ "اگر جاپانی لوگ شادی جیسے اہم بندھن سے دور بھاگنے لگے ہیں تو پھر وہ اپنی نفسانی اور جبلی خواہشات کو کیسے پورا کرتے ہیں؟"

"ربر کے کھلونوں سے!" ساکورا نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔

جاسم نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیا واقعی؟"

"ہاں...... بالکل!" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ "جاپان اور ہانگ کانگ اس چلن میں سرفہرست ہیں۔"

"یہ چلن نہیں، بدچلنی ہے۔" جاسم نے ناگواری سے کہا۔ "کھلونے تو بچوں کو بہلانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ان سے کھیلنا بچوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ ایک بالغ انسان اپنے جذبات کی تسکین کے لیے دوسرے انسان کے قرب کا متلاشی ہوتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ثوبان!......" وہ مخمور لہجے میں بولی۔ "فطری تقاضوں سے دور رہ کر انسان نامکمل ہے۔"

"صرف ٹھیک کہہ دینا کافی نہیں ہے۔" جاسم نے محبت پاش نظر سے اُسے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اپنے کہے کو کر کے بھی دکھانا پڑتا ہے۔ انسان کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کی تلاش اور جستجو کا کام جاری رہنا چاہیے۔"

"ہاں، ہاں...... ضرور!" وہ اس کے نزدیک آگئی اور عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔ "ثوبان! تمہارا وہ اندر کا بخار کیسا ہے......؟"

گزشتہ شب ناجیہ کے حوالے سے ایک اذیت ناک خواب دیکھنے کے بعد جاسم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ ان لمحات میں، منفی تیس درجہ سینٹی گریڈ پر بھی اس کا بدن پسینا اگل رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت کی وضاحت میں اس نے ساکورا کو بتایا تھا کہ یہ اس کے اندر کا بخار ہے۔ اس وقت ساکورا اسی معما بخار کی بابت پوچھ رہی تھی۔

"مجھے کیا معلوم......" جاسم نے ایک انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "تم خود چیک کرلو۔"

جاسم نے گرین سگنل دیا تو وہ چیکنگ کی غرض سے اس کی پسلیوں میں گھسنے کی کوشش کرنے لگی۔ جاسم نے اپنے طبی معائنے میں کسی احتراز یا مزاحمت کے بجائے ساکورا کو جانچ پڑتال کا پورا موقع فراہم کرتے ہوئے اسے اپنے فولادی بازوؤں کی گرفت میں سمیٹ لیا۔

"ثوبان! تم اسمارٹ ہو......" ساکورا نے بے ترتیب سانس کے ساتھ کہا۔ "آناتاداکاشکوئے ڈیس...... میں نے!"

ساکورا کی بات ادھوری رہ گئی۔ جاسم نے اس کی گویائی پر اپنے ہونٹوں کا قفل ڈال دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے جاپانی گڑیا، بارود کی پُڑیا بن گئی۔ ایسا لگ رہا تھا، جاپان کے سب سے خوفناک آتش فشاں "ماؤنٹ فوجی" نے آرکٹک ریجن میں اپنا دہانہ کھول دیا ہو۔

☆☆☆

انتیس اکتوبر، بہ روز اتوار ٹھیک دن کے گیارہ بجے اسکینڈے نیوین ائرلائنز "ایس اے ایس" کی فلائٹ نے لانگ ایئربین کے ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔ یہ فلائٹ، ناروے سے آئی تھی اور اسی ہوائی جہاز کی ایک سیٹ پر ایمشل تھیوڈور بھی موجود تھا اور یہی مسافر ساکورا کا پرائم ٹارگٹ بھی تھا۔

جاسم اور ساکورا نے ایمشکل کو چھاپنے کے لیے دو منصوبے بنائے تھے یعنی پلان اے اور پلان بی۔ اس وقت ساکورا پلان اے کے مطابق ائرپورٹ پر موجود تھی۔ اگر یہ منصوبہ کارگر ثابت نہ ہوتا تو پھر پلان بی کو آزمایا جانا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ گیسٹ ہاؤس سے نکلے تھے۔ ساکورا نے

جاسم کو کرائے پر ... اسکا ... اولی تھی ... کو لو بیں دونوں ہی آپشن تھے ۔ مطلب وہ بہ لب پر کال کر آ سکے بڑھ سکتی تھی اور موافق موسم میں اسے ٹائروں پر بھی چلایا جا سکتا تھا ۔ اسکوٹر کے ساتھ ہی جاسم کو ... بھی مل گیا تھا۔ اس بھاری ہیلمٹ کو پہننے کے بعد جاسم کی ... ''محفوظ'' ہو گئی تھی ۔ جاسم، ائرپورٹ سے تھوڑے فاصلے پر واقع ''لومین سپر مارکیٹ'' نامی سپر اسٹور کے ... ہی ... الرٹ تھا۔

ساکورا ائرپورٹ کے ارائیول ایریا میں ٹہلتے ہوئے لگیج ہال کی طرف آگئی ۔ جہاز اگرچہ لینڈ کر چکا تھا مگر ابھی تک مسافروں نے باہر آنا شروع نہیں کیا تھا ۔ تاہم ان کا سامان لگیج ہال میں پہنچا دیا گیا تھا جو کنویئر بیلٹ پر رکھا حرکت پذیر تھا۔

ساکورا پُراعتماد قدموں سے چلتے ہوئے کنویئر بیلٹ کے نزدیک چلی گئی اور اس پر موجود لگیج کو بہ غور دیکھنے لگی ۔ وہ ایمشل تھیوڈور کے نام سے تو واقف تھی مگر اس کی صورت آشنا نہیں تھی اسی لیے وہ مسافروں کے سامان کو جاسوسانہ انداز میں گھور رہی تھی ۔ چند منٹ میں ساکورا کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی ۔ میرون کلر کا ایک سوٹ کیس اس کی نگاہ کے فریم میں آگیا ۔ وہ ایک درمیانے سائز کا سوٹ کیس تھا جس کے ہینڈل پر ''ایمشل تھیوڈور'' کے نام کا ٹیگ لگا ہوا تھا ۔ ساکورا نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور کنویئر بیلٹ سے تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑی ہوگئی ۔ تاہم اس کی عقابی نظر مذکورہ میرون سوٹ کیس پر ہی جمی ہوئی تھی ۔

یہ ایک بڑی کامیابی تھی ۔ اب وہ اس سوٹ کیس کے ذریعے بہ آسانی ایمشل تک رسائی حاصل کر سکتی تھی ۔ اس نے جاسم کو فون لگایا اور پُرجوش انداز میں بتایا۔

''تو ہان! پرندہ اپنے گھونسلے سے نکلنے ہی والا ہے ۔ میں نے اس کے سامان پر نظر رکھی ہوئی ہے ۔''

''یوئی!'' جاسم نے اسے شاباشی دینے کے لیے ''...'' کہا۔

''یوئی ...... ... ہے!'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی ۔ ''تم نے گڈ کہنا کہاں سے سیکھا؟''

''... !'' جاسم نے جواب دیا ۔ ''میں یہاں ... ہوں ... میں نے ... جاپانی لینگویج کی اسٹڈی شروع کر دی ۔ اس طرح میں نے دو تین الفاظ یاد کر لیے ۔''

''... !'' ساکورا نے تعریفی انداز میں کہا۔

''بہت خوب ......!''

جاسم نے اس ... ''... !''

''... ائرپورٹ ... جانب ... ہے ...'' ساکورا نے کمپنی ... سے کہا ۔ ''ایمشل ... سوٹ کیس اٹھا رہا ہے ۔ میں چند منٹ کے لیے اسے باتوں میں الجھا کر رکھوں گی ۔ تب تک تم ... جاؤ ۔''

''یوکائی ائی ......!''

جاسم نے جاپانی میں اس سے کہا تھا ۔ ''آئی گاٹ اٹ!'' ساکورا کی حیرت دو چند ہوگئی ۔ وہ اس موضوع پر جاسم سے تفصیلی بات کرنا چاہتی تھی لیکن اسی دوران میں ایمشل اپنے سوٹ کیس کے ساتھ ائرپورٹ کی عمارت سے باہر جانے والے راستے کی جانب بڑھ گیا تھا ۔ ساکورا نے سیلولر رابطہ موقوف کیا اور اپنے کام سے لگ گئی ۔

''سر! کیب چاہیے؟'' ساکورا نے ایمشل کے سامنے پہنچ کر شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔

وہ رک گیا ۔ پھر اس نے گہری نظر سے ساکورا کو گھورا ۔ جاسم کی ہدایت کے مطابق، ساکورا نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا جس کی برکت سے ایمشل اس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے سے قاصر تھا۔

''سر! آپ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' ساکورا نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا ۔ ''اگر آپ کو کیب کی ضرورت نہیں تو صاف منع کر دیں تاکہ میں کسی اور پسنجر کو اپروچ کر سکوں ۔''

ساکورا بڑے اعتماد کے ساتھ پلان اے پر عمل کر رہی تھی ۔ ایمشل کا رکنا اس امر کا ثبوت تھا کہ اسے کہیں جانے کے لیے کوئی سواری تو لازمی درکار ہے ورنہ وہ ''سوری'' کہہ کر آگے بڑھ جاتا ۔ ساکورا، بات چیت کے بہانے تھوڑا ٹائم گزارنا چاہتی تھی تاکہ جاسم اس کے نزدیک پہنچ جائے ۔

''ایسی بات نہیں ہے ۔ مجھے اپنے ہوٹل تک جانے کے لیے کیب تو چاہیے ۔'' ایمشل نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا ۔ ''کیا تم چائنیز ہو؟''

''نو سر ...... آئی ایم جیپ ......!'' ساکورا نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا ۔ ''میں دس سال سے یہ کام کر رہی ہوں ......''

''ویری گڈ!'' ایمشل تعریفی انداز میں بولا ۔ ''تم جیپ (جاپانی) ہو اس لیے میں تمہاری کیب میں ضرور بیٹھوں گا ......''

''تھینک یو سر!'' ساکورا تشکرانہ انداز میں بولی پھر میرون سوٹ کیس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لائیں، اپنا سامان مجھے دے دیں۔"

کوئی ٹرالی لینے کے بجائے ایمشل نے اپنا سوٹ کیس خود ہی اٹھا لیا تھا۔ "یہ بہت ہلکا ہے۔" اس نے کہا۔ "اس میں میرے استعمال کے چند کپڑے ہیں۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں تمہیں یہ زحمت نہیں دے سکتا۔"

ساکورا کو ایسا محسوس ہوا کہ ایمشل کے سوٹ کیس میں کوئی نہایت ہی اہم چیز ہے اس لیے وہ اپنے سامان کو کسی کیب ڈرائیور کے حوالے کرنے کا رسک نہیں لینا چاہتا۔

"جیسی آپ کی مرضی سر.....!" ساکورا نے کندھے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔ "آپ مجھے فالو کریں۔"

بات ختم کرتے ہی وہ آگے بڑھ گئی۔ ایمشل نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔ "اچھی لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟"

"ٹیکو.....!" ساکورا نے جواب دیتے ہوئے اس نام کے ہجے بھی کر دیے۔ "ٹی کو.....!"

"ٹی.....کو.....!" وہ دہراتے ہوئے بولا۔ "بہت پیارا نام ہے۔"

"تھینک یو سر!" ساکورا نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

ان کے درمیان یہ تمام بات چیت بین الاقوامی زبان انگریزی میں ہو رہی تھی۔ جلد ہی وہ دونوں ساکورا والی کیب کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس دوران میں جاسم بھی اپنی اسنو اسکوٹر کے ساتھ ائرپورٹ کے ایگزٹ پر پوزیشن سنبھال چکا تھا۔

ساکورا نے اپنے "پسنجر" کے سامان کے لیے کیب کی ڈکی کھولی تو ایمشل نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"سوری ٹیکو! اس سوٹ کیس کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے سر!" ساکورا نے کہا۔

ساکورا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ایمشل عقبی نشست پر براجمان ہو گیا۔ میرون سوٹ کیس کو اس نے اپنے پہلو میں سیٹ پر ہی رکھ لیا تھا۔ ایمشل کے اس رویے سے ساکورا کا شک یقین میں بدل گیا کہ ایمشل نے اس سوٹ کیس کے اندر یقیناً کوئی خزانہ چھپا رکھا ہے۔ بہرکیف، اس نے سوال کیا۔

"سر! آپ نے کسی ہوٹل میں بکنگ کروا رکھی ہے یا اس سلسلے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟"

"ہوٹل نوٹلن لاج میں میری ریزرویشن کنفرم ہے۔" ایمشل نے بتایا۔ "تم مجھے وہیں لے چلو.....!"

"زبردست!" ساکورا نے کیب کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ [illegible] ایک پہاڑی [illegible] پہاڑ بہت [illegible] منٹ میں [illegible] جانتے ہیں۔"

ساکورا پچھلے [illegible] ایڈمنٹن کو بتا رہی تھی [illegible] محض ایمشل [illegible] کرنے کے لیے [illegible] نہیں کی تھی [illegible] نامی پہاڑی [illegible] ہوٹل اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے ایک [illegible] پچاس یو ایس ڈالر تھا یعنی پاکستانی کرنسی میں کم و بیش ایک لاکھ چھبیس ہزار روپے..... صرف ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہی نہیں، البتہ ایڈمنٹن کی ہر چیز دولت مند افراد کے لیے جنت ہے۔ اگر آپ پیسے والے نہیں تو پھر ادھر کا رخ نہ کریں ورنہ اس سرد جہنم کے اسیر ہو کر رہ جائیں گے۔

"سر! میں آپ سے ایک بات تو پوچھنا ہی بھول گئی۔"

"لو اینڈ شو..... اب پوچھ لو!"

"آپ پے منٹ کیسے کریں گے؟" ساکورا نے استفسار کیا۔

"تم نے پچاس ڈالرز کرایہ بتایا تھا۔" ایمشل نے کہا۔ "ہوٹل پہنچ کر میں تمہیں پچاس ڈالرز ادا کر دوں گا۔"

"کیش.....؟"

"ظاہر ہے..... یہ تو بہت معمولی رقم ہے۔"

"سر! بات چھوٹی یا بڑی رقم کی نہیں ہے۔" ساکورا نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "دراصل سوالبارڈ میں کیش ڈیلنگ پر پابندی ہے۔ یہاں کی گورنمنٹ کی نظر میں یہ قابلِ تعزیر جرم ہے۔ صرف ٹپ کی صورت میں آپ کیش چند ڈالرز پے کر سکتے ہیں۔ باقی تمام پے منٹس کریڈٹ کارڈ، ڈیبٹ کارڈ یا پھر آن لائن اکاؤنٹ ٹرانسفر سے کی جاتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں آن لائن ٹرانسفر کر دوں گا۔" ایمشل نے کہا۔ "منزل پر پہنچنے کے بعد تم مجھے اپنی اکاؤنٹ ڈیٹیلز دے دینا۔"

ساکورا ایسی غلطی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کے اکاؤنٹ کا ٹائٹل "ساکورا" تھا۔ اگر وہ اپنی اکاؤنٹ ڈیٹیلز ایمشل کو دے دیتی تو وہ جان جاتا کہ ساکورا، ٹیکو نہیں ہے۔ جاسم نے ساکورا کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ اسے ساکورا کی حیثیت سے اپنی شناخت کو چھپا کر رکھنا ہے۔ پے منٹ کا دوسرا طریقہ کریڈٹ کا

ایپٹ کارڈ کا استعمال تھا مگر ساکورا کے پاس کارڈ ریڈنگ مشین نہیں تھی۔

''کوئی بات نہیں سر......!'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میں آپ سے کیش بھی لے لوں گی مگر آپ کسی کو اس بارے میں بتانا نہیں ورنہ مجھے فائن لگ جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے......!'' ایمشل ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میچیکو! تم واقعی ایک اچھی لڑکی ہو۔''

ویسے ساکورا نے ایمشل سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ سوالبار میں بینک نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے اور ''اے ٹی ایم'' وغیرہ بھی آپ کو کہیں دکھائی نہیں دیں گے۔ دو ہزار بیس سے پہلے تک لانگ ایئربین میں سینٹرل بینک آف ناروے ''نورگا بینک'' کی ایک برانچ ہوا کرتی تھی جس کا اسٹاف دنوں یا ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں فارغ بیٹھا اپنے کسٹمرز کی راہ تکتا رہتا تھا۔ مجبوراً نورگا بینک کو اس برانچ کا آپریشن روکنا پڑا۔ وہاں پر کیش ڈیلنگ اس لیے بھی ممنوع ہے کہ آرکٹک ریجن کے باسی چوبیس گھنٹے اپنے ہاتھوں پر موٹے گرم دستانے پہنے رہتے ہیں جس کے باعث کرنسی کو گننے کا عمل ناممکن کی حد تک مشکل ہو جاتا ہے۔

ساکورا کی کیب ''وی آئے'' اسٹریٹ میں داخل ہونے کے بعد ''ہاؤ گن ہل'' پر واقع فونکن لاج کی پُرشکوہ سرخ عمارت کے سامنے رک گئی۔ ایمشل نے کیب کا کرایہ ادا کر دیا تو ساکورا نے کہا۔

''میں نے سوالبار کے ٹورازم ڈپارٹمنٹ کے ساتھ بھی کچھ عرصہ کام کیا ہے سر......اگر آپ کی خواہش ہو تو میں صرف دو سو ڈالرز میں پورے لانگ ایئربین کی سیر کرا سکتی ہوں......میں نے کل دن میں ایک فلسطینی نوجوان کو بھی یہ سروس دی تھی۔''

ساکورا کے آخری جملے نے ایمشل تھیوڈور کو چونکا دیا تاہم اُس نے اپنے اندرونی جذبات چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیے اور سوچنے لگا۔ ''یہ جاپانی لڑکی بہت کام کی ہے۔ ٹورسٹ گائیڈ ہونے کی حیثیت سے یہ یہاں کے تازہ ترین حالات سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ مجھے میچیکو کو اپنی مٹھی میں رکھنا چاہیے۔ ثوبان کے حوالے سے یہ میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔''

''سر! آپ کس سوچ میں ڈوب گئے۔'' ساکورا نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''میں زیادہ پیسے بنانے کے لیے آپ کو [illegible] ایک لڑکی [illegible] رہی۔ یہ تو [illegible] کی بات ہے۔ اگر آپ لانگ ایئربین کی سیر کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔''

''ایسی بات نہیں ہے ساکورا......!'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ میں جس فلسطینی شخص کی تلاش میں یہاں آیا ہوں، کہیں وہ نوجوان وہی تو نہیں جسے کل تم نے اپنی کار میں گھمایا تھا۔ اس بندے نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

ایمشل کے آخری استفساری جملے سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ ساکورا نے جاسم کے تیار کردہ اسکرپٹ کی روشنی میں بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''آئی ایم سوری سر! میں اپنے پسنجرز سے ان کا نام نہیں پوچھتی۔ ویسے آپ کس فلسطینی بندے کی تلاش میں ہیں۔ اگر آپ اس کا قد کاٹھ اور حلیہ مجھے بتا دیں تو میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''اور اس سروس کے لیے میں آپ سے چارج بھی نہیں کروں گی۔ یہ میچیکو کا وعدہ ہے سر!''

ایمشل نے ثوبان کی وضع قطع، عمر اور شخصیت کے حوالے سے بریف کرنے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میچیکو! میں اسرائیل سے آیا ہوں اور میرا نام ایمشل تھیوڈور ہے۔ میں ایک قوم پرست یہودی ہوں۔ ابھی میں نے تمہیں جس فلسطینی شخص کے بارے میں بتایا ہے، اس کا نام ثوبان ہے۔ اس نے ہزاروں معصوم انسانوں کو قتل کیا ہے۔ وہ ایک خطرناک دہشت گرد ہے اسی لیے میں اسے سبق سکھانے یہاں آیا ہوں۔''

''سر! آپ نے اپنے مطلوبہ بندے کا جو قد کاٹھ اور حلیہ بتایا ہے، وہ مسافر اس پر فٹ بیٹھتا ہے......'' ساکورا نے کمال کی پرفارمنس دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر مجھے تو وہ مسافر ایک دم پاگل لگا تھا۔''

''وہ کیسے میچیکو......؟'' ایمشل نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''میں اسے لانگ ایئربین کے مختلف مقامات کی سیر کرا رہی تھی کہ اچانک اس نے مجھے کیب روکنے کو کہا۔'' ساکورا نے معتدل انداز میں بتایا۔ ''میں نے کیب روکی تو اس نے مجھے کرایہ ادا کیا اور کیب سے اتر گیا۔''

''تو اس میں پاگل پن والی کون سی بات ہے؟'' ایمشل نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''میری کیب چھوڑنے کے بعد وہ ایک ایسی سمت چل

پڑا تھا جس طرف جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' ساکورا نے خوف زدہ لہجے میں بتایا۔ ''حکومت نے اس جانب جانے پر پابندی عائد کررکھی ہے۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ میری سنی، اَن سنی کرکے آگے بڑھتا چلا گیا۔''

ایمشل نے اپنے علم کو کام میں لاتے ہوئے یہ تو جان لیا تھا کہ ثوبان نے کسی ویران مقام پر پناہ لے رکھی ہے۔ آج ''مچیکو'' بھی اسے کچھ ایسا ہی بتا رہی تھی۔ اس نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

''سوالبار کی حکومت نے لوگوں پر ایسی پابندی کیوں لگا رکھی ہے۔ اس سمت میں ایسی کون سی خطرناک چیز ہے؟''

''ایک آسیب زدہ گیسٹ ہاؤس......'' ساکورا نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''جو انسان بھی اُدھر کا قصد کرتا ہے، پھر وہ زندہ واپس نہیں آتا......!''

''پھر تو وہ مسافر واقعی پاگل ہے......'' ایمشل نے سرسری انداز میں کہا پھر ثوبان کی ذات کو زیرِ بحث لانے کے بجائے اس نے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''مچیکو! میں ہوٹل میں چیک اِن کے بعد تھوڑا آرام کروں گا۔ تم ایک گھنٹے کے بعد آجاؤ، پھر ہم لانگ ایئربین کی سیر کو نکلیں گے۔''

''اوکے سر! میں بھی جب تک لنچ بریک لے لیتی ہوں۔'' ساکورا نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد میں آپ کو یہیں ملوں گی۔ ویسے آپ کا روم نمبر کیا ہے؟''

''روم نمبر ٹو تھری فور......!'' ایمشل نے بتایا۔ ''سیکنڈ فلور!''

''تھینک یو سر!'' ساکورا نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''ایک گھنٹے کے بعد میں یہیں آپ کا انتظار کروں گی۔''

ایمشل تھیوڈور کیب سے نکل کر ہوٹل فونکن لاج کی جانب بڑھ گیا۔ ساکورا اپنی کیب ڈرائیو کرتے ہوئے مخالف سمت چلی گئی۔

دس منٹ کے بعد وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے لنچ کررہے تھے۔ ساکورا نے جاسم کو ایمشل کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دی تو وہ اس کی کارکردگی پر اش اش کر اٹھا۔

''ساکورا! تم میری توقع سے بڑھ کر پرفارم کررہی ہو۔'' جاسم نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا پلان اے کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے۔''

''ثوبان! اگر میں نے تمہاری نظر اور دل میں جگہ بنانا ہے تو کچھ کرکے دکھانا پڑے گا۔'' ساکورا نے معتدل انداز میں کہا۔ ''بس، میں کوشش کررہی ہوں کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔''

''آری گاتو!'' جاسم اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ ''ایمشل کوئی عام انسان نہیں ہے ساکورا۔ وہ ہپناٹزم اور قبالہ کا ماہر ہے۔ اگر اسے تم پر شک ہوگیا تو بازی پلٹ بھی سکتی ہے۔ تمہیں ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا ہوگا، خاص طور پر تمہاری شناخت پوشیدہ رہنا چاہیے۔ تمہارے لیے یہ جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی آزمائش ہے۔ ایمشل جیسے خطرناک شخص کو دھوکا دہی ہی سے اپنے قابو میں لایا جاسکتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا......؟''

''یوکائی ڈیس!'' ساکورا نے جاسم کو یقین دلایا کہ وہ اس کا پوائنٹ اچھے سے سمجھ چکی ہے۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ثوبان! میں پوری احتیاط کے ساتھ اپنی جاب کررہی ہوں۔ واتاشی وا اروکا دی وانائے...... میں کوئی بے وقوف لڑکی نہیں ہوں۔''

جواب میں جاسم توصیفی نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ پاکٹ سائز حسینہ قدم قدم پر اسے متاثر کررہی تھی۔ واقعتاً وہ ساکورا سے ایسی ذہانت اور پُراعتماد کارکردگی کی توقع نہیں کررہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں بس، یہی سوچ کررہ گیا:

اتنے سے قد پہ بھی قیامت شریر ہو......!

☆☆☆

لانگ ایئربین میں چار ماہ طویل پولرنائٹ کی حکمرانی تھی۔ گھڑی کے ڈائل کے مطابق، اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے مگر انسانی آنکھ کے لیے صبح، دوپہر، شام اور رات میں فرق کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ چہار سو ایک ہی سماں تھا جسے ''رات'' کہنا ہی مناسب تھا۔

ساکورا پچھلے ایک گھنٹے سے ایمشل تھیوڈور کو لانگ ایئربین کی سیر کرا رہی تھی۔ اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی ایمشل کو یہ شک نہیں گزرا تھا کہ ''مچیکو'' غیرمحسوس انداز میں اس کے گرد اپنا حلقہ تنگ کررہی تھی۔

ایمشل کا علم اور ہنرمندی کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ حرفہ یمانی نے بھی جاسم کو بتایا تھا کہ ایمشل ماورائی معاملات میں اپنی چھوٹی بہن براخا سے دس ہاتھ آگے ہے لیکن وہی بات کہ جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر بھروسا کرلیتا ہے تو پھر اس کی جانب سے وہ اپنی آنکھ بند کرلیتا ہے اور دھوکے کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے۔

ایمشل کی بدبختی کہ وہ ساکورا عرف مچیکو کو ایک معصوم، بے ضرر اور صاف گو ٹورسٹ گائیڈ سمجھ بیٹھا تھا اور یہ بھی طے ہے کہ انسان جتنا زیادہ عالم اور تجربہ کار ہوتا ہے، وہ اتنی ہی

"جلبین اور بھیانک غلطی کرتا ہے۔" ایمشل نے ساکورا پر اظہار کرکے اس حماقت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"سر! مجھے تھوڑی دیر کے لیے رکنا ہوگا۔" ساکورا نے کیب کی رفتار کو کم کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"کیوں...... خیریت؟" ایمشل نے چونک کر پوچھا۔

"ایک پولیس آفیسر ہمارے پیچھے آرہا ہے......" ساکورا نے کیب کو ایک جگہ روکتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ گاڑی کے کاغذات، میرا ڈرائیونگ لائسنس اور گن چیک کرنے کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دے گا۔ یہ معمول کی چیکنگ ہے۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ایمشل نے ساکورا کے جواب میں سے صرف ایک لفظ کو پک کرلیا "گن!" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "مچیکو! کیا تم اپنے پاس گن بھی رکھتی ہو؟"

"یس سر!" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "سوالبار کے قانون کے مطابق، جو بھی شخص کھلی فضا میں نکلتا ہے، اسے اپنے ساتھ کوئی بھی آتشیں ہتھیار لازمی رکھنا پڑتا ہے ورنہ بھاری چالان ہوجاتا ہے۔"

ایمشل نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ "یہ سب کس لیے؟"

"پولر بیئر سے حفاظت کی خاطر......!" ساکورا نے کہا۔ "یہ وحشی درندہ کبھی بھی اور کہیں بھی کسی پر حملہ آور ہوسکتا ہے۔"

"اوہ اچھا!" ایمشل ایک گہری اور اطمینان بھری سانس لے کر رہ گیا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ تو بہت ضروری ہے۔"

ساکورا نے دانستہ ایسے مقام پر اپنی کیب روکی تھی جہاں سے گیسٹ ہاؤس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس نے ایمشل کو جس پولیس آفیسر کے بارے میں بتایا تھا، وہ کوئی اور نہیں بلکہ جاسم تھا۔

جاسم نے اسنو اسکوٹر کو ساکورا کی کیب کے سامنے روکا اور ہیلمٹ اتارے بغیر وہ اسکوٹر سے نیچے اتر آیا۔ مذکورہ ہیلمٹ نے جاسم کے چہرے اور سر کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی پہچان مکمل طور پر چھپ گئی تھی۔ ایمشل اسے ثوبان کی حیثیت سے شناخت نہیں کرسکتا تھا۔

جاسم نے مختلف پیپرز اور گن چیک کرنے کے بعد ساکورا سے کہا۔ "تم فوراً اپنا کام شروع کردو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

جاسم نے اپنی آواز کو اتنا دھیما رکھا تھا کہ کیب کے اندر بیٹھے ہوئے ایمشل تھیوڈور کی ساعت اس تک رسائی


مارچ 2026ء کا شمارہ ایک نظر میں

**دیس پردیس**

دلوں میں امنگ، آنکھوں میں سہانے خواب سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان **ناہید سلطانہ اختر** کے قلم سے

**ظالم مظلوم**

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات **زویا صفوان** کے قلم کی روانی

**رمز شناس**

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی دلچسپ داستان...... **نازیہ کامران کاشف** کی اچھوتی تحریر

**جنگ باز**

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم کی جادوگری

اس کے علاوہ

صائمہ دانش، عیوق بخاری، عائشہ نصیر، جاوید بسام، لبنیٰ خان، ڈاکٹر طیب سنگھانوی و دیگر کی خوب صورت تحریریں

حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ ایمشل ایسی سچویشن میں تھا کہ اس نے صورتِ حال کی تہ میں اترنے کے لیے، اپنے علم کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ بڑے بزرگ بالکل درست فرما گئے ہیں کہ اپنے علم اور تجربے کے گھمنڈ میں، سیانا کو ہمیشہ کوا کھا جاتا ہے۔

ساکورا واپس آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تو ایمشل نے بے تابی سے پوچھا۔ ”سب نمٹ گیا میکو......؟“

”یس سرا“ وہ ڈیش بورڈ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

پانچ منٹ پہلے ساکورا نے اسی ڈیش بورڈ کے اندر سے کیب کے پیپرز اور گن نکالی تھی۔ اس خانے میں اور بھی بہت کچھ رکھا ہوا تھا، اب جس کے استعمال کی باری تھی۔

ساکورا نے گن اور پیپرز وغیرہ کو اندر پہنچانے کے ساتھ ہی بڑی سرعت کے ساتھ خطرناک اسپرے والی بوتل نکال لی اور آناً فاناً، جی بھر کر ایمشل کے چہرے پر اسپرے کردیا۔ اس اذیت ناک اسپرے کے ”جادوئی“ اثرات وہ رابرٹ والے کا میچ ”آر۔تھرٹی“ میں دیکھ چکی تھی جب موساد کے تین ایجنٹس اس اسپرے کی تاب نہ لاتے ہوئے تقریباً اندھے ہی ہوگئے تھے۔ جاسم اور ساکورا نے بہ یک وقت الیکس، نک اور کرس کی آنکھوں پر اس اسپرے کو آزمایا تھا۔

ایمشل پر اس اسپرے کا کچھ زیادہ ہی گہرا اثر ہوا تھا۔ انتہائی کم فاصلے کے باعث ساکورا نے اس کی آنکھوں کو لگ بھگ نہلا ہی دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا اور اپنے حلق سے کرب ناک آوازیں نکال رہا تھا۔

جاسم کو ایمشل پر ”ترس“ آگیا۔ اس کے پاس چونکہ زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے وہ آنِ واحد میں کیب کی جانب بڑھا اور عقبی نشست والا دروازہ کھول کر ایمشل کی ”مدد“ کرنے لگا۔ جاسم نے ایمشل کو اس طرح کھینچ کر کیب سے باہر نکالا جیسے کمیٹی (کارپوریشن) والے مردہ کتوں کو اپنی گاڑی پر لادنے کے لیے گھسیٹتے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھار برف پر پٹخنے کے بعد جاسم نے سائیلنسر لگی گن نکالی اور پوری سفاکی کے ساتھ ایمشل کے دونوں گھٹنوں اور دونوں کندھوں میں ایک ایک خاموش گولی اتار دی۔

سائیلنسر کی مہربانی سے وہ فائرز بے آواز تھے لیکن ایمشل کے درد اور کرب میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ کسی کند چھری سے ذبح کیے جانے والے جانور کے مانند تکلیف کی شدت سے برف پر لوٹ پوٹ ہورہا تھا۔ جاسم نے ڈکی کھولی اور ایک میلے کپڑے کا گولا بنا کر ایمشل کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی گویائی پر بھی گویا ایک ”سائیلنسر“ لگ گیا تھا۔

ایمشل کے بدن کے چار اہم حصوں سے خون جاری ہوگیا تھا۔ جاسم نے عملاً اسے بے دست و پا کردیا تھا۔ اگر کسی انسان کے جسم سے اس کا لہو تیزی سے خارج ہونے لگے تو وہ اپنے ہوش و حواس اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ ایمشل بھی کچھ ایسے ہی حالات سے گزر رہا تھا۔ جریانِ خون نے اس کی مت ماردی تھی۔ وہ فوکس نہیں کر پارہا تھا۔ گھائل بدن کی اذیت اتنی ظالم اور ناقابلِ برداشت تھی کہ اس کے تمام پُراسرار علوم دھواں بن کر نامساعد حالات کی فضا میں تحلیل ہوگئے تھے۔

جاسم نے کار کی ڈکی سے مزید ضروری سامان نکال لیا اور ایمشل کے میرون سوٹ کیس کو بھی اپنے قبضے میں لینے کے بعد ساکورا سے کہا۔

”ساکورا! تم اپنی کیب کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانے کے بعد گیسٹ ہاؤس آجاؤ۔ باقی کی پکچر اسی بھوت بنگلے میں چلائیں گے۔“

ساکورا نے معنی خیز انداز میں جاسم کی طرف دیکھا اور ایک لفظ ادا کیے بغیر وہ کیب میں جا بیٹھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے کیب کو واپسی کے راستے پر ڈال دیا۔

ایمشل کی درگت بنانے کا پکا بندوبست کیا گیا تھا۔ ساکورا کے جانے کے بعد جاسم اپنے شکار کی جانب ”متوجہ“ ہوگیا۔ سب سے پہلے اس نے ایمشل کی جامہ تلاشی لی اور سیل فون کے علاوہ ایمشل کے قیمتی والٹ کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ میرون سوٹ کیس کو کھول کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا لہٰذا وہ اہم امور نمٹانے میں لگ گیا۔

ایمشل کی حالت دیدنی تھی۔ ان لمحات میں وہ درد کی آخری منازل سے گزر رہا تھا اور اپنی تکلیف کا ”اعلان“ کرنے میں وہ کسی سستی یا کوتاہی کا مرتکب بھی نہیں ہورہا تھا مگر اس کا کیا کیجیے کہ جاسم نے ایمشل کے ”اسپیکر“ ہی کو ”ہیک“ کرلیا تھا چنانچہ ایمشل کا اذیت بھرا اعلان نشر ہونے سے مکمل معذور تھا۔ وہ جس واہیات انداز میں، پتھر سے زیادہ سخت اور موت سے زیادہ سرد برف پر تڑپ رہا تھا، وہ کسی گونگی مووی کا سین ہی لگتا تھا۔

انسان چاہے کسی بھی علم کا ماہر کیوں نہ ہو اور چاہے ستر سال کا تجربہ بھی رکھتا ہو مگر دماغ کے تعاون کے بغیر وہ زیرو

کچھ نہیں۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو ایمشل تھیوڈور سے زیادہ کسی دوسرے ماورائی علم کو کام میں لاکر جاسم کے لیے مشکلات کھڑی کرسکتا تھا لیکن جاسم نے اس پر ایسا کاری وار کیا تھا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں رہا تھا...... اسے شیطانی طاقت اتیرے انجام پر رونا آیا۔

ایمشل بہ زبانِ خاموشی اپنے ابلیسی اختیار کا ماتم کررہا تھا مگر اس کی ''سینہ کوبی'' لق و دق برف زار کو غمگین کرنے میں قطعی ناکام تھی۔ اس کی آہ و فغاں اور نالہ و شیون سے آرکٹک ریجن کا ''دل'' پسیج نہیں رہا تھا اور جاسم بھی اس وقت اسی ریجن کا حصہ تھا۔

جاسم نے ایک مضبوط رسّی کی مدد سے ایمشل کے دونوں پاؤں کو ٹخنوں پر باندھا پھر دونوں ہاتھوں کو کلائیوں پر جکڑنے کے بعد یہی سلوک اس کی گردن اور کمر کے ساتھ بھی کیا اور آخر میں اس رسّی کے آزاد سرے کو اپنی اسنو اسکوٹر کے بیک کیریئر کے ساتھ کس کر باندھ دیا۔ اپنی اس کارروائی سے مطمئن ہونے کے بعد وہ اسکوٹر پر سوار ہوگیا۔ اس نے اسنو اسکوٹر کو سلائڈنگ اینڈ گلائڈنگ موڈ پر سیٹ کیا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

اسنو اسکوٹر کے پیچھے، اونچی نیچی ٹھنڈی ٹھار برف پر گھسٹتے ہوئے ایمشل کا جو حال ہو رہا تھا، وہ اذیت ناک کیفیت بیان سے باہر ہے۔ اس کی فریاد اور آہ و زاری بے معنی ہو کر رہ گئی تھی...... وہی بات کہ جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا اور آرکٹک ریجن میں ایمشل چیخا، کس نے سنا۔

☆☆☆

گھڑی کے کانٹے بحرِ منجمد شمالی میں شام ہونے کی اطلاع دے رہے تھے۔ ایمشل کے لیے وہ شامِ غریباں تھی۔ وہ شامتِ اعمال کی جکڑ اور قدرت کی پکڑ میں آچکا تھا۔ جاسم اور ساکورا نے کاٹیج نمبر آر۔ تھرٹی میں رابرٹ کو جس طرح بے دست و پا کیا تھا، اسی سے ملتا جلتا سلوک ایمشل کے ساتھ بھی کیا گیا تھا لیکن تھوڑی تبدیلی کے ساتھ۔

جاسم کی چلائی ہوئی بے آواز گولیوں نے ایمشل کے گھٹنوں اور شانوں کو بے کار کر دیا تھا لہٰذا اس کے فرار ہونے یا حملہ آور ہونے کے امکانات نہیں تھے۔ چنانچہ جاسم نے محض اس کی کمر اور گردن کو کرسی کے ساتھ باندھا ہوا تھا اور سب سے خاص بات یہ کہ ایمشل کے بدن پر لباس کے نام پر صرف ایک جانگیا نظر آرہا تھا۔ جاسم نے اپنے ہاتھ میں ایک تیز دھار چھری پکڑ رکھی تھی جس سے گاہے بہ گاہے وہ ایمشل کے برہنہ تن پر چرکے لگا رہا تھا اور


اسما قادری کے سحر انگیز قلم سے

نیا شاہکار

جانباز

امارت کے نشے میں چور...... کمزوروں پر ظلم اور اپنے زیردست لوگوں کی عزتوں کو پامال کرنے والے ظالموں کی خودسری و دیدہ دلیری......

ظلم کے خلاف سینہ سپر نوجوان کی داستان

اسے اپنی محبت کو حاصل کرنے کا جنون بھی تھا اور مجرموں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی۔

تہلکہ خیز واقعات کا سلسلہ......

سسپنس کے صفحات پر جلد آرہا ہے

اس کے ساتھ ہی کڑے ٹرائل کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ساکورا، ایمشل کے لیے اسپیشل فش سوپ تیار کررہی تھی۔ ایمشل اس آسیب زدہ گیسٹ ہاؤس میں ان کا ''مہمانِ خصوصی'' تھا۔

''ایمشل! تم نے آمنہ کے ہولوگرام (تخیلاتی وجود) کی مدد سے مجھے جس طرح دھوکا دیا تھا، اس کا خلاصہ ہو چکا ہے۔'' جاسم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کرخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''لیکن میں تمہارے ساتھ جو کرنے والا ہوں، اس کی تفسیر کون لکھے گا؟''

''تت...... تم......'' وہ حد درجہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''میرے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو......؟''

''تم نے میرے جذبات، احساسات اور خیالات کا مذاق بنانے کے لیے مجھے رینڈیئر کے گوشت کا سوپ پلایا تھا تاکہ میری ٹیلی پورٹیشن کی صلاحیت ختم ہوجائے اور ایسا ہو بھی گیا۔'' جاسم نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے لیے چافش کا سوپ تیار کروا رہا ہوں۔ ''چا'' نہایت ہی معصوم، بے ضرر اور صحت بخش مچھلی ہے۔ میں چافش کے سوپ میں ایک انرجی ڈرنک بھی شامل کروں گا جو تمہارے قبالہ کو ہولوگرامک دوام بخشے گا۔''

وہ نحیف مگر جھنجلاہٹ بھری آواز میں مستفسر ہوا۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''تمہارے پلّے ہے کیا جو میں چاہوں گا۔''

''ثوبان...... تم بہت غلط کررہے ہو۔''

''جانتا ہوں۔'' جاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ایمشل ٹٹولتی ہوئی لاچار نظر سے جاسم کو گھورنے لگا۔

''ایمشل! میں نے تمہاری بہن براخا کو دردناک موت دینے سے پہلے ایک اہم سوال کیا تھا۔ وہی سوال میں تمہارے سامنے بھی رکھ رہا ہوں۔'' جاسم نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ، تم ڈینئل کارمی سے کہاں ملتے ہو؟''

''کک...... کیا تم میخوباد کے بارے میں جانتے ہو؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہارے ہر پرائیویٹ باپ کو اچھے سے جانتا ہوں ایمشل تھیوڈور......!'' جاسم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ میخوباد ہے یا انخوباد......!''

''عالی جاہ سے ملاقات ممکن نہیں ہے۔'' ایمشل نے کہا۔ ''وہ کسی سے نہیں ملتے......''

''کیوں نہیں ملتے؟'' جاسم نے اسی کے انداز میں پوچھا۔ ''کیا اس ابنِ دجال کا چہرہ چیچک زدہ ہے یا اسے کوئی خطرناک وبائی مرض لاحق ہے......؟''

ایمشل کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ ثوبان کی حیثیت سے جاسم کی دہشت نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی خوف جھلک رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ ''پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ ایک تو سرد ترین موسم نے اس کے برہنہ بدن کی قلفی جما کر رکھ دی تھی، اوپر سے جاسم کا جوروجبر اس کا پتّا پانی کررہا تھا۔

''کچھ بکو بھی!'' جاسم نے اس کے سینے پر چھری سے ایک لمبا کٹ لگاتے ہوئے غضب ناک انداز میں پوچھا۔ ''اگر تم نے زبان نہیں کھولی تو میں اسی طرح تمہارے ناپاک گوشت پر تیز دھار چھری سے چترکاری کرتا رہوں گا۔''

''ہدمالتو سے فون پر میری بات ہوتی ہے۔'' ایمشل نے شکست خوردہ انداز میں بتایا۔

''ڈینئل حرامی کا کانٹیکٹ نمبر بولو......''

''نہیں بتاؤں گا......'' ایمشل نے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''چاہے تم میری جان بھی لے لو لیکن میخوباد کے بارے میں میری زبان نہیں کھلے گی۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' جاسم نے چھری کے پھل کو ایمشل کی شہ رگ پر رکھتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ ''جب تم میرے کام کے نہیں تو پھر تمہیں جینے کا بھی حق نہیں ہے۔''

قبل اس کے کہ جاسم اس تفتیشی کارروائی کو آگے بڑھاتا، فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ جاسم یا ساکورا کا نہیں، بلکہ ایمشل تھیوڈور کا سیل فون تھا جو اس وقت جاسم کی کسٹڈی میں تھا۔ جاسم نے مذکورہ سیل فون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سیل فون کے ڈسپلے پر ہرزل یافو کا نام چمک رہا تھا۔ جاسم نے جیسے ہی کال پک کی ''ہیلو'' کا تکلف برطرف رکھتے ہوئے یافو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ایمشل! عالی جاہ لائن پر ہیں۔ وہ آپ سے بات کریں گے۔''

عالی جاہ کا مطلب تھا...... ڈینئل کارمی! جاسم کے رگ و پے میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اگلے ہی لمحے ڈینئل کارمی کی آواز نے جاسم کی سماعت پر دستک دی۔

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے

موبائل کی گھنٹی بجی۔ جیک نے اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ نمبر غیر معروف تھا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کال ریسیو کرلی۔ دوسری جانب سے دبی ہوئی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی مائیک پر کپڑا رکھ کر بات کررہا تھا۔

''تمہاری بیوی فرینکی ہمارے قبضے میں ہے۔ پولیس کو اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ اس کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہوسکتا ہے۔ مجھے تاوان کے عوض رقم نہیں چاہیے اور جو کچھ چاہیئے وہ تمہارے اختیار میں ہے۔ اگر میری ہدایات پر عمل کرو گے تو تمہاری بیوی کو کچھ نہیں ہوگا۔ بصورتِ دیگر اس کی لاش تمہیں جلد از جلد مل جائے گی۔ اس لیے چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا آدمی تمہاری کوٹھی کی نگرانی کررہا ہے۔ پولیس میں بھی میرے آدمی موجود ہیں۔ اس لیے اگر ان سے رابطہ کرو گے تو ہمیں فوراً معلوم ہوجائے گا۔ جس نمبر سے میں بات کررہا ہوں یہ ٹیلی بوتھ کا نمبر ہے۔ ریسیور رکھنے کے فوراً بعد میں یہاں سے دور چلا جاؤں گا۔ اس لیے نمبر کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہاری بیوی کے بدلے میں مجھے جو چاہیئے اس کے متعلق میں تمہیں رات کو دو بجے بتاؤں گا۔ میری کال کا انتظار کرنا۔''

کال منقطع ہوگئی۔ جیک نے حیرت بھری نگاہوں سے موبائل کی طرف دیکھا۔ اسے سمجھنے میں کچھ دشواری پیش آئی۔ مخاطب ہونے والے نے تیز انداز میں بات کی تھی۔ یقیناً کاغذ پر لکھ کر لایا تھا۔ اس کی بیوی فرینکی کروڑپتی تھی۔ لیکن اس کی تمام جائداد، مکانوں اور دکانوں کی صورت میں تھی۔ اسے اگر اغوا کیا گیا تھا تو اس میں اغوا کرنے والوں کا زیادہ فائدہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جیک کو پریشانی اس بات کی بھی تھی کہ فرینکی دمے کی مریض تھی۔ وہ دوائیاں استعمال کررہی تھی۔ نہ جانے وہ اس کے پاس تھیں یا نہیں۔ اگر نہیں تھیں تو اس کی حالت خراب ہوسکتی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف آگیا۔ اس کا کمرا دوسری منزل پر واقع تھا۔ وہاں سے سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اس نے پردہ اٹھا کر نیچے دیکھا تو ایک آدمی کو گیٹ کے سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ وہ سر پر ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں جو

اس شوہر کی کارکردگی جس کی بیوی کو اغوا کرلیا گیا تھا......

آرام دہ اور پُرسکون زندگی آسانی سے میسر آجائے تو اس کی قدر نہیں رہتی... اس بد حال کے حالات بدلنے میں قدرت نے فیاضی سے کام لیا تھا... لیکن بدنیتی نے معاملات کو ٹیڑھا کر دیا۔ اختیارِ ہوس نے اسے شکست سے دوچار کردیا...

# تاوان

عمران قریشی

یقیناً نقلی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر عینک لگا رکھی تھی۔ جیسے ہی اسے جیک کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے جیب میں سے سیاہ رنگ کا ریوالور نکالا...... پھر چیمبر کھول کر اس میں گولیاں چیک کرنے لگا۔ یہ اس بات کی تنبیہ تھی کہ اگر حکم عدولی کرنے کی کوشش کی گئی تو حالات کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔

اس نے فوراً پردہ آگے کر دیا اور ایک سائڈ پر بنی ہوئی شیشے کی الماری کی طرف آ گیا۔ اس نے شراب کی بوتل نکالی پھر گلاس بھرنے لگا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے بوتل سے منہ لگایا اور بے تابی کے ساتھ حلق میں انڈیلنے لگا۔ فرینکی اسے زیادہ شراب نوشی نہیں کرنے دیتی تھی اور جیک کو روک ٹوک پسند نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وہ زیادہ خوب صورت بھی نہیں تھی۔ اسے متعدد بیماریاں بھی لاحق تھیں لیکن ان سب خامیوں پر اس کی بے تحاشا دولت پردہ ڈال دیتی تھی اور پھر تمام شہر جانتا تھا کہ ان دونوں نے پسند کی شادی کی تھی۔

جیک جس بینک میں کام کرتا تھا۔ اس بینک میں فرینکی کا بہت تگڑا اکاؤنٹ تھا۔ شادی سے پہلے جیک چھوٹی پوسٹ پر کام کرتا تھا۔ فرینکی اکثر و بیشتر وہاں آتی تھی۔ اس کا زیادہ تر واسطہ بینک منیجر سے پڑتا تھا۔ جو بہت ہی اکھڑ مزاج اور بدتمیز انسان تھا۔ اس نے فرینکی کے ساتھ بدکلامی کی اور فرینکی نے بینک کے اعلیٰ حکام کو شکایت لگا دی۔ انہوں نے منیجر کو معطل کر دیا اور فرینکی کی سفارش پر جیک کو منیجر کی پوسٹ پر متعین کر دیا گیا۔ جیک کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے یک دم منیجر بنا دیا جائے گا۔ تاہم اس کے پاس کام کا تجربہ ضرور تھا۔ اس لیے منیجر کی پوسٹ پر کام کے دوران اسے کسی بھی قسم کی مشکل پیش نہیں آئی۔ چونکہ وہ فرینکی کا احسان مند تھا۔ اس لیے اس کے ہر کام کو اہمیت دینے لگا اور کچھ ہی ملاقاتوں کے دوران فرینکی نے اس سے شادی کا اظہار کر دیا۔ جیک کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ آج سے چند دن پہلے وہ بینک کا ادنیٰ ملازم تھا۔ پھر اسے فرینکی کے کہنے پر منیجر بنا دیا گیا اور اب وہ اس کا شوہر بننے والا تھا۔ فرینکی وسیع و عریض کوٹھی میں نوکروں کے ساتھ تنہا رہتی تھی۔ ان تمام نوکروں کو اس کا خاص آدمی سام سنبھالتا تھا۔ وہ سیاہ فام نوجوان تھا جس کی عمر بمشکل تمام بیس پچیس سال تھی لیکن کام کے معاملے میں اس کا تجربہ شاید جیک سے بھی زیادہ تھا۔ وہ جب پہلی دفعہ سام سے ملا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی عام انسان نہیں ہے۔ کسی کو بھی قتل کر دینا اس کی نظر میں معمولی بات تھی۔ اس کی سفاکی جیک نے اس وقت دیکھی جب اس نے مرغی کو ذبح کرنے کے بجائے اس کی گردن کو مروڑ کر مار دیا تھا۔ وہ اس کا سوپ تیار کرنے لگا تھا اور اس کی گردن پر چھری پھیرنے کے تردد میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنے قبیلے کی روایت کے مطابق مرغی کی گردن مروڑ کر وقت کو بچا لینا چاہتا تھا۔ جیک نے اس کی اس حرکت کے متعلق جب فرینکی کو بتایا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اس کی ان حرکات کی وجہ سے مجھے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بہت طاقتور اور ناقابلِ تسخیر انسان ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ اس کے وجود سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

جیک خاموش ہو گیا۔ لیکن سام اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا پھر جلد ہی ان دونوں کی شادی ہو گئی اور جیک نے منیجر کی نوکری کو خیر باد کہنے کی کوشش کی تو فرینکی نے منع کر دیا۔ اسے اپنے اکاؤنٹ کی حفاظت کے لیے ایک بہترین منیجر کی ضرورت تھی۔ اس لیے شاید اس نے جیک کو منیجر بنانے کی سفارش کی تھی اور جیک کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ اس کی حیثیت شوہر کی نہیں بلکہ شوفر کی ہے۔ اس کے دل میں پہلی دفعہ فرینکی کے لیے بدگمانی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے جیک کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا تھا۔ یعنی اسے جیک سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں تھا۔ اس کے بعد جیک نے فرینکی کے اکاؤنٹ کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ فرینکی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے چند دنوں کے دوران ہی جیک پر اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔ جیک کسی نہ کسی بہانے سے فرینکی سے دستخط کروا لیا کرتا تھا اور رقم نکال کر خوب عیاشی کرتا تھا۔

انہی دنوں اس کی زندگی میں بینا آئی۔ پتلی دبلی اور کالے سیاہ بالوں والی بینا انتہائی خوب صورت تھی۔ اس نے فوراً ہی جیک کا دل موہ لیا۔ لیکن چند ہی ملاقاتوں کے دوران جیک کو معلوم ہو گیا کہ عام عورتوں کی طرح وہ بھی دولت کی پجاری تھی۔ وہ جیک کو صرف اس لیے پسند کرتی تھی کیونکہ اس کے پاس فرینکی کی مہنگی ترین گاڑی تھی۔ ورنہ شاید وہ اسے گھاس بھی نہ ڈالتی۔ جیک کو اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ اس کے پاس لٹانے کے لیے بہت رقم موجود تھی۔ اس نے جلد ہی فرینکی کے اکاؤنٹ میں ہیر پھیر کر کے مہنگا ترین فلیٹ خرید کر بینا کے نام کر دیا۔ وہ دوپہر کو کھانا کھانے کے بہانے اس کے پاس چلا جایا کرتا اور دو تین گھنٹے اس کی رفاقت میں گزارتا۔ وہ اس سے شادی بھی کر سکتا تھا لیکن اسے سام سے ڈر لگتا تھا۔ وہ فرینکی کے اشارے پر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو سکتا تھا۔ لیکن سام جو کچھ بھی کرتا تھا۔ وہ کوٹھی کے اندر کرتا تھا۔ باہر وہ بے بس تھا۔ اس لیے جیک

جو کچھ بھی کرتا تھا، وہ کوٹھی سے باہر کرتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ زیادہ عرصہ فرینکی کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ آخرکار اسے معلوم ہو ہی جاتا اور پھر جیک کو وہاں سے فرار ہونا پڑتا۔ فرینکی نے اس سے پہلے بھی دو شادیاں کی تھیں اور اس کے دونوں شوہروں نے فرینکی کو دھوکا دینے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور اس کا دماغ ہی باہر آگیا تھا جبکہ دوسرا فرار ہونے کے بعد جس فلیٹ میں چھپا تھا۔ اس کی بالکونی سے نیچے گر کر ہلاک ہوا تھا۔ فرینکی نے جیک کو سرد لہجے میں بتایا کہ سام اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اسے صرف اشارے کی ضرورت ہے۔ وہ مرغی کی طرح کسی کی بھی گردن مروڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کسی کو بھی فلیٹ کی بالکونی سے نیچے پھینک دینا یا پھر کسی بھاگتی ہوئی گاڑی کو سڑک سے نیچے دھکیل دینا اس کے لیے ذرہ برابر بھی مشکل نہیں ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن دھوکا برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔

جیک کو معلوم ہوگیا کہ اپنے دونوں شوہروں کو اس نے سام کے ہاتھوں مروایا تھا۔ یعنی وہ قاتلہ بھی تھی۔ اس لیے اس نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ ہاتھ پاؤں بچا کر رکھے گا۔ وہ اسے کبھی بھی دھوکا نہیں دیتا۔ اگر فرینکی اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال نہ کرتی۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا، اس سے بدظن ہونے کے بعد کر رہا تھا۔ بینا سے اس کی ملاقات جم میں ہوئی تھی۔ اس کی عمر بمشکل تمام بیس سال تھی اور وہ اسکول کی طالبہ دکھائی دیتی تھی۔ پہلے دن ہی جیک نے جم سے باہر نکلنے کے بعد جب اس کے قریب گاڑی روکی تو وہ بغیر کسی پس و پیش کے دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور جیک کو قریبی آبادی میں واقع چھوٹے سے گھر کا ایڈریس بتا دیا۔ لیکن جیک نے گاڑی کو ریسٹورنٹ کی طرف موڑ دیا۔ وہ اتنی آسانی سے ہاتھ آئی چڑیا کو اڑ جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے کوٹھی میں موجود سام سے بھی اب کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا کیونکہ اس نے چند دنوں کی کوشش کے بعد سام کی محبوبہ نیلی کو تگڑی رقم دینے کے بعد خرید لیا تھا۔ وہ سام کی طرح سیاہ فام تھی اور کوٹھی میں ہی کام کرتی تھی۔ اب وہ سام پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ پل پل کی خبر اسے مہیا کر رہی تھی۔ اس لیے جیک اب مطمئن تھا۔ اسے عیاشیوں کے لیے نہ صرف رقم دستیاب ہو رہی تھی بلکہ سام کی محبوبہ نیلی کا ساتھ بھی میسر تھا۔ جس کی وجہ سے اسے سام کے متعلق معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کوٹھی میں ہے یا پھر باہر جا چکا ہے۔

چند دن پہلے اس نے فرینکی سے اجازت لے کر جم جانا شروع کیا تھا اور چونکہ بینک سے جلدی فارغ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہفتے اور اتوار کی شام کو جم جایا کرتا تھا۔ وہ ہفتے کی شام تھی۔ اس نے شراب کی آدھی بوتل پینے کے بعد بینا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے محبت کا اظہار کیا۔ بینا پہلے دن سے ہی اس کی مہنگی ترین گاڑی پر مرمٹی تھی۔ اس لیے اس نے فوراً ہاں کر دی اور یوں ان دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سام کوٹھی سے باہر شاذونادر ہی جاتا تھا۔ لیکن جب بھی جاتا تھا، نیلی فوراً جیک کو اطلاع دے دیتی تھی اور وہ چوکنا ہو جاتا تھا۔ اس لیے دن بہت ہی اچھے گزرنے لگے۔ لیکن نہ جانے کس نے اور کس نیت سے فرینکی کو اغوا کرلیا۔ اسے تاوان میں کیا چاہیے تھا۔ اس کے


دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3,500 روپے

بیرونِ ممالک کے لیے زرِ سالانہ 50,000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا اثمر عباس
0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

سے رقم نکال کرلاؤں گا۔"

سام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ جیک ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر وہ گن پوائنٹ پر بینک کے عملے کو کور کر لیتا تو رقم کون نکال کر لاتا۔ اس کے علاوہ عمارت کے باہر سیکیورٹی گارڈ والے بھی موجود تھے۔ ان سب کو کور کرنے کے لیے کم سے کم دو آدمیوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جیک بولا۔ "تو پھر میں کل صبح اغوا کار کو ڈکیتی کے متعلق بتا دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد فرینکی ان کے قبضے سے باہر آجائے۔ اس کے لیے میں اپنے ہی بینک میں ڈکیتی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

سام اٹھ کر ٹی وی لاؤنج سے باہر چلا گیا۔ جیک بھی اپنے کمرے میں آگیا۔ اسے یہ سن کر دھچکا لگا تھا کہ فرینکی نے اسے نا صرف چھوڑنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ بلکہ سام کو اسے ختم کرنے کا حکم بھی دے دیا تھا تو پھر اسے اپنے متعلق کچھ سوچ لینا چاہیے تھا۔ وہ اغوا کاروں کی قید سے رہا ہونے کے فوراً بعد اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرسکتی تھی تو پھر بہتر یہ تھا کہ اغوا کار اسے رہا نہ کرتے۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرتے۔ اگر ایک معاہدے کے تحت ان کے درمیان معاملات طے پا جاتے تو سب کچھ ہوسکتا تھا۔ جو وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اکیلے میں اغوا کاروں سے بات چیت کرتا۔ سوموار کو اسے بینک جانا تھا۔ ظاہر ہے۔ سام وہاں نہیں ہوتا۔ وہ تنہائی میں بات چیت کرسکتا تھا۔ اس نے شراب کی پوری بوتل خالی کردی اور بیڈ کی طرف آگیا۔ اسے بھرپور نیند آئی اور خواب میں وہ اپنے آپ کو نوٹوں میں کھیلتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

سوموار کی صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا، اس نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر بینک آگیا۔ وہاں عام دنوں کی نسبت کام زیادہ تھا۔ پتا ہی نہیں چلا کب گیارہ بج گئے پھر اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ حسب توقع نمبر غیر معروف تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب سے اغوا کار کی کرخت آواز سنائی دی۔

"ڈکیتی کل صبح ہوگی۔ سال کے آخری دن چل رہے ہیں۔ میرے خیال میں بینک میں اچھا خاصا کیش جمع ہوگا۔ تم چمڑے کے بیگ ساتھ لے جانا۔ جیسے ہی ہمیں رقم موصول ہوگی۔ ہم تمہاری بیوی کو رہا کردیں گے۔"

جیک اس وقت کمرے میں اکیلا تھا۔ اس نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"مجھے اپنی بیوی زندہ حالت میں نہیں چاہیے۔ تم اسے گولی مار دینا۔ میں اس کام کے لیے تمہیں علیحدہ سے رقم دوں گا۔"

دوسری جانب چند لمحوں کے لیے گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی پھر اغوا کار کی آواز سنائی دی۔

"ہم ڈاکو ہیں۔ قاتل نہیں۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے ویسا ہی کرو۔ بصورت دیگر تمہیں تمہاری بیوی نہیں ملے گی۔"

جیک حتمی لہجے میں بولا۔ "تو پھر میں ڈکیتی کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ اس صورت میں بھی تمہیں میری بیوی کو ہلاک کرنا ہوگا۔ کیونکہ تم اسے چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ وہ تمہارے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔"

دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔ "تو پھر میں اسے کل ہی رہا کردیتا ہوں۔ اس صورت میں تمہیں بیوی سے نجات نہیں ملے گی۔ لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

جیک جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بے وقوف اس صورت میں تمہیں بینک سے حاصل ہونے والی رقم نہیں ملے گی۔ میری بات کو غور سے سنو۔ میں اپنی بیوی کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مرگئی تو مجھے فائدہ ہوگا۔ لیکن اگر زندہ واپس آگئی تو مجھے نقصان نہیں ہوگا۔ میں اس کی دولت سے اب بھی مستفید ہو رہا ہوں اور آئندہ بھی ہوتا رہوں گا۔ بینک میں اس وقت اندازاً اسی لاکھ ڈالر کی رقم موجود ہے۔ میں اس میں بیس لاکھ ڈالر مزید ڈال کر ایک کروڑ کی رقم تمہارے حوالے کروں گا۔ اس لیے اس میں جتنا فائدہ میرا ہے۔ اتنا ہی تمہارا بھی ہے۔"

دوسری جانب ایک دفعہ پھر گمبھیر خاموشی طاری ہو گئی۔ شاید ایک کروڑ کی رقم کا سن کر ان کے ہوش اڑ گئے تھے پھر کچھ دیر بعد آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔ لیکن پہلے تمہیں رقم دینا ہوگی۔ اس کے بعد ہم تمہاری بیوی کو قتل کردیں گے۔"

جیک بولا۔ "مجھے منظور ہے۔ لیکن اگر تم نے معاملے میں گڑبڑ کی تو میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پولیس میں میرے تعلقات تمہارے تصور سے بھی زیادہ ہیں۔ اگر میں نے شہر سے جانے کے راستے بند کروا دیے تو اس شہر میں تمہیں تلاش کرنا پولیس کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔ "تم کل رقم حاصل کرلو اور ایک کوٹھی کرائے پر لے کر وہاں چھپ جاؤ۔ میرا آدمی خود ہی تم سے رابطہ کرنے کے بعد رقم حاصل کرلے

پھر تمہاری بیوی کو تمہارے حوالے کرتے ہوئے میرا آدمی گولی چلا دے گا۔ اس کے بعد ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ میں کل شام سات بجے تمہیں فون کروں گا۔ بات چیت مختصر ہوگی۔ کوشش کرنا کہ کوئی غلط حرکت تم سے سرزد نہ ہونے پائے۔'' کال منقطع ہوگئی۔

جیک اگلے دن کی ڈکیتی کے متعلق سوچنے لگا۔ سام کے موٹے دماغ سے کام لینا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ لیکن وہ اسے معاملے میں ملوث کرکے عینی شاہد کے طور پر پولیس والوں کے سامنے بیان دلوا سکتا تھا کہ فرینکی کو اغوا کرنے والوں نے قتل کیا تھا۔ اس طرح وہ پولیس والوں کی نظروں میں بے گناہ ثابت ہوجاتا اور فرینکی کی جائداد اپنے نام منتقل کرنے میں اسے مشکل پیش نہیں آتی۔

☆☆☆

اگلے دن ڈکیتی سے قبل جیک نے سام کو سب کچھ سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آیا۔ وہ صرف شراب پینا یا پھر ریوالور چلانا جانتا تھا۔ وہ بھی بے دریغ...... جبکہ جیک کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ قتل کی صورت میں ان دونوں کو بھی سزا ہوسکتی تھی۔ اس لیے اس نے سام کو ریوالور چلانے سے قطعی منع کردیا اور صرف بینک کے عملے کو ریوالور کی زد پر اپنے کمرے میں لے جاکر بند کرنے کے لیے کہا۔ باقی کام وہ خود سنبھال سکتا تھا۔ بینک ڈکیتی کے لیے چھ بجے کا وقت موزوں تھا۔ اس وقت بینک کے دروازوں کو بند کردیا جاتا تھا۔ سیکیورٹی اہلکار باہر ہوتے تھے اور بینک کے اندر صرف عملہ رہ جاتا تھا۔ جن پر بہ آسانی قابو پایا جاسکتا تھا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ سام بینک کے اندر کیسے داخل ہوتا۔ سیکیورٹی اہلکاروں کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن تھا۔ کچھ دیر سوچ بچار کے بعد اس نے اس مسئلے کا حل بھی تلاش کرلیا۔ بینک کے اندر دوسری منزل پر ایک ٹوائلٹ کافی دنوں سے بند پڑا ہوا تھا۔ سام وہاں چھپ سکتا تھا۔ لیکن اسے تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑتا۔ چھ بجے بینک کے دروازوں کو بند کردیا جاتا تھا۔ اس لیے اسے پانچ بجے رش کے دوران ٹوائلٹ میں جاکر چھپنے کے بعد چھ بجے کا انتظار کرنا تھا اور دروازے بند ہوجانے کے بعد نیچے آکر تمام عملے کو جیک کے کمرے میں بند کرنا تھا۔ اس سے پہلے ان سب کے موبائل پر قبضہ کرنے کے بعد ٹیلی فون کی تاریں بھی کاٹنا تھیں۔ رقم کے حصول کے بعد سام جیک کو گن پوائنٹ پر رکھ کر بینک سے باہر نکلتا اور گاڑی میں بیٹھ کر وہ دونوں کوٹھی آجاتے۔ اسے کوٹھی کا بندوبست شام تک کرنا تھا

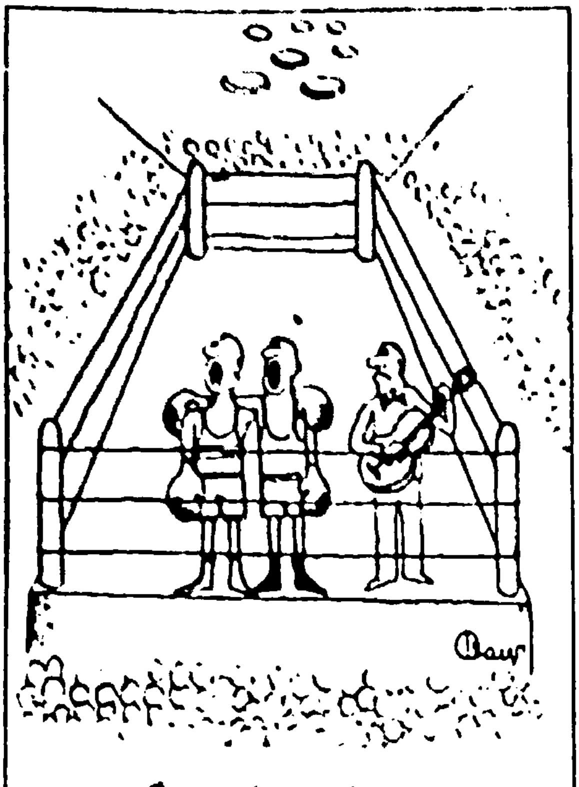

اس گانے کے بعد ہم لڑمریں گے

اور وہ بہ خوبی کرسکتا تھا۔ اگر تمام معاملے کے دوران کوئی گڑبڑ ہوجاتی تو وہ پولیس والوں کو سچ سچ بتا سکتا تھا کہ اسے ڈکیتی کے لیے ڈاکوؤں نے مجبور کیا تھا کیونکہ جیک کی بیوی ان کے قبضے میں تھی۔

چونکہ سال کے آخری دن چل رہے تھے۔ اس لیے بینک میں کام بہت زیادہ تھا۔ کیشیئر کے اعداد و شمار کے مطابق والٹ روم میں رقم ایک کروڑ سے کچھ اوپر موجود تھی۔ جیک کو اس کا اندازہ تھا۔ اس نے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اب اسے اغواکاروں کو رقم اپنی جیب سے نہیں دینا تھی۔ اس نے ایک تیر سے دو نہیں بلکہ تین شکار کیے تھے۔ فرینکی کو قتل کروانے کے بعد وہ نا صرف اس کی جائداد پر بہ آسانی قبضہ کرلیتا بلکہ اسے قاتلوں کو کوئی رقم بھی نہ دینا پڑتی۔ رقم کی ادائیگی بینک کرتا جس کے والٹ روم میں ایک کروڑ سے کچھ اوپر رقم موجود تھی۔ اس لیے باقی کی رقم پر وہ خود قبضہ کرلیتا۔

شام کو اس نے مضافات میں واقع ایک کوٹھی کی چابی حاصل کرلی۔ اب وہ مطمئن تھا۔ اسے اگر کسی قسم کا کوئی خدشہ لاحق تھا تو سام کی جانب سے تھا۔

اگلے دن بھی بینک میں کام بہت زیادہ تھا۔ پانچ بجے کے قریب حسب ہدایت سام بینک میں داخل ہوا۔ وہ اپنے چہرے کو فیس ماسک سے چھپائے ہوئے تھا۔ اس کی

آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی۔ اس لیے اسے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ وہ سی سی ٹی وی کیمرے کے نیچے سے ہوکر سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا دوسری منزل پر واقع ٹوائلٹ میں آگیا۔ چھ بجے کے بعد اسے نیچے آکر سیڑھیوں کے قریب سی سی ٹی وی کیمرے کے تار کو کٹر کے ذریعے کاٹنا تھا تاکہ کیمرا مووی نہ بنا سکے۔ سام کے اوپر چلے جانے کے بعد جیک دوبارہ کام میں مصروف ہوگیا۔ کیشیئر نے اسے بتایا کہ والٹ روم میں ایک کروڑ پچیس لاکھ ڈالر کی رقم موجود ہے۔ اس لیے ایک دو دن تک کام زیادہ رہے گا۔ جیک نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بتایا کہ صرف سمری تیار کرنا باقی رہ گئی ہے۔ باقی کا تمام کام بھی جلد مکمل ہوجائے گا۔ بس تمام عملے کو تندہی کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ کیشیئر مطمئن ہوگیا۔ چھ بجے کے قریب بینک کے دروازوں کو بند کردیا گیا اور تمام عملہ مع کیشیئر منیجر کے کمرے میں جمع ہوکر رپورٹس تیار کرنے لگا۔ چھ بج چکے تھے لیکن سام نیچے نہیں آیا۔ وہ بے صبری کے ساتھ اس کے نیچے آنے کا انتظار کرنے لگا، پھر چھ بج کر دس منٹ پر سی سی ٹی وی کیمرے آف ہوگئے۔ بینک کا عملہ حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگا۔ جیک ہوشیار ہوگیا۔ کچھ ہی دیر میں سام ہاتھ میں ریوالور تھامے سیڑھیوں کے پاس سے نمودار ہوا۔ اس نے غراتے ہوئے بینک کے عملے کو منیجر کے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔ لیکن انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ بینک کا دروازہ بند ہونے کے باوجود بھی وہ اندر کیسے آگیا۔ سام نے آگے بڑھ کر عملے کے ایک آدمی کو تھپڑ دے مارا۔ اس کا منہ دوسری جانب گھوم گیا اور ہونٹوں سے خون نکلنے لگا۔ باقی کے عملے نے فوراً حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کمرے کا رخ کیا۔ اس نے کمرے میں جاتے ہوئے سب کے موبائل نکال کر میز پر رکھ دیے۔ پھر ٹیلی فون کے تار کاٹنے کے بعد تمام موبائل اٹھا کر کمرے سے باہر آگیا۔

سام نے دروازے کو کنڈی لگا دی۔ اب وہ دونوں ہال کمرے میں تنہا تھے۔ بات چیت کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پولیس کسی وقت بھی آسکتی تھی۔ جیک نے اسسٹنٹ منیجر کی دراز میں سے والٹ روم کی چابی نکالی اور پھر کیشیئر کی چابی اٹھانے کے بعد والٹ روم کی طرف آگیا جو اس کے کمرے کے ساتھ گیلری کے آخر میں بنا ہوا تھا۔ اس نے پہلے اپنی چابی لگائی۔ اس کے بعد اسسٹنٹ منیجر اور کیشیئر کی چابی لگانے کے بعد آہنی دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ اندر لوہے کے ریک پر ڈالرز کے بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے کیشیئر کی میز کی طرف آیا۔ وہاں چمڑے کے چار بیگ رکھے ہوئے تھے۔ وہ بیگ لے کر واپس والٹ روم میں آگیا۔ سام اس کا منتظر تھا۔ ان دونوں نے تمام ڈالرز کو بیگ میں بھر دیا۔ رقم بڑے نوٹوں پر مشتمل تھی۔ اس لیے بہ آسانی چاروں بیگوں میں سما گئی۔ اب انہیں جلد از جلد بینک سے نکل کر دور جانا تھا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا لیکن ان دونوں کو اس سے نبرد آزما ہونا تھا۔ نوٹوں سے بھرے ہوئے دو بیگ جیک نے اٹھا لیے اور دو سام کو تھما دیے۔ اس نے ہاتھ میں ریوالور بھی پکڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں بینک کے دروازے کی طرف آگئے۔ جیک نے آٹومیٹک لاک کو کھولا لیکن دروازہ باہر سے بھی بند تھا۔ اس نے ہلکے سے تین دفعہ دستک دی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ لیکن جیک باہر نہیں نکلا۔ اس نے عمارت کے اندر کھڑے سیکیورٹی اہلکاروں کو حالات سے آگاہ کیا۔ پھر انہیں اپنا اسلحہ اندر پھینکنے کے لیے کہا۔ باہر کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر رائفلیں اندر پھینک دی گئیں۔ جیک نے مسکراتے ہوئے انہیں اپنے ہولسٹر میں سے ریوالور بھی نکال کر اندر پھینکنے کے لیے کہا۔ فوراً ہی دو ریوالور بھی اندر پھینک دیے گئے۔

جیک اونچی آواز میں بولا۔ ”اب بینک کی عمارت کے مخالف جانب بنے ہوئے چرچ کی عمارت کے پاس چلے جاؤ اور منہ دوسری طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔“

دونوں اہلکاروں نے حکم کی تعمیل کی اور چرچ کی طرف چلے گئے۔

جیک نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ اس نے سام کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا اور دروازے سے نکل کر بینک کی پارکنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ سام اس کے پیچھے تھا۔ وہ جیک کو یوں آگے دھکیل رہا تھا جیسے اس کے ساتھ زورزبردستی کررہا ہو۔ بینک کے سیکیورٹی اہلکار چرچ کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پارکنگ میں جیک کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور مخالف جانب موجود سڑک پر گاڑی دوڑانے لگے۔ جس کوٹھی کو پچھلے دن جیک نے کرائے پر لیا تھا۔ وہ بینک کی عمارت کے مخالف جانب واقع تھی۔ انہیں وہاں تک پہنچنے میں بیس منٹ لگ گئے۔

☆☆☆

شام کو اغوا کار کا فون موصول ہوا۔ جیک نے اسے بتایا کہ حاصل شدہ رقم ستر لاکھ ڈالر ہے۔ وہ تیس لاکھ ڈالرز

اور ڈال کر ایک کروڑ کی رقم ان کے حوالے کر دے گا۔ لیکن تمام رقم انہیں یکمشت نہیں دے گا۔ پچاس لاکھ ڈالر پہلی دفعہ اور پچاس لاکھ فرینکی کو گولی مارنے کے بعد ان کے حوالے کرے گا۔

دوسری جانب سے غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ باریوں کا انتظار کرتے رہیں۔ تمام رقم کوٹھی کے سامنے کھڑے ہوئے ہمارے آدمی کے حوالے کر دو۔ ہم تمہاری بیوی کو گولی مارنے کے بعد لاش تمہارے حوالے کر دیں گے۔

جیک طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن میں یکمشت رقم تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ اگر بعد میں تم نے میری بیوی کو گولی نہ ماری تو پھر میں تمہارا کیا بگاڑ لوں گا۔ تم پچاس لاکھ کی رقم کچھ دیر بعد لے جانا اور اسے ایڈوانس سمجھنا۔ باقی کی رقم تمہیں قتل کرنے کے بعد ملے گی۔“

دوسری طرف سے جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تم سے بحث کر کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری کوٹھی کے باہر میرا آدمی کھڑا ہے۔ رقم والا بیگ اس کے حوالے کر دو۔ باقی کے پروگرام کے متعلق تمہیں اگلی کال میں بتا دوں گا۔“ رابطہ منقطع ہو گیا۔

جیک نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ سام ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا شراب کی بوتل کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بات چیت نہیں سنی تھی اور اگر سن بھی لیتا تو اسے سمجھنے میں کم از کم دو دن لگ جاتے۔ کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد وہ دوبارہ بیڈ کی طرف آ گیا۔ رقم سے بھرے ہوئے بیگ ایک جانب رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بیگ کھول کر اس میں سے پچیس لاکھ ڈالر علیحدہ کر لیے۔ یہ بہترین منصوبہ بندی کرنے کے لیے اس کا بونس تھا۔ پھر اس نے پچاس لاکھ ڈالر کی رقم علیحدہ کر کے دو بیگوں میں بھر دی اور انہیں لے کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف آ گیا۔ اغواکاروں کا آدمی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے چہرے پر فیس ماسک لگائے کھڑا تھا۔ جیک ٹہلتا ہوا اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیگ جیک کے ہاتھوں سے لے لیا اور وہ مطمئن قدموں کے ساتھ چلتا ہوا کوٹھی میں واپس آ گیا۔

سام شراب کی تمام بوتل ختم کر چکا تھا اور اب اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے مزید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ جیک نے فریج میں سے بوتل نکالی اور اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ فرینکی کے قتل کے بعد اس نے ہی جیک کے حق میں گواہی دینی تھی۔ اس کو اپنے ساتھ رکھنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ اغواکار اس کے سامنے فرینکی کو گولیاں مارتے۔ اور وہ سب کچھ دیکھنے کے بعد پولیس والوں کے سامنے بیان دے دیتا۔ اس طرح جیک پر شک نہیں کیا جاتا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد موبائل کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ کرخت آواز سنائی دی۔

”تم کوٹھی کے گیٹ کی جانب آ جاؤ۔ میرے آدمی تمہاری بیوی کے ساتھ موجود ہیں۔ ہم جیسے ہی اس پر گولی چلائیں گے۔ تم رقم والا بیگ ہماری طرف اچھال دینا۔ اگر چالاکی کرنے کی کوشش کی تو ہم کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد تمہیں گولی مار کر رقم حاصل کر لیں گے۔ اس نے جواب سنے بغیر موبائل بند کر دیا۔ رقم کو گننے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے جیک نے کھینچ تان کر رقم دو بیگوں میں منتقل کر دی اور انہیں اٹھائے سٹنگ روم میں آ گیا جہاں سام دوسری بوتل کو بھی آدھا ختم کر چکا تھا۔ جیک نے اسے بتایا کہ اغواکار فرینکی کے ہمراہ کوٹھی کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہیں۔ رقم والے بیگ حاصل کرنے کے بعد وہ فرینکی کو ہمارے حوالے کر دیں گے۔ سام نے جیب میں سے ریوالور نکالا۔ لیکن جیک نے اس سے ریوالور چھینتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

”کسی بھی غلط حرکت کی صورت میں فرینکی کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس لیے بس خاموشی کے ساتھ میرے پیچھے کھڑے رہنا۔ باقی کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔“

سام نے کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں کوٹھی کے گیٹ کی طرف آ گئے۔ گیٹ کے بالکل سامنے سیاہ شیشوں والی گاڑی کھڑی تھی اور اس کے سامنے ایک آدمی ہاتھوں میں ریوالور تھامے کھڑا تھا۔ جیک اور سام کو باہر نکلتا دیکھ کر اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو اندر سے فرینکی باہر نکل آئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ لیکن جیک اور سام کو سامنے کھڑا دیکھ کر اس کا چہرہ پھول کے مانند کھل اٹھا اور وہ بے اختیار ان دونوں کی طرف دوڑ پڑی۔ کوٹھی کے اردگرد کا علاقہ سنسان پڑا تھا۔ وہاں کوئی راہ گیر نہیں تھا۔ گاڑی کے قریب کھڑا ہوا آدمی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور پچھلی سیٹ والا شیشہ نیچے ہوا۔ سیاہ رنگ کے ریوالور کی نال باہر نکلی اس کے بعد فائر ہوا اور فرینکی چیختے ہوئے سڑک کے درمیان گر گئی۔ جیک نے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بیگ گاڑی کی طرف اچھال دیے۔ سام ہکا بکا کھڑا زمین پر گری ہوئی فرینکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے جیک کو رقم سے بھرے ہوئے بیگ پھینکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی تمام توجہ فرینکی کی

جانب تھی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک نقاب پوش نے نیچے اتر کر دونوں بیگوں کو اٹھا کر پچھلی سیٹ پر رکھا پھر خود بھی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور پھر تیر کے مانند آگے بڑھ کر دور ہوتی چلی گئی۔ اتنی دیر میں فرینکی کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔ جیک نے جیب سے موبائل نکالا اور پولیس کو کال کرنے لگا۔ کچھ دیر میں نہ صرف پولیس کی گاڑیاں کوٹھی کے سامنے موجود تھیں بلکہ ایمبولینس بھی آ چکی تھی۔ فرینکی کے ساکت جسم کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور جیک کو پولیس گاڑی میں بٹھا کر پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔

☆☆☆

سب کچھ بخیر و خوبی ہو گیا تھا۔ جیک کو معاملے میں ملوث نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے انسپکٹر کے پوچھنے پر جو کچھ ہوا تھا۔ سب سچ بیان کر دیا۔

انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ''جس کوٹھی کے سامنے تمہاری بیوی پر گولی چلائی گئی ہے۔ اسے کرائے پر تم نے لیا تھا۔ تم ڈکیتی کے بعد اپنی کوٹھی پر بھی جا سکتے تھے۔ لیکن تم نے بینک کے مخالف جانب اس کوٹھی کا رخ کیا۔ جس کے اردگرد کا علاقہ سنسان پڑا تھا۔''

جیک نے بتایا۔ ''میں نے جو بھی کیا۔ وہ اغواکاروں کے کہنے پر کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈکیتی کے بعد پولیس والے میری کوٹھی کا رخ کر سکتے ہیں۔ اس لیے وقتی طور پر مجھے کسی اور کوٹھی میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ جہاں بات چیت اور لین دین بہ آسانی ہو سکے۔''

انسپکٹر نے دوبارہ پوچھا۔ ''تمہیں منصوبے کی تفصیل سے آگاہ کرنے کے لیے انہیں فون پر کافی دیر تک بات چیت کرنا پڑی ہوگی۔ تم نے نمبر کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

جیک نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... انہوں نے مجھے پہلی کال کے دوران ہی بتا دیا تھا کہ وہ پبلک فون بوتھ سے بات چیت کر رہے ہیں اور جیسے ہی کال منقطع ہو گی۔ وہ بوتھ سے دور چلے جائیں گے۔''

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''انہوں نے تمہاری بیوی پر گولی رقم ملنے کے بعد چلائی...... یا پہلے......؟''

جیک پریشان ہو گیا۔ اسے خدشہ اسی بات سے لاحق تھا۔ اگر وہ پولیس کو بتا دیتا کہ گولی چلنے کے بعد اس نے بیگ اغواکاروں کی جانب اچھالے تھے تو وہ بری طرح پھنس سکتا تھا۔ پھر بھی وہ پُراعتماد دکھائی دیتا رہا۔

''انہوں نے رقم والے بیگ لینے کے بعد اچانک ان پر فائر کر دیا۔ مجھے اور سام کو کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ورنہ شاید ہم فرینکی کو بچانے کی پوری کوشش کرتے۔''

انسپکٹر دوبارہ سوچ میں پڑ گیا۔

جیک کو اب بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔ انسپکٹر اس سے کچھ چھپا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ معاملے کو کسی اور نظریے سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم جیک کو یقین تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے خاموش بیٹھا رہا۔

کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد انسپکٹر سرد لہجے میں بولا۔ ''چونکہ فرینکی کے آگے پیچھے اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے اس کے مرنے کے بعد تمام جائداد تمہارے نام منتقل ہو جائے گی۔ یعنی تم بیٹھے بٹھائے کروڑ پتی بن جاؤ گے۔''

جیک نے جواب دینے کے بجائے کندھے اچکا دیے۔

انسپکٹر دوبارہ بولا۔ ''اور اگر وہ مرنے سے بچ جائے تو نا صرف تمہیں جائداد سے محروم کر دیا جائے گا بلکہ شاید وہ تمہیں اکاؤنٹ میں خرد برد کرنے کے الزام میں جیل بھجوانے کی کوشش بھی کرے گی۔''

جیک نے حیرت بھری نگاہوں سے انسپکٹر کی جانب دیکھا۔

انسپکٹر ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''وہ مرنے سے بچ گئی ہے۔ گولی نے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ وہ دل کے قریب گولی لگنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی اور ہوش میں آنے کے بعد اس نے جو بیان دیا ہے' اس کے مطابق وہ اغوا ہونے سے پہلے معلوم کروا چکی تھی کہ تمہارے تعلقات بینا نامی لڑکی کے ساتھ عرصہ دراز سے چل رہے تھے اور تم وقتاً فوقتاً فرینکی کے اکاؤنٹ سے رقم نکال کر اپنی محبوبہ پر خرچ کر رہے تھے۔ تم نے شاید اسے فلیٹ بھی خرید کر دیا ہے۔ جب تمہاری بیوی کو تم دونوں کے تعلقات پر شک ہوا تو اس نے اپنے آدمی کو تمہارے پیچھے لگا دیا۔ تب سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا۔ لیکن شاید تمہیں اس کی خبر ہو گئی اور تم نے اسے اغوا کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ اغواکار تمہارے اپنے آدمی تھے جن کو پولیس تلاش کر رہی ہے۔ جلد ہی انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد تمہارے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔ جب تک تمہیں حراست میں لیا جاتا ہے۔'' جیک اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کرسی پر بے سدھ بیٹھ گیا۔ اس کا تمام منصوبہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ اب اگر اغواکار پکڑے جاتے تو شاید وہ قاتل بھی ثابت ہو جاتا۔ اور اسے یقیناً پھانسی کی سزا ہو جاتی۔ اب اس کے پاس تاسف کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

اٹھارہ سالہ کرب...... اٹھارہ سال کا طویل عرصہ!
یہ محض وقت نہیں تھا بلکہ ایڈم رزر کی زندگی کا وہ زہریلا گھونٹ تھا جسے وہ ہر پل پی رہا تھا۔ طویل، تلخ اور ہڈیوں تک کو پگھلا دینے والے مشکل سال۔ قانون کے محافظ، ایف بی آئی کے ماہرین اور مہنگے ترین نجی سراغ رساں سب اس مفرور مجرم کا سراغ پانے میں ناکام ہوکر اسے "ماضی کا قصہ" قرار دے چکے تھے لیکن ایک باپ کے دل میں لگی انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مجرم کہیں نہ کہیں اسی

# آزاد قیدی

## نسرین خان

بچپن کی یادیں خوشگوار ہی نہیں ناخوشگوار بھی ہوتی ہیں... ایک حادثہ کئی سال گزرنے کے بعد بھی ذہن و دل سے چمٹ کر رہ جاتا ہے... ایسے ہی ایک حادثے کے نتیجے میں رونما ہونے والی صورتِ حال کا احوال... اس نے طویل عرصہ اپنے مجرم کی کھوج میں گزار کے اسے پالیا تھا...

قدرت کے فیصلے کے آگے سرنگوں ہونے والے شخص کا ماجرا......

زمین پر سانس لے رہا ہے اور وہ تب تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک اسے ڈھونڈ نہ نکالے۔

یہ شاید خدا کی طرف سے تاخیر سے ملنے والی مدد تھی یا دس ہزار ڈالرز کا لالچ جسے میں نے اب تک برقرار رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک انشورنس سیلز مین اور پتھروں کا شوقین تھا۔ اس کا نام مارشل لوگن تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ نیواڈا کے صحرا کے ایک دور افتادہ کونے میں۔ تمام جگہوں میں سے ایک ایسی جگہ جو گمنامی کا آخری کنارہ تھی۔ وہ نایاب معدنیات اور قیمتی پتھروں کی تلاش میں وہاں پہنچا تھا۔ جو نیواڈا کے دور افتادہ علاقوں کیلی فورنیا، ایریزونا اور میکسیکو میں پائے جاتے ہیں۔ آتشی اوپل اور اس سے بنی ہوئی لکڑی۔ فیروزہ، یاقوت، عقیق اور ایسے ہی قیمتی پتھر جو ناتراشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن جو انہیں پہچانتے ہیں وہ اس کو بیچ کر پیسے کھرے کر لیتے ہیں۔

لوگن ماضی اور حال کے مجرمانہ مقدمات کی بھی پوری خبریں رکھتا تھا۔ اس کی یادداشت قابلِ تحسین تھی۔ وہ مجھے یہ خبر سنانے میرے نجی آفس رٹر اینڈ سن رئیل اسٹیٹ آیا۔ اس نام میں ''اینڈ سن'' ایک غلط نام تھا۔ ایڈم جونیئر، میرے بیٹے کا کسی بھی طرح اس فرم کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں رہا تھا لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ یہ اس کا مجھ پر حق ہے۔ وہ ہماری واحد اولاد تھا۔ اپنے کاروبار میں ہم لوگوں کے پہلے تاثر پر بھروسا کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ میرا تاثر لوگن کے بارے میں مثبت تھا۔ اس کی عمر تقریباً تیس برس ہوگی۔ وہ ایک قدآور شخص تھا۔ مخلص اور واضح طور پر تیز نظر آنے والا۔ پچھلی دو دہائیوں میں مجھے درجنوں ایسے بناوٹی لوگوں سے ملنے کا تجربہ ہوا جو صرف انعام میں دلچسپی رکھتے تھے۔ شروع شروع میں زیادہ لوگ دلچسپی لیتے تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اس نسل سے نہیں تھا۔ پیسا یقیناً اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہوگا لیکن یہ واحد وجہ نہیں تھی اس کے میرے پاس آنے کی۔

''میں اس سے ایک خشک برساتی نالے میں ملا۔'' لوگن نے بتانا شروع کیا۔ ''وہ ہتھوڑے سے کھدائی کر رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مگن تھا اور دھول مٹی سے اتنا کھانس رہا تھا کہ اسے میرے قریب آنے کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی۔ اس سے پہلے کہ اسے میرے آنے کا احساس ہوتا، میں نے اس کی کلائی پر بنا 'ٹیٹو' دیکھ لیا۔ اس نے جلدی سے اپنے دوسرے ہاتھ سے اسے ڈھانپ لیا۔ اس پر RVT کھدا ہوا تھا۔''

''کیا آپ کو یقین ہے؟''

منیجر کے نام نے ابتدائی سوال [illegible] تھے اور اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ [illegible] آدمیوں کی کلائی پر بالکل ایک جیسے ٹیٹو ہوں۔

''آپ نے اس سے اس بارے میں کوئی بات کی؟''

''جی نہیں جناب۔'' لوگن بولا۔

''اس کا رویہ کیسا تھا خوف زدہ یا دھمکی آمیز؟'' میں نے سوال داغا۔

''وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔'' لوگن نے کہا۔ ''وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں اور وہاں کیوں ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں قیمتی پتھروں کی تلاش میں آیا ہوں۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ کرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے پھر مزید کچھ نہیں کہا۔ اپنا رخ بدلا اور جلدی سے اپنے دستانے پہن لیے جو اس نے اپنی بیلٹ کے ساتھ لٹکائے ہوئے تھے۔ پھر اس نے ایک چھوٹا سا تھیلا اٹھایا جہاں تک میں نے اسے کھدائی کرتے دیکھا تھا، وہ عقیق پتھر تھے پھر وہ جلدی سے چلا گیا۔''

''کیا اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ تھا؟''

''جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں نہیں۔''

''اس کی عمر کتنی تھی؟''

''پچاس کی دہائی میں ہوگا۔''

''بالکل صحیح عمر۔''

جی ہاں غائب ہوتے وقت منیجر کی عمر تقریباً چوتیس سال تھی۔

میں نے دماغ میں حساب لگایا۔ ''اس کا حلیہ بیان کریں۔''

''دبلا پتلا، دھوپ سے جھلسا ہوا گہرا رنگ، کھچڑی داڑھی اور تقریباً سفید بال جو اس کے کندھوں تک آرہے تھے۔ قد تقریباً 5 فٹ 8 انچ۔ پرانے خستہ حال کپڑوں میں ملبوس منیجر کی واحد تصویر جو پولیس کی کھینچی گئی ایک مجرمانہ تصویر تھی میرے ذہن میں نقش ہوگئی تھی۔ تب وہ کلین شیو تھا۔ زرد رنگت والا۔ اس کے گھنے سیاہ بال چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ ایک ایسے شہری مجرم کا تصور کرنا انتہائی مشکل تھا۔ جو شکاگو میں پیدا ہوا ہو۔ وہیں پلا بڑھا ہو اور پھر ایک صحرائی باشندہ بن گیا ہو۔ اس ٹیکنالوجی کے دور میں روپوش ہو جانا بہت ہی مشکل ہے۔ وہ یقیناً گرفتاری اور جیل سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا ہوگا اور ساری عمر کی قید سے بچنے کے لیے یہی واحد راستہ اس کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ وہ ایک نئی شناخت کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کرلے ایسی جگہ ڈیرہ

بیٹھ جائے جس پر کوئی شبہ بھی نہ کر سکے۔“

”کیا آپ کو یقین ہے وہ اسی علاقے میں رہتا ہے؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ لوگن نے کہا۔ ”میں نے قریبی شہر ”پاہرائٹ“ میں اس کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔ وہ وہاں ’چارلی‘ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ صحرا میں کئی میل دور پرانی سونے کی متروکہ کان کے قریب ایک جھونپڑی میں درویش کی طرح رہتا ہے۔ وہ صحرا میں عقیق اور چھوٹے موٹے دیگر پتھر جمع کرتا ہے اور جنرل اسٹور کے مالک کو بیچتا ہے یا پھر کوئی چھوٹا موٹا کام کر لیتا ہے۔“

”وہ وہاں کب سے ہے؟“

”کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں اور نہ ہی کسی کو پروا ہے کہ وہ یہاں کب آیا۔ مقامی لوگ اسے ذہنی طور پر غیر متوازن سمجھتے ہیں کیونکہ چاہے کتنی ہی گرمی کیوں نہ ہو، وہ ہر وقت دستانے پہنے رکھتا ہے۔“

”وہ مینیجر ہی ہے۔ بالکل ایسا ہی لگتا ہے۔“

”مسٹر رڑاب آپ کیا کرنے والے ہیں؟“

”مجھے ابھی نہیں معلوم۔“ میں نے سچائی سے کہا۔

”کیا آپ کو فوراً ایف بی آئی کو اطلاع نہیں دینی چاہیے؟“

”یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے درشتگی سے جواب دیا۔

اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب لالچی بننا نہیں ہے لیکن اس انعام کے بارے میں کچھ بتائیں گے جو مجھے ملنا چاہیے۔“

”جب شناخت کی تصدیق ہو جائے گی آپ کو پورا انعام مل جائے گا۔ آپ کو اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں مکمل رازداری کے معاہدے پر دستخط کرنے ہوں گے جب ہی ہماری بات مؤثر ہوگی۔“

”جی بالکل کیوں نہیں، لیکن مینیجر کی گرفتاری کے بعد جو تشہیر ہوگی؟“

”کس نے کہا کوئی تشہیر ہوگی، میں خود اس کا بندوبست کرلوں گا۔“

میں نے ایف بی آئی کو مطلع نہیں کیا۔ مجھے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا تھا کہ وہ صحرائی آدمی مینیجر ہی تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اسی رات ایک بیگ تیار کیا اور اگلی صبح نیواڈا کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں نے اپنی بیوی میری لن سے کہا کہ میں ایک کاروباری دورے پر لاس اینجلس جارہا ہوں۔ اس وقت اسے سچائی بتا کر اس پر بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایڈم جونیئر کو بھی یہی بات بتائی۔

کل فاصلہ تو سو میل سے زیادہ تھا۔ میں نے سوچا کیا میں اسے ایک ہی دن میں طے کر سکتا ہوں۔ اگر میں ایسا کر بھی لیتا تو میں نیواڈا کے صحرا میں آدھی رات کو پہنچ پاتا اور یہ طویل سفر مجھے نڈھال کر دیتا۔ بہتر یہی تھا کہ میں راستے میں کسی ہوٹل پر رک کر چند گھنٹے آرام کر کے تازہ دم ہو جاؤں۔ چارلی کا سامنا کرنے کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر میرا چاق چوبند ہونا بہت ضروری تھا۔

گاڑی چلاتے وقت میں اٹھارہ سال پہلے کے ان پانچ خوفناک دنوں کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ جن کی تفصیلات پہلے دن کی طرح آج بھی میری یادداشت میں تازہ اور محفوظ تھیں۔ ایڈم جونیئر کا اسکول سے واپسی پر اچانک لاپتا ہو جانا، بہت زیادہ تاوان کا مطالبہ اور لڑکے کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں۔ میری لن کی گرتی ہوئی حالت، ایف بی آئی کو بلانے کا تکلیف دہ فیصلہ کیونکہ ڈیڑھ لاکھ ڈالرز ایک خطیر رقم تھی جس کا انتظام کرنا میرے لیے مشکل ترین امر تھا۔ جس جگہ رقم پہنچانے کی ہدایت کی گئی تھی، وہ کاؤنٹی کے قریب ایک بنجر علاقہ تھا۔ ایف بی آئی کا منصوبہ تھا کہ سوٹ کیس میں صرف اتنی رقم رکھی جائے جو کہ دیکھنے میں تاوان کے مطالبے کی رقم کے برابر لگے۔ اس کے علاوہ نوٹوں کے ساتھ ایک الیکٹرانک ڈیوائس بھی چھپا دی جائے۔ رقم پہنچانے کا عمل اور پھر اس خبر کے لیے گھر پر طویل اعصاب شکن انتظار کہ آیا منصوبہ کامیاب ہوا یا نہیں، بہت کٹھن گھڑیاں تھیں۔

بالآخر جب خبر آئی کہ ایڈم جونیئر کو زندہ بازیاب کرا لیا گیا ہے تو سکون کی سانس آئی۔ ایجنٹوں نے سوٹ کیس اٹھانے والے شخص کا پیچھا ایک متروکہ لکڑی کے گھر تک کیا جہاں ایک مختصر مقابلے کے بعد مجرم کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایڈم جونیئر کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی لیکن وہ جسمانی طور پر محفوظ تھا۔ پکڑا گیا اغواکار رچ فیلڈ ایک سزا یافتہ مجرم تھا۔ جس کا ایک طویل پولیس ریکارڈ تھا۔ اس نے اعتراف کیا اس نے یہ جرم تنہا نہیں کیا، اس کا ساتھی رابرٹ ورنن مینیجر جس کے بارے میں اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے یہ اغوا کا ماسٹر پلان بنایا تھا۔ وہ ایف بی آئی کے ایجنٹوں کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ رچ فیلڈ کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ

کہاں گیا ہوگا۔ ٹیچر کے فرار کے علاوہ سب ٹھیک تھا۔ سب کچھ وہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ میرا بیٹا محفوظ تھا لیکن ان پانچ دنوں کی آزمائش نے اس پر گہرا نفسیاتی اثر چھوڑا جس سے وہ کبھی مکمل طور پر باہر نہیں نکل سکا۔ وہ ایک شرمیلا اور حساس لڑکا تھا۔ اغوا کے بعد وہ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ مجھ سے اور اپنی ماں سے بھی صرف ضرورت کے تحت بات کرتا۔ اسے ڈراؤنے خواب آتے، خوف سے چلّانے لگتا، اسے دورے پڑنے لگے تھے۔ وہ اکیلے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ نارمل زندگی کی طرف آئے۔ نفسیاتی ماہرین کے پاس بھی لے کر گئے جنھوں نے اس کی تھراپیز کیں جس کے کچھ مثبت نتائج بھی سامنے آئے۔ لیکن اب بھی وہ نارمل زندگی گزارنے کے قابل نہیں تھا۔ چھبیس سال کی عمر میں وہ کئی لحاظ سے ایک چھوٹا خوف زدہ بچہ ہی تھا۔ لچ فیلڈ، لیون ورتھ جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔

اگلے دن میں ایک کٹھن سفر کے بعد پارائٹ پہنچا۔ مارشل لوگن کے مطابق یہ کبھی ایک خوش حال کان کنی کی بستی تھی لیکن اب یہ ایک ’بھوت نگر‘ تھا جس کی آبادی سو سے بھی کم تھی جو پتھروں کے شوقینوں، پسماندہ سڑکوں کے سیاحوں اور چارلی جیسے بن بلائے مہمانوں کی ضرورت پوری کرتا تھا۔ تپش سے اٹھتی لہریں ایک لرزتا ہوا سراب جیسا منظر پیش کر رہی تھیں۔ سڑک ویران تھی صرف چند کاروں اور پک اپس کے، جو ایک شراب خانے اور اس کے ساتھ والے جنرل اسٹور کے سامنے کھڑی تھیں۔ جہاں نایاب معدنیات اور جواہرات کا اشتہار لگا ہوا تھا۔ میرے لیے یہاں رکنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لوگن نے مجھے بتایا تھا کہ وہ متروکہ کان اور ٹیچر کی جھونپڑی کہاں واقع ہے اور وہاں تک کیسے پہنچا جائے گا۔ مجھے وہ پگڈنڈی بنا کسی دشواری کے مل گئی جو کیکٹس سے بھرے میدانوں اور خشک نالوں سے گزرتی ہوئی ایک دوسری پگڈنڈی سے جا ملی جو بہ مشکل دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں آدھا میل چلنے کے بعد میں شکستہ چٹانوں کے ڈھیر کے گرد گھوما اور سو گز کا فاصلہ عبور کر کے ایک چھوٹی پہاڑی کے دامن میں مجھے وہ جھونپڑی دکھائی دی۔ میں نے فوراً بریک لگائی اور گاڑی پگڈنڈی کے ایک طرف کھڑی کر دی۔ وہ جھونپڑی موسم کی سختیوں سے متاثرہ لکڑی اور زنگ آلود لٹکتی ہوئی چادروں کا ایک عارضی ڈھانچا تھی۔ جسے شاید کان سے اٹھا کر لایا گیا تھا۔ ٹیڑھا چولھے کا پائپ جھونپڑی کی چھت سے ایک زاویے پر باہر نکلا ہوا تھا۔ ایک طرف سامنے کی جانب قدیم ٹوٹی پھوٹی پک اپ ٹرک کھڑی تھی اور میں پیچھے پہاڑی کی ڈھلوان پر کھڑا تھا اور عرصہ دراز سے بند کان کے بوسیدہ باقیات دیکھ رہا تھا۔ جھونپڑی کے آس پاس چہل پہل کے کوئی اثرات نہیں تھے۔ میرے خیال میں وہ اندر ہی ہوگا کیونکہ وہاں ایک ٹوٹا پھوٹا ٹرک کھڑا تھا۔ میری گاڑی کا بہترین خاموش انجن تھا۔ اسے میرے آنے کی خبر تک نہ ہوگی۔ اچھا ہے اچانک پہنچنا کئی چیزوں کو آسان بنا دیتا ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی اسلحہ ہوا تو......

میں نے اپنی ہلکی جیکٹ اتاری پھر گاڑی کا کنسول کھولا اور اپنا بیریٹا (Beretta) پسٹل نکالا۔ گھنٹوں کی مشق نے مجھے سکھا دیا تھا کہ اسے معقول حد تک درستگی سے کیسے چلانا ہے۔ میں نے اسے پتلون کی جیب میں ڈالا اور پھر ائرکنڈیشنڈ کار کی ٹھنڈک سے باہر نکل آیا۔ یہ بالکل ایسا تھا جیسے کسی دہکتی ہوئی بھٹی کے منہ کے سامنے قدم رکھنا، درجۂ حرارت سوڈگری سے بھی زیادہ ہی ہوگا۔ جھونپڑی پر زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

اس طویل سفر کے دوران میں نے اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھا تھا لیکن اب جب میں ٹیچر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا تو سلگتی ہوئی نفرت نے میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا اگلنا شروع کر دیا تھا، یہ محض تپش کا نتیجہ نہیں تھا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے سامنے دیکھ کر میرا ردِعمل کیا ہوگا۔ پسٹل کے دستے پر میرا ہاتھ پسینے سے پھسل رہا تھا۔ دروازے سے چند فٹ دور میرے جوتے کی نوک ایک چھپے ہوئے پتھر سے ٹکرائی جس سے وہ لڑھکنے لگا اور دوسرے پتھر سے ٹکرانے کی آواز اس سناٹے میں بہت تیز محسوس ہوئی۔ لیکن اس سے بھی جھونپڑی کے اندر کوئی حرکت محسوس نہیں ہوئی۔ میں اپنا چشمہ صاف کرنے کے لیے رکا۔ دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ اندر سے دبی دبی ناہموار آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پہلے تو مجھے سمجھ نہیں آیا لیکن پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ سوئے ہوئے آدمی کے خراٹوں کی آوازیں ہیں۔ میں نے مزید انتظار نہیں کیا، ہاتھ میں بیریٹا تھامے ... دروازے کو اندر دھکیلا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ اندر سے باسی کھانوں اور انسانی فضلے کی شدید بُو نے میرا استقبال کیا۔ میری آنکھوں کو وہاں کی تاریکی کا عادی ہونے میں چند سیکنڈ لگے۔

وہ لکڑی کے ایک کالے چولھے کے سامنے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے میرے آنے کی آواز سُن لی تھی۔ چند

بیٹنے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ [illegible] بال پر [illegible] تمیض [illegible] طرف نکالیں۔ اس کے سر پر ایک چھوٹا سا [illegible] تھا۔ اس کا دبلا پتلا جسم [illegible] تھا۔ چہرہ، گردن، بازو اور گلے دھوپ سے جھلسے ہوئے تھے۔ [illegible] جسم [illegible] ہو رہا تھا۔ وہ وہاں بیٹھا آنکھیں جھپکتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا اور [illegible] سر جھٹک رہا تھا۔

"تم کون سی بلا ہو؟ تمہیں مجھ سے کیا چاہیے؟" اس نے کانپتے ہوئے بھاری آواز میں پوچھا۔

"تم مینیجر۔" [illegible] میں نے اسے ہلا کے رکھ دیا۔ وہ عجیب طریقے سے زمین پر کھڑا ہوا۔ ایک اور حرکت اس نے یہ کی کہ اپنے دائیں ہاتھ کے ٹیٹو (RVT) کو فوراً بائیں ہاتھ سے چھپا لیا۔ لیکن میں پہلے ہی اس کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ یہ دھوپ سے تھوڑا مدھم ہو چکا تھا لیکن پھر بھی واضح تھا۔ "یہ میرا نام نہیں ہے۔ میرا نام چارلی ہے۔"

"نہیں، تم چارلی نہیں۔ تم رابرٹ ورتن مینیجر ہو۔"

"نہیں، تم غلط بندے کے پاس آئے ہو۔" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بالکل صحیح جگہ، بالکل صحیح بندہ۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "پورے اٹھارہ برس کے طویل تکلیف دہ دنوں کے بعد میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا۔"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔ تم بتاؤ گے کہ تم کون ہو اور تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے جس کا قرض اتارنے کے لیے تم اٹھارہ برس سے میری تلاش میں تھے؟"

"[illegible]"

[illegible]

## دوست

[illegible]

"[illegible]"

"نہیں، کیونکہ جب میں [illegible] میرا کوئی دوست تھا ہی نہیں۔" [illegible] نے [illegible] سے کہا۔

## دیسی گھی

ایک دیہاتی بھاگم بھاگ گاڑی پر سوار ہوا۔ اس کے سر پر چار سیر گھی سے بھری ہوئی ایک مٹکی بھی تھی۔ ڈبے کے اندر آ کر وہ خود تو ایک طرف [illegible] لیکن مٹکی رکھنے کے لیے اسے کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ مسافروں کے پاؤں میں پہلے ہی بہت زیادہ سامان پڑا ہوا تھا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے مٹکی اس زنجیر سے لٹکا دی جو ہنگامی ضرورت کے وقت گاڑی روکنے کے لیے کھینچی جاتی ہے۔

زنجیر پر چار سیر کا بوجھ پڑا تو وہ [illegible] سیدھی ہوئی اور گاڑی کھڑی ہو گئی اور پھر [illegible] منٹ میں ہی ریلوے کا گارڈ اس ڈبے میں پہنچ گیا۔ اس نے زنجیر کے ساتھ گھی سے بھری ہوئی مٹکی لٹکی ہوئی دیکھی تو غصے میں چیخ کر بولا:

"یہ مٹکی کس کی ہے؟"

دیہاتی نے کھڑے ہو کر کہا۔ "میری ہے صاحب۔"

"تم نے اسے زنجیر کے ساتھ کیوں لٹکا دیا ہے؟" گارڈ نے غصے سے پوچھا۔

"جناب! اسے رکھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔" دیہاتی نے معصومیت سے کہا۔

"[illegible]"

[illegible]

"یہ تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟"

"اس سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ میں اب یہاں ہوں تمہارے سامنے۔"

"اکیلے ہو؟ کوئی ایف بی آئی ایجنٹ، کوئی پولیس نہیں؟"

"تم نے صحیح کہا صرف میں......"

"تم کیا کرو گے، مجھے گولی مار دو گے؟"

"ہاں، میں تمہیں مار کر اسی صحرا میں دفن کرسکتا ہوں، کوئی تمہیں نہیں ڈھونڈے گا۔ کوئی تمہیں یاد نہیں کرے گا۔"

منیجر نے اب بھی کسی قسم کے خوف کا اظہار نہیں کیا۔ میری نظر اچانک دیوار پر ٹنگی ایک رائفل پر پڑی جس سے ہرن شکار کیے جاتے ہیں، یہ رائفل ایک کھونٹی میں ٹانگی گئی تھی۔ لیکن اس کی نظریں ایک بار بھی اس سمت نہیں گئیں۔ وہ بس مسلسل میرے پسٹل کو گھورتا رہا۔

"تم نے اور تمہارے ساتھی نے میرے بیٹے کے ساتھ جو کچھ کیا اس کے بعد مجھے تمہیں جان سے مارنے کا پورا حق ہے۔"

وہ بولا۔ "ہم نے تمہارے بچے کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔"

"تم اس بارے میں غلط کہہ رہے ہو۔ تم نے میرے بچے کا بچپن، اس کی جوانی سب چھین لی۔ وہ ذہنی طور پر بالغ ہی نہیں ہوسکا۔ وہ پانچ دن جو اس نے تم دونوں کے ساتھ گزارے، وہ اس کے ذہن سے نکلتے ہی نہیں۔ آج بھی وہ اکیلا گھر سے باہر نہیں جاسکتا۔ لوگوں سے ملنے ان سے بات کرنے سے خوف زدہ رہتا ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ تم نے اسے کوئی نقصان ہی نہیں پہنچایا۔ تم دونوں کی بدولت آج اس کی یہ حالت ہے۔"

"اوہ یہ بہت بُرا ہوا۔ اسے اغوا کرنے کا خیال لچ فیلڈ کا تھا۔ میرا نہیں۔"

"جن دنوں اس پر کیس چل رہا تھا، اس نے اپنے بیان میں واضح طور پر یہ کہا تھا کہ منصوبے کا ماسٹر مائنڈ تم تھے۔"

"وہ جھوٹا ہے۔"

"اور تم کیا ہو؟"

اچانک اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس نے چارپائی کے پاس رکھی کرسی سے ایک گندہ سا رومال اٹھایا جس پر خون کے دھبے تھے۔ اس نے جب رومال منہ سے ہٹایا تو وہ تازہ خون کے دھبوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ "تم نے فارم ہاؤس کیوں اور کب چھوڑا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"جب تاوان کی ادائیگی کے بارے میں بات چیت چل رہی تھی۔ مجھے کوئی اچھا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے لچ فیلڈ کو کہا بھی تھا یہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن وہ دولت کے لالچ میں اندھا ہو رہا تھا۔ پھر جب رقم طے کرنے میں کافی وقت لگ گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس میں کوئی چال لگ رہی ہے اور تم نے پولیس کو خبر کردی ہے۔ یہ بات میں نے لچ کو بھی سمجھائی لیکن وہ نہیں مانا۔ اس لیے میں خود کو بچانے کے لیے جنگل میں جاکر چھپ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"تم وہاں سے کہاں گئے؟ سیدھا یہاں تو نہیں آئے ہو گے؟"

"تمہیں یہ جان کر کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ میں کہاں تھا۔"

"جب لچ فیلڈ رقم لینے گیا ہوا تھا اس کے بعد دس منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ ایف بی آئی ایجنٹ لڑکے کو بازیاب کرانے پہنچ گئے تھے اور میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ دو مہینوں تک میں اِدھر اُدھر چھپتا پھرا اور پھر یہاں آگیا۔"

"اور تب سے تم یہیں ہو۔"

"ہاں، ان تمام سالوں سے اسی جہنم نما جگہ میں پھنسا ہوا ہوں۔"

"تم نے اسے خود چُنا، تم کہیں اور بھی جاسکتے تھے؟"

"کہاں، کہاں جاتا میں، تم بتاؤ تم مجھے چھوڑتے...... لعنت بھیجو ان سب باتوں پر بس اب ختم کردو۔"

"کس چیز کو ختم کردوں؟"

اس کی آواز فریادی انداز میں بلند ہوئی۔ "آگے بڑھو گولی ماردو مجھے۔ میں اس جہنم میں اب مزید رہنا نہیں چاہتا، گولی چلاؤ۔"

میرا ہاتھ پستول سے ہٹ گیا۔ منیجر کو گولی مارنا اسے سزا دینا نہیں تھا بلکہ اسے اس کی تکلیف سے آزاد کرنا ہوگا۔ میں نے پسٹل اپنی جیب میں ڈالا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ نہ تو ایف بی آئی کو خبر کروں گا نہ پولیس کو۔

گاڑی جب گرد اڑاتی ہوئی اس سنسان علاقے سے دور جارہی تھی تو مجھے اندر سکون کی لہریں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ جو بے چینی اٹھارہ سالوں سے بے چین رکھے ہوئے تھی۔ آج خاموش ہوگئی تھی۔ منیجر اب آزاد ہو کر بھی رہا نہیں ہوسکے گا۔ وہ اپنے گناہوں، بیماری اور اس لاوارث صحرا کے پنجرے میں تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ قدرت کا یہ انصاف کسی بھی "گولی" سے زیادہ طاقتور تھا۔

❖❖❖

کچھ لوگ عادت سے مجبور ہوتے ہیں... سیدھے راستے پر بھی غلط کام کرنا ان کی عادت میں شامل ہو چکا ہوتا ہے... ہیرا پھیری کرنے والے ایک عادی مجرم کی نئی کارگزاری....

قانون اور مجرم کے درمیان طے پا جانے والے معاملات......

# ہیرا پھیری

## صائمہ دانش

وہ آدمی سڑک کے کنارے کنارے ٹرالی دھکیلتا جا رہا تھا، ان ٹرکوں کے پاس سے گزرتے ہوئے جو آئرش سرحد عبور کرنے سے پہلے تفتیش کے لیے اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس نے کل صبح کیا تھا۔ اور اس سے پچھلی صبح، اور اس سے بھی پچھلی صبح......

ڈینس بار اس آدمی کو اس دوربین سے دیکھ رہا تھا جو وہ گھر سے لایا تھا۔ پرندے دیکھنے کا شوقین ہونے کی وجہ سے اس کے پاس دوربینوں کے کئی جوڑے تھے۔ ٹرالی میں مخصوص گھاس کے ڈھیر کی صورت میں رکھی تھی، اس میں ایک بیلچہ بھی باہر نکلا نظر آ رہا تھا۔

چھ ماہ پہلے ڈینس نے آئرش ریونیو میں بطور افسر شمولیت اختیار کی تھی۔ یہ آئرش حکومت کا وہ ادارہ ہے جو دیگر ذمے داریوں کے ساتھ کسٹمز ڈیوٹیاں وصول کرنے اور اسمگل شدہ سامان پکڑنے اور ضبط کرنے کا کام کرتا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ سرحد پر سڑک کنارے تلاشی لے رہا تھا۔ جس دن سے اس نے چیک پوائنٹ قائم کیا تھا، ہر روز وہ آدمی ٹرالی دھکیلتا ہوا آ جاتا تھا۔

ڈینس نے آدمی کو رکنے کا اشارہ کیا۔

"صبح بخیر، رے۔"

آدمی نے ٹرالی کھڑی کر دی، اپنے ٹریک سوٹ کی پتلون اوپر کھینچی، اور 90 کلومیٹر فی گھنٹا (جمہوریہ آئرلینڈ) / 60 میل فی گھنٹا (شمالی آئرلینڈ) کی رفتار کی حد والے سائن بورڈ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا حال ہے، ڈینس؟"

ڈینس اس ٹرالی کے گرد گھوما۔ وہ سبز رنگ کی تھی اور اس کا ایک نارنجی ہینڈل غائب تھا۔ اس پر خشک مٹی کے سستے بلاکس رکھے تھے۔ حالیہ ماحولیاتی قوانین نے اس مٹی کے استعمال کو...... جو صدیوں سے آئرلینڈ میں گرمائش اور کھانا پکانے کے لیے بطور ایندھن استعمال ہوتی رہی ہے، صرف باغبانی تک محدود کر دیا تھا۔

مٹی کے ڈھیر کے اوپر گندے بیلچے رکھے تھے۔ ان کے دستوں کے گرد نارنجی ٹیپ لپٹی ہوئی تھی، جس پر R.C کے ابتدائی حروف درج تھے۔ R.C سے مراد رے کمر فورڈ تھا، جو شمالی آئرلینڈ کے ایک مشہور جرائم پیشہ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ منشیات اور انسانی اسمگلنگ، اور اس کے ساتھ سگریٹ اور تمباکو کی غیر قانونی ترسیل، اس خاندان کی خاص پہچان تھی۔ پہلی بار جب ڈینس نے اسے روکا تو فوراً پہچان لیا۔ چند ماہ قبل جیل سے رہائی کے بعد اس کا چہرہ اور نام خبروں میں نمایاں رہا تھا۔ ڈینس نے ہدایات کے لیے اپنے افسرِ بالا کو فون کیا تھا۔

"اسے اچھی طرح کھنگال کر تلاشی لو۔" افسرِ بالا نے ہدایت دی۔

"اگر یہ کومر فورڈ ہے تو یقیناً کسی نہ کسی ٹیڑھے کام میں ملوث ہوگا۔"

رجسٹر دیکھنے اور ریونیو کے آن لائن ڈیٹا بیس کی جانچ کے باوجود، ڈینس کو کچھ بھی نہ ملا۔ اس کے پاس رے کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ گھاس بظاہر سرحد کے آر پار بغیر ڈیوٹی کے منتقل ہو رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے ٹرالی اور اوزاروں کا معائنہ کیا۔ یہ عام قسم کے اوزار تھے جو کسی بھی بلڈر کے سامان میں مل جاتے ہیں لیکن نہ ٹرالی کے پہیے میں اور نہ ہی بیلچے کے دستے میں کوئی اسمگل شدہ چیز چھپائی گئی تھی۔ آخر کار اس نے رے کو مٹی کی اینٹیں اتروانے کا حکم دیا۔ ڈینس نے ایک ایک اینٹ چیک کی۔ ان میں سے صرف چند حشرات الارض ہی نکلے۔ جب ٹرالی دوبارہ لاد دی گئی تو ڈینس نے کہا۔

"ری پبلک کے پاس اپنی مٹی اور گھاس کی کمی نہیں ہے۔ تم یہ سارا مال کیوں لا رہے ہو؟"

رے نے جیب سے ایک سگریٹ نکالی۔ "میری بیوی ڈنڈالک کی ہے۔"

ڈینس اس قصبے سے واقف تھا جو سرحد کے ذرا جنوب میں واقع تھا۔ یہ بلیک راک بیچ سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا، جو اس کی پرندے دیکھنے کی پسندیدہ جگہوں میں سے ایک تھی۔

رے نے سگریٹ جلائی، ایک کش لیا پھر بولا۔

"اس کے والدین اب بھی وہیں ہیں اور بوڑھے ہو رہے ہیں۔ اب جب میں نے سبق سیکھ لیا ہے اور خاندانی دھندے سے الگ ہو گیا ہوں تو وہ چاہتی ہے کہ ہم ان کے قریب رہیں۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں، بس اگر میں اپنے گھر کی تھوڑی سی مٹی اپنے ساتھ لا سکوں...... تو میں یہی کر رہا ہوں۔"

ڈینس کو رے کے اس دعوے پر ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں آیا کہ وہ سدھر چکا ہے۔ لیکن کسی غلط کام کے ثبوت کے بغیر، اس کے پاس اسے جانے دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اگلے دن رے پھر آ گیا، اسی ٹرالی کے ساتھ جس کا ایک نارنجی ہینڈل غائب تھا۔ ڈینس نے ایک بار پھر ٹرالی، اوزار اور ٹرف سب چیک کیا۔ اور ایک بار پھر، کچھ ہاتھ نہ آیا۔

"یہ مٹی ٹرک میں کیوں نہیں لاتے؟"

رے مسکرایا، انگڑائی لی۔ "آئرلینڈ میں بہار اپنے جوبن پر ہے۔ اتنے سال اندر رہنے کے بعد ذرا ٹہلنے کو دل چاہتا ہے۔"

ڈینس نے ہچکچاتے ہوئے، رے کو جانے کا اشارہ کر دیا۔

اگلے دن جب رے پھر ٹرالی دھکیلتا ہوا نظر آیا تو ڈینس نے اپنی تفتیش کی کوششیں تیز کر دیں۔ اس نے ٹرالی کا واحد نارنجی ہینڈل بھی اتار دیا اور دستے کے اندر جھانکا۔ وہ خالی نکلا۔ اس نے ٹائر کی اندرونی ٹیوبز بھی چیک کیں۔ وہاں بھی کچھ نہیں ملا۔ اس نے ٹرالی سے پینٹ کھرچ کر دیکھا کہ کہیں وہ قیمتی دھات کی تو نہیں۔ وہ بھی نہیں۔ اس نے اوزاروں کے دستوں سے نارنجی ٹیپ کھولا، نیچے بھی کچھ نہیں تھا۔ ڈینس نے تو یہاں تک کیا کہ مٹی کا ایک نمونہ رات بھر کے لیے کرائم لیب بھجوا دیا۔

"ہر چیز چیک کرو۔" اس نے کہا۔ "منشیات، سونا، نایاب زنخانتیں...... جو بھی تمہارے ذہن میں آئے۔"

"یہ بس مٹی ہے۔" لیب کی رپورٹ آئی۔

آج ڈینس کے چیک پوائنٹ پر رے کی آٹھویں حاضری تھی۔ وہ رفتار کی حد والے سائن بورڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا رہا اور سگریٹ پیتا دیکھتا رہا کہ ریونیو افسر ایک بار پھر مٹی سے بھری ٹرالی کی تلاشی لے رہا ہے۔

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "میں نے بتایا تھا میں سدھر رہا ہوں۔ میں اور میری بیوی کا کزن، ہم ایک جائز کاروبار شروع کر رہے ہیں۔"

ہاں، بالکل، ڈینس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "تمہیں جانے کی اجازت ہے۔" اس نے کہا۔

مزید دو دن گزر گئے، ڈینس اور رے اسی معمول کو دہراتے رہے لیکن تیسرے دن رے نہیں آیا۔ اگلے دن بھی غائب رہا اور وہ دن ڈینس کا چیک پوائنٹ پر ڈیوٹی کا آخری دن

بھی تھا۔

ڈینس نے اپنی اگلی تعیناتی سے پہلے چند دن کی سالانہ چھٹی لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ دن کاؤنٹی ڈاؤن کے نچلے ساحل اور کاؤنٹی لاؤتھ کے بالائی حصے میں پرندے دیکھتے ہوئے گزارے۔

اپنی چھٹی کے آخری دن کی دوپہر وہ ڈنڈالک میں تھا، وہ خوش تھا کہ بلیک راک بیچ سے واپسی پر وہ اپنے پسندیدہ اور نایاب پرندے دیکھنے میں کامیاب رہا تھا۔

گھر واپسی سے پہلے کچھ کھانے کی نیت سے وہ ایک ریستوران میں آ گیا۔ وہ سرکے میں بھیگے فرائز کے ساتھ تلی ہوئی وائٹ فش سے لطف اندوز ہو رہا تھا، جب اس کی نظر سڑک کے اس پار کھڑے ایک چھوٹے ٹرک پر پڑی۔

آر۔ کومرفورڈ گارڈن مینٹیننس اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا۔ ٹرک کی پچھلی باڈی میں باغبانی کے مختلف اوزار تھے، جن میں ایک ٹرالی بھی تھی جس کا ایک نارنجی ہینڈل تھا۔ شاید رے سچ ہی بول رہا تھا کہ وہ سیدھے راستے پر آ گیا ہے، ڈینس نے سوچا۔

وہ ابھی اپنے کھانے سے فارغ ہو رہا تھا کہ ایک اور چھوٹا ٹرک پہلے والے کے ساتھ آ کر رک گیا۔ اس کے دروازے پر بھی آر۔ کومرفورڈ گارڈن مینٹیننس لکھا ہوا تھا۔ پیچھے اس نے گھاس کاٹنے والی مشین اور باغبانی کے دوسرے اوزار دیکھے، جن میں ایک اور ٹرالی شامل تھی جس کا صرف ایک نارنجی ہینڈل تھا، ساتھ ہی گھاس کا گٹھر اور ایک بیلچہ تھا جن کے دستوں پر نارنجی ٹیپ لپٹی ہوئی تھی۔

ڈینس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ وہ سڑک پار کر کے اس ٹرک کی طرف تیزی سے بڑھا۔

"میں پراپرٹی مینیجر ہوں۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"ہمیں ہمیشہ نئے لینڈ اسکیپرز کی تلاش رہتی ہے۔ تمہارے پاس کتنے ٹرک ہیں؟"

"دس۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

ڈینس نے ٹرک کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہ R. Comerford کون ہے؟"

"وہی مالک ہے، رے کومرفورڈ۔" ڈرائیور نے کہا۔

ڈینس نے ٹرک کے پچھلے حصے میں پڑی ٹرالی کی طرف اشارہ کیا۔

"لگتا ہے اس کا ایک ہینڈل غائب ہے؟" اس نے دوسرے ٹرک کی طرف سر سے اشارہ کیا۔

"اور اس کا بھی۔ سب کے ایسے ہی ہیں؟"

ڈرائیور نے ایک لمحہ سوچا۔ "ہاں، سب ایک جیسی ہیں۔"

"آپ کے وقت کا شکریہ۔" ڈینس نے کہا۔

وہ واپس اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے، فون میں میپ ایپ کے اندر ٹرک کے دروازے پر لکھا ہوا ایڈریس ڈال رہا تھا۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تو اس نے ایک کال کی، حالانکہ اسے اندازہ تھا کہ جواب کیا ہوگا۔

"مجھے اس شخص سے ملواؤ جس نے پچھلے دو ہفتوں میں کسٹمز چیک پوائنٹ پر دوسری شفٹ لگائی تھی؟" اس نے کہا پھر اپنا تعارف کروایا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔

"میں لیام میک کیفرٹی ہوں۔"

"مجھے تم سے تمہارے کسٹمز چیک پوائنٹ کے بارے میں کچھ جاننا ہے۔ کیا تم رے کومرفورڈ کو جانتے ہو؟"

"کون نہیں جانتا؟ وہ پچھلے ہفتے تقریباً ہر رات آیا تھا، اور اس سے پہلے بھی۔"

"جنوب سے شمال؟"

"ہاں۔"

"کیا اس کے پاس ٹرالی تھی؟"

"ٹرالی؟ نہیں۔"

"باغبانی کے اوزار؟"

"اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بس پیدل آتا تھا۔"

"شکریہ۔" ڈینس نے کہا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور میپس کی دی گئی سمتوں کی پیروی کرنے لگا۔

اب ڈینس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی۔ رے کومرفورڈ باقاعدہ طور پر ایک جائز کاروبار شروع کر سکتا تھا۔ اور وہ کر بھی چکا تھا مگر پھر بھی، وہ عادت سے مجبور، خود کو روک نہیں پایا۔ اس نے دس دن میں مٹی کی ایک پوری کھیپ سرحد پار دھکیل کر پہنچائی۔ بچت شاید پندرہ سو، یا زیادہ سے زیادہ دو ہزار پاؤنڈ بنتی تھی۔ مگر وہ بات اصل نکتہ نہیں تھی۔ ایک اسمگلر ہمیشہ اسمگلر ہی ہوتا ہے...... حتیٰ کہ جب معاملہ دس درآمد شدہ ٹرالیوں اور اتنی ہی تعداد میں گھاس اور بیلچوں پر واجب الادا فیسوں اور ٹیکسوں سے بچنے کا ہو۔

"اس بات پر جشن تو بنتا ہے۔ گھر پہنچ کر ایک پنٹ بیئر تو ہو ہی جائے۔" ڈینس نے سوچا، جب اس نے ایک سبز دھاتی عمارت کے سامنے گاڑی پارک کی جس پر "آر۔ کومرفورڈ گارڈن مینٹیننس" لکھا ہوا تھا۔

جب وہ گاڑی سے باہر نکلا تو ڈینس کو خیال آیا کہ وہ بھی تو رے کی طرح اپنی عادت سے مجبور تھا۔ آخر، کتنے دوسرے ریونیو افسر چھٹیوں پر بھی اپنی چالان بک ساتھ لے کر جاتے ہیں؟

❖❖❖

# شکار

عائشہ نصیر

مصیبت کبھی بتا کے نہیں آتی... ناگہانی نازل ہوتی ہے... وہ بھی نہایت مسلسل کے ساتھ... کچھ کردار ہوتے تو بہت خوب ہیں... مگر دھوکا دینے والے... ایسی ہی دھوکا دہی اور فریب کاری کا شکار ہونے والی دو لڑکیوں کا سنسنی خیز ماجرا... وہ ویران اور خطرناک راستے پر گامزن تھیں... اچانک ہی کسی بلا کے مانند مصیبت نے آن گھیرا... وقت و حالات نے کچھ سمجھنے یا سمجھانے کا موقع نہ دیا... مصیبت کی گھڑیاں تھیں جو نہایت کامیابی سے ان کو زندگی سے دور کررہی تھیں... ایسے کردار تعاقب میں تھے جو زبان سے کچھ کہے بغیر سب کچھ کہہ جاتے ہیں...

**جدید فیشن زدہ معاشرے میں مرد اور عورت کے تعلق کی دل شگاف پیچیدگیاں**

اُس نے سیاہ جوگر پینٹ پر سرمئی رنگ کی ہوڈی پہن رکھی تھی۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ پُرسوچ نظروں سے سامنے کھڑی گاڑی کو دیکھ رہا تھا...... جب اندر چٹکیاں کاٹتی بے چینی کچھ زیادہ ہی شدید ہوئی تو اس نے کوئی تیسری بار پاس کھڑے زاویار سے تصدیق چاہی۔

''تجھے پورا یقین ہے، یہ گاڑی ٹھیک رہے گی؟''

''ہاں یار...... اور کیا چاہتا ہے پرائیویٹ جیٹ لے آؤں...... میرا باپ امیر ہے مگر اتنا بھی نہیں......'' زاویار پہلے ہنسا پھر ایک جست لگا کر گاڑی کے قریب آگیا...... ایک تھپکی اس ڈبل کیب ہائی لکس کی باڈی پر دی پھر پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔

''پہاڑی راستوں کے لیے اچھی ہے...... اور سب سے بڑھ کر میری نہیں ہے......'' اس نے کمینگی سے آنکھ ماری۔ ''کہیں سی سی ٹی وی کیمرے میں آئی یا کسی نے نمبر نوٹ بھی کیا تو......''

وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا، مضطرب جسم کا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر شفٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''نمبر پلیٹ بدل دے۔''

''کیا......'' زاویار اسے گھورنے لگا۔ ''بول تو رہا ہوں میری نہیں ہے......''

''پھر بھی بدل دے۔'' اس نے بات کاٹی۔ ''تو یہ میرے لیے کررہا ہے نا؟ تو پھر جیسے میں کہتا ہوں ویسا ہی کر......''

''تو بھی کیا گیدڑ ہے خدا کی قسم......'' چند لمحے بعد اسے گھورتے رہنے کے بعد اس نے سر جھٹکا۔ ''ابھی اتنا وقت نہیں رہا، تجھے پتا ہے، تھوڑی دیر میں نکلنا ہے...... اور کوئی حکم ہو تو عرض کریں مائی باپ۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''باقی سب پورا ہے؟'' اس نے سنجیدگی سے سوال کیا...... وہ جتنا ٹینس تھا، زاویار اتنے ہی اطمینان سے ― بلکہ پُرجوش تھا۔ وہ ان کے گروپ کا بھیڑیا تھا...... خود کو الفا کہتا...... شکار سے کھیلنے کا شوقین۔

''ہاں اگر تیری مراد فیول اور اس گھٹیا ماسک والے آئیڈیے سے ہے تو......''

''ٹھیک ہے...... گھٹیا ہے تو تُو مت لگانا......'' اسے غصہ آگیا، لہجہ پھر بھی قابو میں تھا، وہ نہیں چاہتا تھا، زاویار کو اس کے اندرونی اضطراب کی بُو ملے...... اور وہ پھر اس کی بزدلی کے لیے نت نئے القابات ایجاد کردیتا۔

''چل پھر...... میں چری بکس لے آؤں...... ابھی نکلیں گے تو ان سے پہلے اس پوائنٹ تک پہنچیں گے۔'' وہ اس کا کندھا تھپتھپا کر اندر کی طرف دوڑا، عجیب ہی سرمستی اور وحشیانہ جوش تھا اس کی حرکات میں...... جبکہ وہ وہاں کھڑا رہ گیا۔ گاڑی کو گھورتا ہوا۔

اور اب وہ پہاڑی سڑک کے کنارے اس مقام پر

موجود تھے۔ کچھ ہی آگے بائیں جانب ایک تنگ، کچی ناہموار سڑک وادی میں اترتی تھی۔ دائیں طرف سڑک کا ایک حصہ پہلے ہی بیٹھ چکا تھا، یہ وہی جگہ تھی جہاں سے آگے جاکر چند سو میٹر بعد راستہ مکمل بند ہوجاتا تھا۔

ہائی لکس اسی تنگ حصے پر ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ سامنے سے آتی گاڑی کو فوراً نظر نہ آئے، مگر پینجر سائڈ مرر میں پیچھے کی پوری سڑک صاف دکھائی دیتی تھی...... انجن بند تھا، مگر اندر کی خاموشی میں ڈیش بورڈ کی مدھم بیک لائٹ جل رہی تھی۔

سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے زاویار کی انگلیاں اسٹیئرنگ وہیل پر بے ترتیب سی تال میں بج رہی تھیں۔

جبکہ وہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا بار بار گردن موڑ کر پیچھے کی سڑک کو براہِ راست دیکھتا، پھر بے چینی سے مرر میں جھانکنے لگتا۔

اچانک موڑ کے اُس پار سیاہ کار کی جھلک اُبھری۔ وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

''ایک گاڑی آرہی ہے......'' اس کی آواز دبی ہوئی مگر تناؤ سے بھرپور تھی۔

زاویار کی انگلیاں رک گئیں، دھوئیں کا ایک گہرا مرغولہ پھونکتے ہوئے اس نے بھی مرر پر نظریں جمادیں۔

''ڈیم......'' گاڑی جونہی ذرا قریب آئی اور صاف طور دیکھنے کے قابل ہوئی، اس نے جھلاہٹ سے بے اختیار ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''یہ عینا کی کار ہے۔''

''تو......'' زاویار ذرا آگے ہوا اور اس نے فوراً اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا۔

''کیا کر رہا ہے...... انہیں اپنی شکل دکھائے گا کیا؟''

''تو کیوں اتنا مر رہا ہے...... نہیں دیکھے گی وہ......''

وہ تپ گیا۔

سیاہ کرولا تیزی سے ان کے برابر سے گزری اور چند سیکنڈ کے لیے بائیں مرر میں پوری طرح سما گئی۔ لمحے بھر میں ہی اس نے وہ دیکھ لیا جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔

''میں شیور نہیں ہوں وہ ان کے ساتھ ہے یا نہیں...... واپس چل۔''

''میں تو شیور ہوں اور میرا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے زاویار نے آخری کش لے کر سگریٹ باہر اچھالی۔

وہ ساکت سا اسے دیکھنے لگا۔ ''تو نے کہا تھا، تو یہ میرے لیے کر رہا ہے۔''

''اب تو یہ میرے لیے کر......'' زاویار کی آواز میں دبی ہوئی بیتابی در آئی۔ ''میں آج کا دن ایسے ضائع نہیں کر سکتا، اسے دیکھنے کے بعد تو بالکل نہیں۔'' اس نے دور ہوتی گاڑی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''تجھے مزہ آنے والا ہے

ٹرسٹ می۔'' اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک ابھری تھی..... سرخ ہوڈی کو چہرے تک کھینچتے ہوئے اس نے چابی گھمائی اور انجن بھاری کھردری گرج کے ساتھ زندگی پا گیا۔

☆☆☆

آج دن کا آغاز ہی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اس پر مستزاد مناہل نے عین موقع پر ان کے ساتھ جانے سے معذرت کرلی۔ حرم کو بڑا شدید غصہ آیا تھا مگر وہ ضبط کر گئی۔ وہ تو اس برتھ ڈے پارٹی میں جانے کے لیے بھی ان کے پرزور اصرار پر راضی ہوئی تھی ورنہ تو سدرہ، مناہل کی دوست اور عینا کی کزن تھی۔ اس کا دل چاہا تھا مناہل کی طبیعت صاف کرنے کو مگر اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر اپنا طیش دل ہی میں دبانا پڑا۔ مناہل کا کچھ دن پہلے ہی بریک اپ ہوا تھا اور وہ بس رونے کے بہانے تلاشتی تھی۔ حرم نہیں چاہتی تھی، آج کے دن دیگر بدشگونیوں کے ساتھ ساتھ اس کے رونے کی نحوست بھی شامل ہوجائے۔

''نہیں جاتے۔'' ہائی ویسٹ ٹراؤزر اور ہلکے رنگ کی فِٹڈ ٹاپ پر سویٹر پہنتے اس نے ایک بار پھر یہ بات کی..... تو عینا کو غصہ آگیا۔

''کیوں..... تم کیا اس کی دم چھلی ہو؟ اسے اپنا سوگ منانا ہے تو مناتی رہے ہم کیوں اس کے لیے اپنی انجوائمنٹ چھوڑیں..... حد ہے یار۔'' غصے سے لپ اسٹک بھی ہونٹوں سے باہر لگ گئی تھی، اس نے غصے سے ٹشو چھینا۔

''بات وہ نہیں ہے..... مجھے بس کچھ اچھا نہیں لگ رہا..... اتنی دور جائیں گے پھر آئیں گے۔'' وہ کہہ نہیں پائی کہ وہ اپنے اندر انگڑائی لیتی بے چینی سے پریشان ہے۔

''کوئی دور نہیں۔'' عینا نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''شام سے پہلے پہلے وہاں پہنچا دوں گی..... پھر رات وہیں رک کر کل سدرہ کے ساتھ واپس آئیں گے۔''

عینا نے اپنا پلان بتایا اور وہ چلا اٹھی۔ ''کیا.....؟ میں رات وہاں نہیں گزارنے والی۔''

''تمہیں پتا تو ہے، ایسی پارٹیاں دیر تک چلتی ہیں اور رات کے وقت ان پہاڑی علاقوں میں سفر کرنا..... مجھے کوئی مسئلہ نہیں..... میں گاڑی چلا سکتی ہوں مگر..... رسک کیوں لیں۔'' عینا بڑے اطمینان سے تھی۔

''میرے گھر والوں کو پتا چلا تو یونیورسٹی، میری پڑھائی سب بند ہوجائے گا۔'' وہ دوبارہ بیڈ پر جا بیٹھی، ٹانگیں اضطراری کیفیت میں ہل رہی تھیں۔

''انہیں کون بتائے گا؟ تم یا میں؟ تم ہاسٹل میں ہو میری جان..... زندگی انجوائے کرو۔ بعد میں ویسے بھی کسی جمیل شکیل کی بیوی بن کے گھر کی چار دیواری میں قید کردی جاؤ گی۔''

''خیر..... اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔'' اس نے ناراضی سے کندھے جھٹکے۔

مناہل اور عینا ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی تھیں..... روشن خیال..... روک ٹوک اور پابندیوں سے کوسوں دور..... حرم بھی کسی ٹٹ پونجیے خاندان سے نہیں تھی، اس کے بھائی ریاست کے طاقتور سیکیورٹی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ طاقت تھی، آزادی بھی مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ حدود و قیود بھی سختی سے لاگو تھیں خاص طور پر لڑکیوں کے لیے۔

اور اب جب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی عینا کی بات مان گئی تھی تو راستے میں ایک نیا ٹنٹا شروع ہوگیا۔ عینا نے ایک گھنٹے میں پہنچانے کا وعدہ کیا تھا اور حرم نے اس پر آنکھ بند کر کے یقین کیا تھا۔ وہ اکثر چھٹیوں میں اپنے گھر جانے کے بجائے ماموں کے ہاں چلی جاتی تھی، اور اکثر تو اکیلی ہی نکل پڑتی۔ اس لیے حرم کو لگا، اسے راستوں کا بہتر اندازہ ہوگا..... سڑکوں کا، موڑوں کا، فاصلے کا..... مگر پھر وہ رکاوٹ آئی جو عینا کی ڈرائیونگ اور راستوں سے واقفیت، دونوں کے لیے امتحان بن گئی۔ ایک موڑ کے بعد، سڑک بند تھی۔ مٹی کے بھاری تودے، بکھرے ہوئے پتھر، اور دو ادھ کھلے بیریئر جیسے کسی نے عجلت میں راستہ بند کر کے سب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہو۔ صرف ایک بورڈ..... جس پر متبادل راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

وہ متبادل راستہ نقشے پر تو تھا، مگر حقیقت میں وہ ایک تنگ، پرانی، جنگل میں گھسی سڑک تھی جو پہاڑ کے اندر غائب ہوجاتی تھی۔

''ہم واپس نہیں جاسکتے؟'' حرم نے پوچھا۔

عینا نے گھڑی دیکھی۔ سدرہ کے میسجز پہلے ہی آنے لگے تھے۔ ''اگر واپس گئے تو ایک گھنٹا اور لگے گا۔ یہ راستہ بس پندرہ منٹ کا ہے۔'' عینا نے شاید اس سے زیادہ خود کو یقین دلایا اور گاڑی کا رخ اس طرف موڑ دیا۔

جیسے ہی گاڑی اس متبادل سڑک پر اتری، موبائل سے سگنلز بھی غائب ہوگئے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی حرم کے دل میں خوف و اضطراب بھی..... اور پھر اچانک ان کی توجہ پیچھے آرہی اس سیاہ ہائی لکس نے کھینچی، پہلے تو ظاہر ہے انہوں نے اسے ایک عام مسافر گاڑی ہی سمجھا مگر پھر ایک تو اس کی ساخت، دوسرا اس نے ایک بار بھی انہیں اوورٹیک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے

بجائے عینا رفتار تیز کرتی تو وہ بھی تیز ہو جاتی، وہ دھیمی کرتی تو وہ بھی ساتھ ہی سست پڑ جاتی۔

حرم لب بھینچے خاموش بیٹھی تھی...... کاش یہ لوگ اس کی چھٹی حس پر یقین کرنا سیکھ جاتے۔

''وہ ہمارے بالکل پیچھے ہیں۔'' اس نے پسنجر سائڈ کی کھڑکی سے پیچھے دیکھا۔ خوف میں ڈوبی اس کی بڑبڑاہٹ اتنی بلند ضرور تھی کہ اسٹیئرنگ پر رکھے عینا کے ہاتھوں نے گرفت اور سخت کر دی...... ایک ہاتھ ہی کیا اس کا پورا وجود اکڑا ہوا تھا اور نظریں بالکل سیدھ میں تھیں۔

''سب کچھ ٹھیک رہتا۔ ہم اندھیرا ہونے سے پہلے ہی پہنچ چکے ہوتے اگر وہ منحوس سڑک خراب نہ نکلتی۔'' عینا کی بھینچی ہوئی آواز ابھری۔

''سب کچھ ٹھیک رہتا اگر ہم اسی موڑ سے واپس مڑ جاتے۔'' حرم نے جتانے والے انداز میں کہہ کر ایک بار پھر بے چینی سے اپنی موبائل اسکرین روشن کی۔ سگنلز ہنوز غائب تھے......

اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ ان پیچیدہ پہاڑی راستوں پر کتنا دور نکل آئے تھے۔

''سانس لو حرم۔'' اس نے تسلی دی۔ ''وہ شاید ہمیں اوورٹیک کرنا چاہتے ہوں۔ میں گاڑی کہیں سائڈ پر لگا لوں گی۔''

''یہاں سائڈ پر لگانے کی کوئی جگہ نہیں۔'' حرم کا لہجہ چٹخا۔ اوورٹیک کرنے کے مواقع کم نہیں آئے تھے۔ اگر انہیں آگے نکلنا ہوتا تو کب کے نکل چکے ہوتے۔

مگر وہ بس پیچھے ہی تھے۔ خاموشی سے، ضدی تسلسل کے ساتھ...... جیسے ان کے ضبط اور اعصاب کا امتحان لے رہے ہوں۔ کاش منائل کے ساتھ ہی رہ گئی ہوتی۔'' جب سے وہ اس راستے پر آئے تھے، یہ پچھتاوا نجانے کتنی بار اسے ڈس چکا تھا۔

''دیکھو، وہیں۔'' عینا نے اشارہ کیا اور گاڑی کو دائیں جانب پہاڑی ڈھلوان میں تراشی گئی بجری کی تنگ سی سائڈ لین کی طرف موڑ دیا۔

مگر ہیڈ لائٹس پیچھے ہی رہیں۔

''یہ ہمیں اوورٹیک کیوں نہیں کر رہے؟'' سوئیٹر اپنے وجود کے گرد سختی سے لپیٹتے ہوئے حرم کی آواز بلند ہوئی۔

اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ ہائی لکس نے اچانک رفتار بڑھائی اور اس بار، بنا کسی جھجک کے، تیزی سے انہیں کراس کر گئی۔ چند ہی سیکنڈ میں پہاڑیاں پھر اندھیری اور خاموش ہو گئیں...... سوائے ان کی گاڑی کے انجن کی مدھم گنگناہٹ کے۔

''دیکھا؟'' عینا نے فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ایکسلریٹر دبا کر سڑک پر واپس آ گئی۔ ''کوئی سر پھرے بدمعاش نہیں، کوئی سیریل کلر نہیں۔''

حرم نے جواب نہیں دیا، وہ اپنے موبائل کو گھور رہی تھی...... عادت سے مجبور ہو کر اس نے منائل کو اس گاڑی کی تفصیل بھیجی تھی...... اگرچہ میسج سینڈ نہیں ہوا تھا لیکن وہ جانتی تھی، راستے میں کہیں اگر سگنل آتا تو وہ ڈلیور ہو جاتا......

اسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ منائل اس میسج کو سنجیدگی سے لے گی بھی یا نہیں...... وہ اور عینا اکثر اس کی توہم پرست فطرت کا مذاق اڑاتے تھے، جسے ہر گھورنے والا آدمی سیریل کلر لگتا، پاس سے گزرنے والی سیاہ شیشوں والی گاڑی مشکوک لگتی...... کوئی اتفاقاً بھی اس کے پیچھے چل رہا ہوتا تو اسے وہ اپنا تعاقب کرتا محسوس ہوتا۔ اس وقت بھی وہ اجنبی گاڑی ان سے آگے نکل تو گئی تھی مگر اس کے حلق میں پھنسی وہ خوف کی گٹھلی نیچے اترنے کو تیار نہیں تھی۔

''موڑ مڑتے وقت اسپیڈ کم کرنا۔'' حرم کو اپنے معدے میں اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ناہموار کھڑکی کے کنارے پر رکھا، تو ٹھنڈی رات کی سرد ہوا کا تھپیڑا چہرے سے آ ٹکرایا۔ پسنجر سیٹ والی کھڑکی کچھ دن پہلے دروازے کے فریم کے اندر دھنس گئی تھی۔ ہینڈل گھمانے پر بھی شیشہ اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں تھا۔ یہ مینوئل ونڈوز والی گاڑی تھی، اور عینا نے اپنی ازلی بے پروا طبیعت کے باعث اسے ٹھیک کروانے پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ حرم اب کپکپانے لگی تھی۔ اس ہلکے سے سوئیٹر کے بجائے اسے اپنی جیکٹ یا شال لانی چاہیے تھی۔ یہ پہاڑیاں شہر کے مقابلے میں کم از کم دس ڈگری ٹھنڈی تھیں اور اندھیرا اس سردی کو اور بھی کاٹ دار بنا رہا تھا۔

''تمہیں منائل نے کچھ بتایا؟'' حرم کی خاموشی عینا کو بے چین کرنے لگی تھی، فضا کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے اس نے یہ بات چھیڑی اور حرم چونک گئی۔

''کس بارے میں؟''

''عادل سے اس کے بریک اپ کے بارے میں......'' عینا نے کہا۔

''میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی، پھر میں نے سوچا، شاید وہ یہ غم اکیلے منانا چاہتی ہے۔'' حرم نے ایک گہری سانس لے کر بتایا۔

"کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگتی...... جس عادل کی باتیں کر کر کے صبح و شام وہ ہمارے کان کھایا کرتی تھی، اب ہمیں اس سے بریک اپ کی وجہ تک نہیں بتارہی...... جبکہ ان کی منگنی ہونے والی تھی۔" عینا کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اگر میری عادل سے بات چیت ہوتی تو میں اسی سے پوچھ لیتی۔" حرم کا لہجہ پُرسوچ تھا۔ عادل انہی کا یونیورسٹی فیلو تھا اور وہ یونیورسٹی ملک کی مہنگی ترین پرائیویٹ جامعات میں شمار ہوتی تھی۔ یہاں داخلہ صرف میرٹ سے نہیں، پس منظر سے بھی ملتا تھا۔ زیادہ تر طلبہ و طالبات بیوروکریٹس، بزنس ٹائیکونز اور سیاست دانوں کے بچے تھے......

عادل بھی ایک بااثر بیوروکریٹ کا بیٹا تھا۔ بے حد خوش شکل، خوش لباس اور وراثت میں ملی خود اعتمادی کے ساتھ وہ یونیورسٹی کے اس بدنام مگر طاقتور حلقے کا حصہ تھا جو خود کو "دی پیک" کہتا تھا۔ یہ وہ بگڑے ہوئے امیر زادے تھے جن کی پہچان پڑھائی، پوزیشن یا کسی نصابی سرگرمی سے نہیں تھی۔ ان کی شہرت ان کی چمچماتی گاڑیوں، شہر سے باہر فارم ہاؤسز پر ہونے والی بے لگام پارٹیوں، اور بدلتی ہوئی لڑکیوں کے ناموں سے وابستہ تھی۔

حرم کو ان سے نفرت تھی۔ کھلی، بے لاگ نفرت...... بغیر اس تاویل کے کہ وہ بُرے تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ جس دن اسے یہ خبر ملی تھی بلکہ مناہل نے خود چمکتی آنکھوں اور تمتمائے چہرے کے ساتھ بتایا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے ہر لحاظ سے۔ مزاج میں، عادات میں اور ظاہر طور پر بھی...... اس کے سامنے مناہل بالکل عام سی لگتی تھی، جھجکی ہوئی، دبی ہوئی سی...... حرم جانتی تھی، شخصیات میں اس درجہ تضاد کے ساتھ پنپنے والے رشتے زیادہ دیر نہیں ٹکتے مگر اس وقت انہوں نے بس دوست کی خوشی میں خوش ہونا ہی کافی سمجھا تھا۔ اس نے مناہل سے یہ تک نہیں کہا کہ اپنا خیال رکھے۔

"تیرا کیا خیال ہے...... وہ ڈر گئی ہوں گی۔"

زاویار نے ہائی لکس کچی سڑک کے کنارے ذرا ہٹ کر روک دی تھی۔ انجن بند تھا، ہیڈلائٹس آف۔ صرف رات کی نمی بھری ہوا، درختوں کی سرسراہٹ اور دور کہیں بہتے پانی کی مدھم آواز ان کے گرد پھیلی تھی۔

"اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو شاید وہ اسے پرینک سمجھیں۔" اس نے ڈیش بورڈ سے وہ سیاہ، خوفناک سا ربڑ ماسک اٹھایا اور چہرے پر چڑھالیا۔

زاویار نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ "کیوں...... وہ کیا تیری سالیاں ہیں جو تجھے دیکھ کر وہ اسے ایک مذاق سمجھیں گی؟" اس نے اس پر طنز کسا۔

"بنتے بنتے رہ گئیں۔" وہ ماسک کے پیچھے سے ہنسا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس مسئلے سے نکلنا ہے یار...... جب تک میں اس مصیبت سے نہیں نکلتا، میں تیرا کوئی ایڈونچر انجوائے نہیں کرسکتا۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے بے پروائی سے کندھے جھٹکے۔ "یہ صرف تیرا نہیں، سب کا مسئلہ ہے...... ہم سنبھال لیں گے۔ ویسے بھی...... اس رونی صورت کو کچھ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکی ہوتی۔"

"اور کر گئی تو...... اب وہ زمانہ نہیں رہا جب لڑکیاں رو دھو کر خاموش ہو جاتی تھیں...... اب تو سیدھا سوشل میڈیا پر کچا چٹھا کھول دیتی ہیں۔" اس کی آواز میں اضطراب تھا۔

"یار...... تو مجھے تھوڑی پتا تھا، تیری لیلیٰ عین وقت پر اپنا پلان کینسل کر دے گی......" زاویار جھنجلا گیا۔

"ہاں تو کہا تھا نا واپس چل......" وہ تلخی سے بولا۔ "کچھ اور سوچ لیتے مگر نہیں...... تیری تو حرم پر رال ٹپک گئی۔"

زاویار کے جبڑے بھنچ گئے...... جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے ہونٹوں میں دبایا اور لائٹر جلایا۔ "میری اس پہ کب سے نظر تھی تو جانتا ہے...... میں یہ گولڈن چانس مس نہیں کرسکتا تھا......" شعلے کی لپک ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں اتری۔

"اور ویسے بھی......" وہ سگریٹ کا پہلا کش لے کر مسکرایا۔ "ہم کوئی چارج شیٹ نہیں کٹوا رہے، بس تھوڑا سا ڈرا رہے ہیں۔ تھوڑا سا ہلا رہے ہیں۔" دھواں آہستہ آہستہ کیبن میں پھیلنے لگا۔

"باقی جو ہوگا۔" اس نے سائڈ مرر پر نظر ڈالی۔ "وہ حالات خود ڈیسائیڈ کرلیں گے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی چھائی تھی۔

پھر اس نے کلچ پر پاؤں رکھا اور آہستہ سے چابی گھمائی۔ انجن کی ہلکی گڑگڑاہٹ اندھیرے میں گونجی۔ "وہ آنے ہی والی ہیں۔" ڈیش بورڈ سے دوسرا سرخ ماسک اٹھا کر اس نے چہرے پر چڑھایا۔

ہائی لکس ساکت کھڑی تھی...... جیسے جھپٹنے سے پہلے سانس روکے کوئی درندہ۔

گاڑی اب باقاعدہ چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ انجن کی آواز بھاری ہوگئی تھی اور ہوا پہلے سے زیادہ کاٹ دار۔ حرم

...ان کا [illegible] سیدھی [illegible] رخساروں میں [illegible]

"تمہیں وہ لڑکی یاد ہے...... جو پچھلے سال لاپتا ہوئی تھی؟" اس کی آواز غیر ارادی طور پر دھیمی ہوگئی۔

عینا نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا، پھر نظریں سڑک پر جمادیں۔

"مہک انصار۔" اس نے آہستہ سے [illegible]۔

"وہ بھی انہی میں سے کسی لڑکے کے ساتھ ریلیشن میں تھی۔" حرم کہنے لگی۔ "مجھے ٹھیک سے نہیں پتا، وہ کون تھا...... مگر وہ اسی رات لاپتا ہوئی تھی جس رات وہ ان کی ایک پارٹی میں گئی تھی۔"

سمسٹر کے آغاز میں وہ قصہ ہر جگہ عام تھا۔ کئی ہفتوں تک پولیس کی گاڑیاں کیمپس کے اندر اور باہر دکھائی دیتی رہیں۔ ہاسٹلز، کیفے ٹیریا، پارکنگ لاٹس ہر وہ جگہ جہاں نوجوان جمع ہوتے تھے، تفتیش کا حصہ بنی۔ اس بڑی پارٹی میں شریک ہر لڑکے، ہر لڑکی سے سوال کیے گئے۔ کوئی کچھ یاد نہیں رکھتا تھا۔ کوئی کچھ دیکھنے کو تیار نہیں تھا۔

گمشدہ مہک کی بس دو ہی چیزیں مل سکی تھیں...... اس کا پرس اور اس کا فون، جو کیمپس کے کنارے جھاڑیوں میں پھینکے گئے تھے۔ نہ خون کا کوئی نشان۔ نہ ہاتھاپائی کے آثار۔ نہ کوئی ایسا گواہ جس نے "غلط وقت پر غلط چیز" دیکھی ہو۔

آہستہ آہستہ، سب نے یہی مان لیا کہ وہ مرچکی ہے۔ کچھ قیاس آرائیاں یہ بھی تھیں کہ شاید کوئی پہاڑی چیتا اسے گھسیٹ کر پہاڑوں میں لے گیا ہو۔ یہ امکان کم تھا، مگر ناممکن نہیں۔

"سچ کہوں تو مجھے خوشی ہوئی تھی جب مناہل نے اپنے بریک اپ کی خبر سنائی۔" اس نے کھڑکی سے باہر اندھیرے میں پھیلی پہاڑی ڈھلانوں کو دیکھا۔ "میں نہیں چاہتی تھی اس کا انجام بھی مہک جیسا ہو۔"

"تم بھی کیا کیا سوچتی رہتی ہو۔" عینا کا منہ بنا۔ "مہک کی گمشدگی کا ان سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوا تھا اور ویسے بھی...... منال کہتی تھی عادل ان جیسا نہیں۔"

"اگر ان جیسا نہ ہوتا تو ان کے گروپ کا حصہ بھی نہ ہوتا۔" حرم کے لہجے میں طنز در آیا۔ "خیر چھوڑو...... اور بتاؤ کتنی دیر ہے وہاں پہنچنے میں؟"

اس نے پھر موبائل اسکرین روشن کی اور جھنجلا کر رہ گئی۔ سگنلز کا نشان ابھی نہیں تھا اور بیٹری پندرہ سے دس پر آگئی تھی۔

"کم از کم [illegible]" [illegible] نے کہا۔ "[illegible] اب ٹھیک ہو؟"

"اس [illegible] لگ رہی ہے...... [illegible] میں اپنی شال لے آئی۔" اس نے اپنے بازوؤں کو [illegible] پوچھنے لگی۔

"کیا تمہیں یقین ہے یہ سڑک ہمیں کہیں اور نہیں پہنچائے گی؟" وہ ایک بار پھر وہمی ہونے لگی۔ پہاڑوں میں اتنی دور تک آکر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے رات انہیں آہستہ آہستہ نگل رہی ہو۔

عینا نے شاید جواب دیا، مگر اس کے کانوں تک پہنچا ہی نہیں۔

جیسے ہی کچی سڑک ایک ابھری ہوئی ڈھلان پر پہنچی، گاڑی ایک تنگ، بے ترتیب راستے سے گزری جس کے ایک طرف پتھریلی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف چیڑ کے درختوں اور جھاڑیوں میں ڈوبا ہوا اندھیرا......

وہیں، ایک موڑ کے قریب، درختوں کے سائے میں ایک بھاری سا سایہ موجود تھا۔ حرم کا دل زور سے اچھلا۔ کیا یہ وہی گاڑی ہے؟

ابھی یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا ہی تھا کہ ان کے گزرنے کے ساتھ ہی پیچھے اچانک ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں۔ ریئر ویو مرر میں تیز روشنی چبھنے لگی...... اگلے ہی لمحے انجن کی کھردری آواز اور دھوئیں کے ایک بھاری بادل کے ساتھ، وہ ایک بار پھر ان کے پیچھے آگئی۔

"اوہ میرے خدا...... یہ وہی گاڑی ہے عینا...... یہ وہی گاڑی ہے۔" ہیجان اور گھبراہٹ سے وہ چلا اٹھی۔

عینا کے لب بھنچ گئے۔ "منحوس لوگ...... کم از کم اپنی تیز لائٹس تو بند کریں۔ بالکل اندھا کر رہی ہیں مجھے۔ میں کہیں سائڈ پر گاڑی روکنے کی جگہ ڈھونڈتی ہوں۔ یہاں سڑک بہت تنگ ہے۔"

اس نے ایکسیلیریٹر دبایا اور گاڑی کو آہستہ آہستہ دوبارہ رفتار میں لے آئی۔ پیچھے والی گاڑی نے بھی رفتار بڑھائی اور تیزی سے اپنی تیز لائٹس آن آف کرنا شروع کر دی جیسے مورس کوڈ میں کوئی پیغام بھیج رہی ہو۔ پھر اچانک وہ بائیں طرف ہوئی اور تنگ سیدھی سڑک پر ان کے برابر آکر لگ گئی۔ وہ اتنے قریب تھے کہ اگر حرم کھڑکی سے ہاتھ نکالتی تو ان کا سائڈ مرر چھو سکتی تھی۔

کھڑکی کھلی تھی، حرم نے اندر جھانکا۔ وہ دو افراد تھے، دونوں ہی گہرے رنگ کی ہُڈی چہروں تک کھینچے ہوئے تھے

اس لیے خدوخال بالکل غیر واضح تھے...... دونوں سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ حرم کو لگا کسی نے اسے برفیلے پانی میں غوطہ دے دیا ہو...... حالانکہ اس کے ہاتھ میں پکڑا اسیل فون پسینے سے پھسل رہا تھا۔ یہ بُرے لوگ ہیں...... یہ بُرے لوگ ہیں...... اس کے اندر کوئی چیخ اٹھا۔

''یہ ہیں کون؟'' عینا نے اگلے موڑ کی طرف بڑھتے ہوئے نظریں سڑک سے چپکائے رکھیں۔ ''کیا ہم انہیں جانتے ہیں؟''

''مجھے نہیں لگتا کہ ہم انہیں جانتے ہوں۔'' حرم کی آواز سرگوشی نما تھی، وہ سینے پر بندھی سیٹ بیلٹ کو مضبوطی سے تھام گئی۔

''کیا...... میں پولیس کو کال کروں؟'' اس نے لرزتی آواز میں پوچھا، دل ہی دل میں یہ امید کرتے ہوئے کہ عینا منع کرے گی، یہ تسلی دیتے ہوئے کہ ان آدمیوں کے ساتھ کھیلنے کی کوئی معقول اور بے ضرر وجہ ہوگی، کوئی سیریس بات نہیں......

اس نے ایک انگلی ایمرجنسی کال کے بٹن پر لا کر روک لی۔ اب بھی کوئی سگنل نہیں تھا۔

ہائی لکس کچھ لمحے اور ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی پھر وہ زور سے آگے لپکی، ان کی لین میں آئی اور اگلے موڑ پر چند انچ کے فاصلے سے غائب ہوگئی۔

''مجھے لگتا ہے ہمیں واپس مڑ جانا چاہیے۔ اس میں دو آدمی ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی میری طرف نہیں دیکھا، دونوں نے ہڈی پوری طرح سر پر چڑھا رکھی تھی۔'' حرم کو اب ان کے چلے جانے سے بھی کوئی تسلی بخش احساس نہیں ہو رہا تھا۔

عینا نے جواب نہیں دیا مگر موڑ کاٹتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

چند فٹ کے فاصلے پر سرخ لائٹس دہک رہی تھیں۔ کافی زور سے بریک لگاتے ہوئے عینا کے بال آگے کو اچھل گئے۔ حرم نے متوقع ٹکر کے خوف سے آنکھیں بھینچ لیں۔ کچھ دیر اس کے کانوں میں اپنی ڈھول کی طرح بجتی دھڑکن اور عینا کی تیز ہانپتی سانسوں کی آواز ہی سنائی دیتی رہی۔

پھر اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر حالات کا جائزہ لیا۔ شیشہ نہیں ٹوٹا تھا۔ مڑی ہوئی دھات کے چیخنے کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ وہ عین وقت پر رک گئے تھے۔

ان کی گاڑی کا اگلا بمپر ہائی لکس کے پچھلے بمپر کے اتنے قریب تھا کہ حرم دونوں گاڑیوں کے بیچ سے گزر بھی نہیں سکتی تھی۔ ہائی لکس کی پچھلی لائٹس کی سرخی اور ان کی ہیڈ لائٹس کی روشنی مل کر گاڑی کے اگلے حصے کو ایک خوفناک سا منظر بنا رہی تھیں۔

مدھم روشنی میں حرم نے دیکھا کہ عینا نے اسٹیئرنگ وہیل کو اپنی سخت گرفت سے اب تک نہیں چھوڑا تھا۔

''کمینے......'' اس کے لبوں سے غصے سے کانپتی سرگوشی پھسلی۔ اس نے دروازے کا ہینڈل پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، حرم نے فوراً اس کی آستین تھام لی۔

''نہیں، گاڑی سے مت اترنا۔ ہمیں نہیں معلوم، ان کے ارادے کیا ہیں، گاڑی میں ہی رہو۔''

ایک لمحے کو لگا جیسے وہ بحث کرے گی۔ اس نے منہ کھولا، پھر بند کر لیا۔

''بس واپس چلتے ہیں، ٹھیک ہے؟ پارٹی کو بھول جاؤ۔'' اس نے منت کی۔ ''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس بار عینا نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ واپس گھر کی طرف جانے میں انہیں ڈیڑھ گھنٹا مزید لگتا۔

مگر یہ راحت چند لمحوں کی ہی ثابت ہوئی، سڑک اتنی تنگ تھی کہ گاڑی موڑنے کے لیے کم از کم تین مرحلوں میں موڑ لینا پڑتا، ورنہ بھاری بھرکم گاڑی سڑک کے کنارے سے پھسل کر نیچے جا سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے، پہاڑی کی طرف جتنا ہو سکے پیچھے لے جاؤ، پھر آہستہ سے آگے بڑھنا۔'' حرم نے لرزتی آواز میں سرگوشی کی، سڑک کے دوسری طرف کی ڈھلان کا تصور کرتے ہوئے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس ویرانے میں کہیں بھی حفاظتی ریلنگ نہیں تھی۔

''جب گاڑی نیچے کی طرف جانا شروع کرے گی تو رفتار تیز ہو جائے گی مگر......'' حرم بولتے بولتے رک گئی، کیونکہ ہائی لکس آہستہ آہستہ ترچھی ہو کے آگے بڑھی، یہاں تک کہ گاڑی کا اگلا آدھا حصہ بائیں لین میں گھس گیا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں؟'' عینا کی خوفزدہ نظریں حرم کی جانب مڑیں جو خود ساکت بیٹھی سامنے گھور رہی تھی۔

اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی، یہاں سے نکل جاؤ۔ اب انہوں نے دونوں سمتیں بند کر دی تھیں۔

''تمہارے پاس ابھی بھی موبائل ہے؟''

''سگنل نہیں مل رہا۔'' اعصابی کشیدگی حرم کی آواز بلند کر گئی۔

''شاید ایمرجنسی کال لگ جائے۔''

اس نے فون کھولا اور اس کا دل مزید ڈوب گیا، فون کی بیٹری اب صرف پانچ فیصد رہ گئی تھی۔ ''یہ بند ہونے والا

ہے۔ اپنا فون دو۔‘‘ اپنا فون اس نے دوبارہ زپ والے پاؤچ میں ٹھونس دیا۔

عینا نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل سے ہٹایا مگر اس کی نظریں سڑک پر ہی جمی رہیں۔ ’’میرا بیگ تمہارے پیچھے ہے۔ جلدی کرو، میرا فون نکالو۔‘‘

حرم نے مڑکر پچھلی سیٹ پر بکھرے سامان میں ہاتھ مارا۔ فاسٹ فوڈ کے ریپر، جوتوں کا ایک جوڑا، آخرکار اس کے ہاتھ عینا کے چمڑے کے بیگ پر جا ٹھہرے۔

بیگ میں ہاتھ مارتے ہوئے حرم کے کپکپاتے ہاتھوں کو جونہی عینا کا سیل فون محسوس ہوا، اس پر گرفت جماتے ہوئے وہ سیدھی ہو بیٹھی...... اور تب ہی اس نے دیکھا، ہائی لکس کے پیچھے سے کوئی نمودار ہوا......

’’اوہ میرے خدایا!‘‘ اس نے عینا کا سیل اس کے سامنے کیا...... ’’ان لاک کرو......‘‘ عینا پر اس سے زیادہ لرزہ طاری تھا، تیسری کوشش میں فون ان لاک کرتے ہوئے وہ اس پر چلانے لگی۔

’’جلدی حرم...... جلدی......‘‘

اور ایکسلیریٹر کو فرش تک دبا دیا۔ گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھی، پھر خطرناک حد تک کنارے کے قریب آکر رک گئی۔

حرم نے خود کو سنبھالا اور فون مضبوطی سے تھامے رکھا۔

اس شخص کے چہرے میں کچھ عجیب سا تھا۔ وہ درست شکل میں نہیں لگ رہا تھا۔ حرم کو پیسنجر سائڈ کی کھلی کھڑکی اچانک ایک بڑا خطرہ محسوس ہونے لگی۔

’’چلو، عینا!‘‘ وہ چیخی، نظریں اس بڑھتے ہوئے سائے پر تھیں۔ اس کے دماغ کا ایک حصہ چیخ رہا تھا کہ وہ اسی طرح مریں گے۔ اور ایک حصہ اب بھی اصرار کر رہا تھا کہ یہ سب کوئی غلط فہمی ہے، یا کوئی گھٹیا مذاق، جس پر وہ بعد میں ہنسیں گے۔

’’سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ عینا نے دانت بھینچ کر کہتے ہوئے گاڑی کو جھٹکے سے ریورس میں ڈالا۔

سیل فون کان سے لگائے حرم کا رُواں رُواں دعا گو تھا کہ کال مل جائے، فون نے ہلکی سی بیپ دی۔ اس نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ کوئی سگنل نہیں۔

گاڑی پیچھے کی طرف جھکی پھر بالکل رک گئی۔

’’گاڑی بند ہو گئی...... مم...... میں......‘‘ عینا نے بے یقینی سے ہانپتے ہوئے کہا، انجن کی بھاری گرج غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ تیزی سے بڑھتے قدموں کی دھمک نے لے لی تھی۔

حرم نے دیکھا۔ ہائی لکس کا ڈرائیور پہلے ہی ان کے اور اپنے درمیان کا آدھا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ پیسنجر سائڈ کا دروازہ بھی کھل چکا تھا۔ وہ دونوں اب ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ان کی گاڑی کی ہیڈلائٹس کی سفید روشنی میں دونوں لڑکیوں کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے مگر اسے اس کی حاجت بھی نہیں تھی۔ وہ بن دیکھے ہی ان کے اندر اترتی دہشت محسوس کر سکتا تھا، اور یہی احساس اس کی رگوں میں پارا بھر دیتا تھا۔ بس عادل کسی بی گریڈ ہولی وڈ مووی کے ولن کی طرح ماسک پہننے کی ضد نہ کرتا تو بات ہی کچھ اور ہوتی...... ان کے اصل چہرے دیکھ کر ان کے تاثرات میں جو بے یقینی، خوف و دہشت آتی، وہ تماشا کہیں زیادہ لذت بخش ہوتا...... وہ سائیکو پیتھ نہیں تھا۔ سائیکو پیتھ تو خالی ہوتے ہیں، بے رنگ، بے ذائقہ۔ وہ تو جذبات سے لبریز تھا بالوں کی جڑوں سے لے کر ناخنوں کی نوکوں تک...... بس المیہ یہ تھا کہ اس کے اندر جو کچھ بھرا تھا، وہ سب غلط سمت میں بہہ رہا تھا۔ اور اسے اس کا پورا شعور تھا۔

اس نے قدم آگے بڑھائے...... ہر قدم جما جما کر، زمین میں گاڑتے ہوئے۔ دھپ...... دھپ...... کنکر اس کے ائیر جورڈنز کے نیچے کراہ رہے تھے۔

اس کا رخ پیسنجر سائڈ کی طرف تھا...... رفتار میں اعتماد ضرور تھا مگر تیزی بالکل نہیں...... کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے گردن ذرا سی جھکائی۔ کھڑکی کے پار حرم کی خوفزدہ آنکھیں اس پر جم گئی تھیں۔

وہ آنکھیں...... جن میں کبھی غرور بسا رہتا، لاتعلقی کی ٹھنڈک، خود اعتمادی کی چمک مگر ابھی ان میں خالص دہشت تھی۔

اس کے ہونٹ ماسک کے پیچھے بے اختیار پھیل گئے۔ ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کی انگلیاں دروازے کے ہینڈل پر جمی رہیں، ایک لمحے کے توقف کے بعد پھر اچانک اس نے پیسنجر ڈور زور سے جھنجوڑا۔

دھچکا لگتے ہی گاڑی کے اندر خوف جیسے پھٹ کر بکھر گیا۔ ڈرائیور سیٹ سے چیخ نکلی۔ چابی گھومنے کی کھڑکھڑاہٹ۔ انجن کھانسا۔

زاویار نے فوراً سر گھما کر پچھلے ٹائروں کی طرف دیکھا۔ وہ ریورس لے رہے تھے، گاڑی پیچھے کو جھٹکا کھا گئی۔

ایک لمحے کو اس کا دل اُچھلا...... نہیں...... نہیں۔ ابھی نہیں۔ اس نے ایک بار پھر دروازے پر زور آزمائی کی مگر وہ ہلا تک نہیں۔ اس کی کنپٹی کی رگ پھڑک گئی۔

''لعنت......'' بے اختیار غراتے ہوئے اس نے دوبارہ زور لگایا اور پھرنا کام ہونے پر ایک زور کی لات اس خراب دروازے کو رسید کی، دھات کراہی مگر دروازہ نہ مانا۔ پھر اچانک جیسے اسے ہوش آیا اور اس نے ہاتھ کھڑکی سے اندر ڈال دیا۔

''جب شیشہ نیچے ہے تو میں کیوں اس بیکار دروازے پر وقت ضائع کر رہا ہوں۔'' اس نے خود کو بھی گالی دی۔

اس کی انگلیاں پہلے کسی موٹے کپڑے میں الجھیں...... پھر نرم، گرم گردن کی دھڑکتی ہوئی جلد سے ٹکرائیں۔ حرم کا جسم ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔

زاویار کی سانس ایک لمحے کو رکی پھر تیز ہوگئی۔ گرفت لاشعوری نہیں رہی تھی، وہ جانتا تھا کہ کیا کر رہا ہے۔ اس کے پُرحدت لمس نے اس کے اندر کسی سوئی ہوئی چیز کو جگا دیا تھا...... خطرناک، بے قابو۔

گاڑی پیچھے سرک رہی تھی، چیخیں فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں، مگر اس کے لیے سب کچھ سمٹ کر صرف ایک نقطے میں آ گیا تھا...... اس کی انگلیوں کے نیچے دھڑکتا خوف۔

اس نے دوسرا ہاتھ بھی اندر کیا اور اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ زور سے...... جڑوں تک۔

حرم کی گردن ایک جھٹکے سے پیچھے کو مڑی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ مگر اس کی چیخیں اس کے لیے صرف شور نہیں، بیک گراؤنڈ میوزک تھا۔

وہ اسے کھڑکی کے راستے باہر گھسیٹ لینا چاہتا تھا، اس کا آدھا جسم پہلے ہی سیٹ سے اُکھڑ چکا تھا مگر سیٹ بیلٹ ایک ضدی پٹا بن کر اس کے اور اس کے شکار کے درمیان تن گئی۔ زاویار کے جبڑے کی لکیر سخت ہوگئی۔ اس نے بے رحمی سے اسے اور زور سے کھینچا۔ حرم کی کمر سیٹ کے کنارے سے ٹکرائی۔

سانس اس کے حلق میں اٹک گئی۔ زاویار کا ہاتھ اب بکل ڈھونڈ رہا تھا، اس کی انگلیاں جان بوجھ کر بھٹکیں...... اس کے جسم پر پھسلتی ہوئیں۔ جان بوجھ کر سست۔ جان بوجھ کر غلط جگہ...... حرم کے گرم جسم کی کپکپاہٹ اس کی ہتھیلی میں اترتی چلی گئی۔

وہ مزاحمت کر رہی تھی بے ترتیب، ہسٹیریکل مگر بھرپور انداز میں...... بس چند انچ اور...... تھی......

اس کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ جب گاڑی جھٹکے سے آگے کو اُچھلی۔

حرم اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی، خود کو گاڑی سے بچانے کے لیے وہ بے اختیار ایک طرف اُچھلا اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا۔

وہ جس طرح گاڑی کو آگے پیچھے کر رہی تھیں لگ رہا تھا واپس مڑنا چاہتی ہیں...... یہ خیال آتے ہی وہ اور پاگل ہوا...... مٹھی کھول کر حرم کے بالوں کو کھینچا...... نہیں بھاگ کر، اتنی آسانی تو سے نہیں۔

اس وقت عادل نے ایک عجیب حرکت کی...... اس نے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور ان کی ونڈ اسکرین پر دے مارا...... ایک چھناکے کی آواز آئی تھی اور ان کی ونڈ اسکرین دراڑوں سے بھر گئی......

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ عادل کی اس بچکانی حرکت پر خوب ہنستا مگر اس وقت اسے شاباشی دینے کا دل کیا تھا، اس نے ان کی ونڈ اسکرین پوری طرح برباد کر دی تھی...... وہ پھر بھی گاڑی موڑنے میں کامیاب ہوگئی......

زاویار نے ایک پل کو دوبارہ ان تک جانے کا سوچا مگر پھر وہ مڑا اور پوری طاقت سے ہائی لکس کی طرف دوڑ پڑا۔

عادل ایک پل کی تاخیر کے بغیر اس کے پیچھے لپکا تھا۔

''میں نہیں آنا چاہتی تھی...... میں نہیں آنا چاہتی تھی۔''

وہ گاڑی موڑنے میں کامیاب تو ہوگئی تھی..مگر دہشت کا لمحہ جیسے اب بھی ان کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا، وہ لمس، وہ سرسراتی انگلیاں حرم کو اب بھی اپنے بدن پر رینگتی محسوس ہو رہی تھیں...... رُواں رُواں لرزتا ہوا۔ کپکپاتے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''آئم سوری...... آئم سوری...... پلیز مجھے معاف کردو۔''

عینا کا گلا رُندھ گیا تھا۔ آنسو اس کے چہرے پر بہتے جا رہے تھے، الفاظ بکھرتے جا رہے تھے۔

''یہ میری غلطی ہے...... صرف میری...... میں ہی تمہیں یہاں لائی...... میں ہی ضد کرتی رہی۔'' اس نے کپکپاتے ہاتھ سے آنسو پونچھے۔

''لیکن...... میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گی...... میں وعدہ کرتی ہوں۔'' اس کی انگلیاں اسٹیئرنگ وہیل پر سفید پڑ چکی تھیں۔ ونڈ اسکرین پر پڑی دراڑیں اور آنسوؤں کی دُھندلاہٹ مل کر منظر کو مزید بگاڑ رہی تھیں۔ سڑک، موڑ، پہاڑ...... سب جیسے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ اسے آگے کچھ صاف دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

''وہ ہمارے پیچھے آئیں گے۔'' حرم کی آواز سسکیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ''وہ اتنی آسانی سے ہار...... چھا

اور پھر ایسا ہی ہوا'' ...... یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی وہ ذرہ بھر بھی متوقع رہی ہو، پھر بھی ٹھٹک گئی۔

''یہ مجھے لگا ہے عینا ...... ہم انہیں جانتے ہیں۔'' کئی لمحوں بعد حرم بولی تو لہجہ نم تھا مگر آواز ہموار ہو گئی تھی۔

''کیا ......؟'' عینا اتنا چونکی کہ گردن پوری موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''آگے دیکھو ......'' وہ گھبرا گئی۔

''کیا دیکھوں، ویسے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔'' عینا نے بے بسی سے ہاتھ اٹھایا۔ ''تم بتاؤ ...... تمہیں کیوں لگا، ہم انہیں جانتے ہیں؟''

''کیونکہ ...... اگر وہ بس رینڈم لوگ ہوتے، اکیلی عورتوں کے شکاری ......'' اس کی نظریں لرزتی ہوئی ونڈ اسکرین پر ٹک گئیں۔ ''تو انہیں ماسک لگانے کی ضرورت نہ پڑتی ...... سوچو عینا ...... انہوں نے ماسک کیوں لگائے ہوئے ہیں۔''

عینا کا دل جانے کیوں ڈوب کے اُبھرا ...... یہ خیال کہ کچھ اجنبی، نشے میں وحشت درندے ان کا پیچھا کر رہے ہوں، خوفناک ضرور تھا۔ مگر یہ خیال ...... بھیانک ترین تھا کہ کوئی باقاعدہ گھات لگا کر ان کا پیچھا کر رہا تھا ...... ایسا خطرناک دشمن ان کی زندگیوں میں کہاں سے آیا ......؟

''انہوں نے اپنی آواز بھی نہیں سنوائی ہے نا؟'' عینا کو اچانک خیال آیا ...... اس کی نگاہیں سڑک پر جمی تھیں مگر ذہن پیچھے کے مناظر میں الجھ چکا تھا۔ ''انہوں نے کوئی بات نہیں کی ......''

''ریڈ ماسک والا کچھ چلّایا تھا جب گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔'' حرم کی آواز دھیمی اور غیر یقینی تھی۔

''تم نے پہچانی؟'' عینا نے بیتابی سے پوچھا۔

حرم نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔ ''میں آوازیں پہچاننے کے معاملے میں اچھی نہیں۔''

''تمہیں پولیس کو کال کرنی ہو گی یا ...... کم از کم اپنے گھر والوں کو ......'' عینا نے تجویز دی۔

جواب دیتے ہوئے حرم اپنی سیٹ بیلٹ ٹھیک کرتے ہوئے فرش پر ہاتھ مارنے لگی۔ ''مجھ سے تمہارا فون نیچے گر گیا تھا۔''

''تم ٹھیک ہو؟'' عینا نے پوچھا، اس کی آواز کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا میں تقریباً گم ہو گئی تھی۔ ''جب اس نے تمہارا فون ...... تو اٹھا نہیں سکے ہو؟'' وہ رو دی۔

حرم نے اچانک اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا، اسے رونا نہیں تھا، اسے وہ فون ڈھونڈنا تھا۔ ''ہاں میں ٹھیک ہوں ...... اور تم؟''

''میں ٹھیک ہوں، مگر ونڈ اسکرین کے پار مشکل دیکھ پا رہی ہوں۔'' اس نے سیٹ بیلٹ کھولا، ایک پیر کے نیچے دبایا اور ڈرائیور سیٹ میں آگے جھکی تاکہ اس کا چہرہ ونڈ اسکرین کے قریب، شیشے کے جال میں ایک چھوٹے صاف حصے کے پاس ہو جائے۔

فلور پر ہاتھ ٹٹولتے ہوئے اسے ابھی فون ملا بھی نہیں تھا جب عینا کی کراہ پر اسے سیدھا ہونا پڑا۔

''اوہ خدایا نہیں ......''

حرم فوراً پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ موڑ سے پہلے ہی ہیڈ لائٹس کی ایک مانوس جھلک اس کی آنکھوں میں چبھ گئی۔

''شاید وہ لوگ نہیں ہوں ...... شاید ......''

عینا کو جملہ مکمل کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ یہ وہی لوگ تھے۔ چند ہی لمحوں میں، ہائی لکس کی ہیڈ لائٹس ریئر ویو مرز میں پھیل گئیں۔

''جلدی کرو، فون ڈھونڈو۔'' عینا نے التجا کی۔ ''میں جتنا تیز جا سکتی ہوں جا رہی ہوں مگر میں نہیں چاہتی کہ کسی موڑ کو اوور شاٹ کر دوں۔ ہمیں بس پکی سڑک تک پہنچنا ہے۔ پھر صرف چند میل باقی ہیں جب تک ہمیں سگنل نہ ملے، ٹھیک ہے؟''

جیسے ہی وہ ڈھلوان سے نیچے سیدھی سڑک پر آئے، گاڑی نے رفتار پکڑی۔ اس نے اگلے موڑ پر بریک لگائے بغیر گاڑی موڑی، جس سے جھکی ہوئی حرم کا کندھا گیئر شفٹ سے زور سے ٹکرا گیا۔ پیروں کے پاس پڑے ...... فون پر ہاتھ پڑتے ہی سانس ذرا بحال ہوئی۔

''مل گیا۔'' کانپتے ہاتھوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے دھیان مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ پیچھے ہیڈ لائٹس مزید قریب آ چکی تھیں۔

عینا نے دوبارہ ایکسلیریٹر دبایا۔ ''ری ڈائل کرتی رہو۔'' اس نے کہا۔

اس بار اسے پیٹرن معلوم تھا، اس نے بنا وقت ضائع کیے ایمرجنسی نمبر ڈائل کیا۔ وہ دل ہی دل میں جملے ترتیب دے رہی تھی کہ جب کال ریسیو ہو گی تو وہ کیا کہے گی کہ وہ بدترین صورتِ حال سے دوچار ہیں، ان کی فوری مدد کو پہنچے۔

مگر ہر بار کی طرح، اس بار بھی کال ناکام ہو گئی۔ وہ بار بار کوشش کرتی رہی مگر آج کوئی دعا رنگ نہیں لا رہی تھی۔

سیٹ بیلٹ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑتے ہوئے اس نے فون تھک کر اپنی گود میں رکھ دیا، عین اسی وقت عینا نے ایک اور موڑ کاٹا۔

حرم کا سر درد سے پھٹ رہا تھا..... معدہ پھر سے الٹنے کو ہوا۔ بے اختیار اپنے سر کے پچھلے حصے کو چھوتے ہی انگلیوں پر چپچپا سا احساس پھیل گیا۔ وہ چونکی۔ ہاتھ سامنے کیا تو انگلیاں خون میں بھیگ چکی تھیں۔ ایک لمحے کو وہ انہیں گھورتی رہی..... پھر بے ساختہ سویٹر پر رگڑ کر صاف کر دیا۔

گاڑی اچانک زور سے کانپ اٹھی۔ کیا کچھ ٹوٹ رہا تھا؟ بمپر؟ کار کے نیچے کا حصہ؟ یا..... انجن؟

وہ اسپیڈومیٹر نہیں دیکھ پا رہی تھی مگر ایک بات اسے پورے یقین سے معلوم تھی کہ یہ گاڑی اس سے پہلے عینا نے کبھی اتنی رفتار سے نہیں چلائی ہوگی۔

اچانک اسے ایسا جھٹکا لگا کہ اگر سیٹ بیلٹ نہ ہوتی تو حرم کا سر سیدھا ڈیش بورڈ سے ٹکرا جاتا۔ وہ چیخ بھی نہ سکی۔

عینا بھی اس جھٹکے سے ڈرائیو سیٹ سے آگے کو اچھل گئی۔ یہ محض جھٹکا نہیں تھا۔ انہوں نے پیچھے سے انہیں ٹکر ماری تھی۔

ابھی وہ پہلی ٹکر کے صدمے سے سنبھالی بھی نہ تھیں کہ دوسری ٹکر پڑی..... اس بار زیادہ زور سے۔ گاڑی بے قابو ہو کر سڑک پر لڑکھڑائی۔

''اب ہم کیا کریں؟'' عینا گلا پھاڑ کر اس سے یوں پوچھ رہی تھی جیسے اسے جواب معلوم ہو۔

ریئر ویو مرر میں اس نے دیکھا، ہائی لکس تھوڑا پیچھے ہٹی..... جیسے شکار پر جھپٹنے والا درندہ ہو، رفتار بڑھا کر دوبارہ ان کی طرف لپکا۔

''اپنی سیٹ بیلٹ باندھو!'' انجن اور ہوا کے تیز شور میں اسے تقریباً چیخنا پڑا۔ اس کا ذہن اس لمحے ہر ممکنہ بدترین منظرنامہ تراش رہا تھا۔ اگر وہ ان کے ہاتھ لگ گئیں..... اگر ان وحشیانہ ٹکروں سے وہ کسی طرح زندہ بچ بھی گئیں..... تو وہ ان کا کیا حال کریں گے؟

یہ خیال ہی اس کی رگوں میں خون جما دینے کو کافی تھا۔

بس چند میل..... صرف چند میل اور..... اور پھر شاید وہ اس ڈراؤنے خواب سے نکل سکیں جو چاروں طرف سے انہیں گھیرے ہوئے تھا۔

کھڑکی کے فریم کو مضبوطی سے پکڑے، فرش پر سختی سے پیر جما کر، اس نے وحشت زدہ نظروں سے عینا کی جانب دیکھا۔

وہ ابھی تک سیٹ بیلٹ نہیں باندھ پائی تھی۔ عینا ... پاس وقت تھا..... اور شاید ہوش سنبھالنے ... میں خوف کی ایک نئی لہر دوڑا گئی۔

ایک اور موڑ کاٹنے کے لیے عینا نے رفتار کم کی، گاڑی خطرناک حد تک کھائی کے کنارے کے قریب پہنچ گئی۔ دوسری گاڑی بھی اچانک دائیں طرف مڑی اور ان کے ساتھ ساتھ آ گئی۔

حرم نے کھڑکی کے فریم سے ہاتھ ہٹا کر ایک بار پھر گود میں رکھا فون اٹھایا..... اور ری ڈائل کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے گلوو باکس کھولا، پھر آرم ریسٹ کے نیچے موجود خانے میں ہاتھ ڈال کر کسی بھی نوکیلی چیز کی تلاش شروع کر دی۔ کوئی بھی ایسی چیز جسے وہ اپنے دفاع میں استعمال کر سکتی ہو۔

''کیا کر رہی ہو؟'' عینا نے اس کی سرگرمی دیکھ کر پوچھا۔ اس کی نگاہ کبھی ونڈ اسکرین پر جاتی کبھی ریئر ویو مرر پر۔

''کوئی نوکیلی چیز ڈھونڈ رہی ہوں۔'' اس نے لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

''میرا بیگ دیکھو..... شاید اس میں کچھ مل جائے۔''

عینا اس کا مقصد سمجھ گئی تھی۔

اس نے وقت ضائع کیے بغیر دونوں سیٹوں کے بیچ رکھا اس کا بیگ اٹھایا اور اپنی گود میں الٹ دیا۔ میک اپ کے سامان سے بھرے اس کے بیگ میں ایک چیز تو کام کی مل ہی گئی تھی..... اس کے میٹل کا ڈبل سائیڈڈ شارپ نیل فائلر..... حرم نے اسے اٹھا کر اپنے اونی سویٹر کی آستین کی مہنائی میں اٹکا دیا.....

کال کنیکٹ نہیں ہوئی تھی، حرم نے بیٹری بچانے کے لیے فون پھر سے لاک کر کے مٹھی میں بھینچ لیا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بے آواز بہہ رہے تھے۔ اس وقت صحیح سلامت گھر پہنچنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن گئی تھی۔

دوبارہ اسٹیئرنگ پر گرفت سخت کر لی تھی۔ اس کی گاڑی مستقل دوسری گاڑی کے ساتھ تھی۔

''تو اس کے ساتھ کرے گا کیا؟'' ٹانگ سامنے کو پھیلاتے ہوئے عادل نے یہ سوال کیا تو اس نے ایک گھورتی نگاہ اس پر ڈالی۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے والا سوال ہے؟ اب کیا میں تجھے اپنے.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا پھر ہنسا۔ ''تو کیا مجھ سے سیکھنا چاہتا ہے؟''

"بکواس مت کر......" عادل تاؤ کھا گیا۔ "میں تیرا پلان پوچھ رہا ہوں۔ اگر انہوں نے پولیس کو کال کی یا کسی گاڑی سے مدد مانگ لی...... کچھ سوچا ہے، کیا کرے گا؟"

اسی وقت اچانک عینا نے رفتار بڑھائی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ٹیڑھی سی مسکراہٹ آئی۔

"اوہ نہیں، ڈارلنگ...... ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے......" اس نے بھی ایکسلیریٹر فرش تک دبا دیا۔

ہائی لکس دہاڑتی ہوئی آگے بڑھی، ان کی گاڑی کے برابر آ گئی۔ وہ انہیں اوورٹیک نہیں کر رہا تھا۔ جان بوجھ کر۔ وہ چاہتا تھا وہ جانیں کہ وہ ساتھ ساتھ ہے کہ وہ ابھی بھی وہیں ہے۔

"اپنا موبائل نکال...... اپنے باپ کو کال ملا۔" وہ عادل سے مخاطب ہوا۔

"کیا...... کیوں؟" وہ اس انوکھی فرمائش پر حیران رہ گیا۔

"پاپاز بوائے ڈر رہا ہے۔ ان سے بات کر کے تھوڑی ہمت لے لے...... اگر سگنل ملے تو......" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

اس بات پر چونک کر عادل نے واقعی اپنا موبائل نکالا...... اور دیکھ کر ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا...... ایک بھی سگنل نہیں تھا۔

اس حصے میں سڑک تنگ ہونے لگی تھی، ایک طرف پہاڑ تھا دوسری طرف اندھیرا...... اس کی آنکھوں میں ایک سفاک سی چمک آئی۔ بس یہی لمحہ تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ بائیں موڑا......

دھات کے کھرچنے کی آواز اس کے رگ و پے میں بجلی کی طرح دوڑ گئی۔

عادل چلّا اٹھا۔ "کیا کر رہا ہے؟"

زاویار کے سینے سے ایک مدّھم سی ہنسی نکلی۔

ان کی گاڑی ایک طرف کو لڑکھڑائی، پھر اچانک واپس لین میں جھپٹی...... عینا نے آخری لمحے میں اسٹیئرنگ گھما کر اسے سنبھالا تھا۔ ہیڈلائٹس بے قابو زاویے سے اِدھر اُدھر اچھلیں۔

اس نے دوبارہ اسٹیئرنگ موڑا...... اس بار ذرا زیادہ ٹھک۔

ان کی گاڑی پھر جھکی، اس بار زیادہ دیر تک۔ پچھلا حصہ کنارے کی طرف سرکا، ٹائروں کے نیچے بجری کے اُڑنے کی ہلکی سی لکیر اندھیرے میں چمکی۔ پھر ایک جھٹکے سے وہ واپس لین میں گھسی۔

زاویار کی آنکھوں میں اس لمحے وحشت نہیں مکمل یکسوئی تھی۔

"کیا تو انہیں مارنا چاہتا ہے؟" عادل کے پیٹ میں اینٹھن سی اٹھی۔

"نہیں مریں گی وہ...... اس طرف ڈھلان ہے، کوئی گہری کھائی نہیں...... زخمی ہوں گی زیادہ سے زیادہ......" وہ انہیں کنارے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ۔ صبر کے ساتھ۔

"یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے، گاڑی الٹ بھی سکتی ہے......"

"ہاں تو تجھے کیا مسئلہ ہے...... تو بھی تو منال کے ساتھ یہی کرنا چاہ رہا تھا نا......" ایک لمحے کو اس پر نظر ڈال کر اس نے اسے باور کرایا اور پھر دوبارہ ان کی گاڑی پر ایک اور وار کیا...... اس بار زیادہ شدت سے...... شاید یہ عادل پر آئے غصے کا نتیجہ تھا......

ان کی گاڑی تقریباً آڑی ہو گئی۔ ہیڈلائٹس نے ایک لمحے کو پہاڑ کی دیوار کو کاٹا، پھر سڑک...... پھر اندھیرے کو۔ گاڑی کنارے کی طرف جھکی۔

زاویار کے جبڑے بھنچ گئے۔ "بس...... بس ذرا سا اور"

"ہاں...... کیونکہ اس کی وجہ سے میں جیل جا سکتا ہوں اور تو بھی بلکہ باقی سب بھی......" عادل جواب میں چلّایا۔

"ان سے دور رہ...... خاص کر حرم سے...... تو جانتا ہے وہ کون ہے...... اس کے گھر والے خاموش نہیں بیٹھیں گے۔"

زاویار نے جواب نہیں دیا، وہ سامنے جمی ہیڈلائٹس میں ان کی بے قابو ہوتی گاڑی کو دیکھ رہا تھا...... ان کی جان توڑ کوشش تھی کہ گاڑی کو سیدھا رکھیں، ہر بار چند انچ میں توازن واپس پاتا، اور ہر بار اگلی ٹھوکر میں پھر ہارتا ہوا۔

اس نے آخری بار اسٹیئرنگ موڑا۔ یہ وار نہیں تھا۔ یہ دھکا تھا فیصلہ کن۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔ ہیڈلائٹس کنارے سے ہٹیں۔ اور پھر اس نے دیکھا، ان کی گاڑی سڑک سے اتر چکی تھی۔

زاویار نے ایکسلیریٹر سے پاؤں ہٹایا۔ ایکسائٹمنٹ اتنی تھی کہ دل اس کے سینے میں پھڑپھڑانے لگا تھا۔ اس نے ماسک کے پیچھے سے ساکت بیٹھے عادل کو دیکھا۔

"کہا تھا نا...... مزہ نہ آیا تو پیسے واپس۔"

چند لمحوں کی خاموشی رہی۔ پھر عادل نے ہاتھ اٹھایا اور اسے فحش اشارہ کیا۔

جواب میں اس کا بھرپور قہقہہ گونج اٹھا تھا۔

گاڑی ڈھلوان کی طرف پھسل رہی تھی۔

حرم خود کو اس کے لیے تیار کر چکی تھی کہ گاڑی الٹتی ہوئی آگے لڑھک جائے گی، بالکل کسی فلمی منظر کی طرح۔ مگر

اس کے بجائے وہ چند فٹ پھسلی، پھر رک گئی اور ٹائرز ڈھلوان کے اوپری حصے کی نرم مٹی میں دھنس گئے۔

گاڑی سے دھات کے کراہنے کی سی آواز نکلی۔

عینا نے سیٹ بیلٹ کے لیے ہاتھ بڑھایا، اور ٹائر چند انچ اور سرک گئے۔ عینا نے سانس تک روک لی۔ ''کیا یہ میری وجہ سے ہو رہا ہے؟'' وہ خوفزدہ نظر سے اسے تک رہی تھی۔

ان کے پیچھے ہیڈ لائٹس مدھم ہو رہی تھیں...... ان کی گاڑی دور جا رہی تھی۔

اب ہر طرف اندھیرا تھا، سوائے ان کی گاڑی کی مدھم روشنی کے، جو اگلے گرل سے چپکی ہوئی نرم جھاڑیوں میں الجھ کر دھندلا رہی تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بے ترتیبی سے جھپکنے لگیں۔

انجن نے ایک گھٹی ہوئی کراہ نکالی، اور گاڑی جھٹکے سے ہلی۔

عینا اور حرم دونوں زور سے آگے کی طرف اچھلیں اور گاڑی چند فٹ اور سرک گئی۔

''عینا...... ہمیں باہر نکلنا ہوگا۔'' حرم کی آواز سرگوشی سے بھی مدھم تھی۔ وہ جانتی تھی...... اگر وہ ابھی گاڑی سے نہیں نکلیں تو حالات اس سے کہیں بدتر ہونے والے تھے۔

ابھی اس نے اپنی سیٹ بیلٹ کا بٹن دبایا بھی نہیں تھا کہ گاڑی ایک بار پھر ڈھلوان کی طرف لڑھکنے لگی۔

''نہیں!'' عینا چیخی۔ ''نہیں، میری سیٹ بیلٹ۔''

اگلے ہی لمحے وہ ایک بڑے پتھر سے زوردار دھماکے کے ساتھ ٹکرائی۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ دونوں کے سر ڈیش بورڈ پر جا لگے۔

گاڑی بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح اچھلنے اور کانپنے لگی، ڈھلوان سے نیچے بھاگتی ہوئی رفتار پکڑتی گئی۔ ہر بار کسی چٹان، کسی ابھری ہوئی جڑ یا کسی پتھر سے ٹکراتے ہی لوہے کے رگڑتے مڑنے اور ٹکرانے کی ہولناک آوازیں فضا میں گونجنے لگتیں۔

حرم کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سانس بھی نہیں لے پا رہی تھی۔ اب عینا کی چیخیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں...... بس کھلی کھڑکی سے اندر گھستی ہوا کی آواز تھی اور خود گاڑی کے ٹکرانے، چرچرانے اور چیخنے کی آوازیں، جو ڈھلوان پر اترتے ہوئے تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر وار گاڑی کے نچلے حصے پر پڑ رہا تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ حرم سیٹ بیلٹ میں جکڑ کر آگے کو آتی اور پھر پوری قوت سے سیٹ کی پشت سے جا لگتی۔ حرم نے ڈیش بورڈ کا کنارہ پکڑ کر سانس کا ایک گھونٹ لینے کی کوشش کی مگر منہ میں بس تازہ گرد بھر گئی۔

وہ آکسیجن کے لیے تڑپ رہی تھی...... نظر کے سامنے سفید دھبے ناچنے لگے، گاڑی کے باہر سے جھاڑ جھنکار اور مٹی کھلی کھڑکی سے اندر یوں گھس رہے تھے جیسے چھروں کی بوچھاڑ ہو......

گاڑی اب بھی پھسلتی جا رہی تھی۔ راستے میں آنے والی ہر چیز کو یا تو کچلتی ہوئی، یا چیرتی ہوئی......

اور پھر رفتار کم ہونے لگی۔ ٹائر نرم مٹی میں دھنسنے لگے۔ پچھلا حصہ ایک طرف جھکا...... انجن کی گرج ہچکیوں میں بدل گئی۔ گاڑی اب رینگ رہی تھی۔ فرش زمین کے بہت قریب آچکا تھا۔ اور پھر اچانک سب کچھ رک گیا۔

نجانے کتنی دیر بعد حرم کے ذہن اور آنکھوں کی دھند چھٹی...... کانوں میں بجتی سیٹیاں شانت ہوئیں اور اس کی جگہ ہوا کے دوش پر آتی کہیں سے بہتی نرم ندی کی آواز نے لے لی۔ پلکیں جھپکتے ہوئے اس نے چہرے پر چپکی مٹی، گھاس اور پتوں کو ہٹایا...... کھانستے ہوئے اس نے حلق اور منہ میں بکھری گرد تھوکنے کی کوشش کی۔

کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا تو گاڑی وادی کے کنارے اس بہتی ندی کے پاس رک چکی تھی۔ اس نے پلٹ کر عینا کی سمت دیکھا جو ڈرائیور سائڈ کی کھڑکی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور جسم کھڑکی پر عجیب زاویے سے مڑا ہوا تھا۔

حرم کا دل دھک سے رہ گیا۔ وادی کی زمین پر زندہ پہنچنے کی راحت اچانک ماند پڑ گئی۔

''عینا؟'' اس نے لرزتی آواز میں سرگوشی کی۔ ''تم ٹھیک ہو؟''

گاڑی کی واحد زندہ ہیڈ لائٹ کی پتلی روشنی کے پار رات کے اندھیرے میں، کسی پرندے کی چیخ گونجی مگر عینا نے جواب نہیں دیا۔

حرم نے اپنی سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے اس کے چہرے سے بال ہٹائے پھر ناک کے سامنے ہاتھ کیا تاکہ سانس کی آمد و رفت چیک کر سکے۔

اچانک اس نے کراہ کی آواز نکالی، اور اپنی جگہ سے ہل کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔

حرم کے منہ سے ایک گہری راحت بھری سانس خارج ہوئی۔ ''عینا...... بات کرو پلیز...... تم ٹھیک ہو؟'' وہ زخمی تھی اتنا تو اسے یقین تھا...... ماتھے کا گومڑ تو وہ دیکھ ہی چکی تھی...... سیٹ بیلٹ نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی نے اسے

کچھ زیادہ ہی جھنجوڑا تھا۔

اس نے کراہ کر جواب دیا مگر دوبارہ حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔

گاڑی کی باقی رہ گئی ہیڈ لائٹ بے ترتیب جھپکنے لگی، پھر بجھ گئی، اور وہ مکمل اندھیرے میں ڈوب گئے۔ گاڑی ذرا سا کراہی پھر نچلے حصے میں کہیں زوردار دھماکے کی آواز آئی، اور حرم ساکت ہوگئی۔

کھلی کھڑکی سے تیز بدبو آرہی تھی۔ کیا یہ دھواں تھا؟ گاڑی سے کوئی سیال رس رہا تھا؟ وہ گاڑی کے اندر زیادہ محفوظ تھے یا باہر؟ کیا یہی وہ مقصد تھا جو ہائی لکس میں بیٹھے مرد چاہتے تھے؟

اس نے سختی سے آنکھیں میچیں۔

اس وقت، اسے بس یہ جاننے کی ضرورت تھی کہ عینا کی چوٹیں کتنی شدید ہیں۔ جب اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں، اس نے عینا کے قریب جھک کر دیکھا کہ وہ کتنی زخمی ہوئی ہے۔ بائیں کنپٹی کے قریب سوجن کے سوا کوئی ظاہری چوٹ نہیں تھی اور وہ حرکت بھی کر رہی تھی، اس کا مطلب تھا کہ ریڑھ کی ہڈی یا گردن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا...... پھر بھی وہ اس ویرانے میں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے...... باہر رات اندھیری اور سرد ہوتی جا رہی تھی۔

گاڑی کے نیچے لڑھکنے کا علم صرف ان دو لوگوں کو تھا جنہوں نے انہیں سڑک سے اتارا تھا اور وہ ان کے لیے ایمبولینس تو بلانے والے نہیں تھے...... اس نے کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

کیا وہ چلے گئے تھے؟ یا پھر انتظار کر رہے تھے اور ان کے مرنے کا یقین کرنے واپس آتے۔

یہاں نیچے سڑک کی نسبت بہت زیادہ سردی تھی، جیسے جیسے رات گہری ہوتی، درجہ حرارت اور گر جاتا۔

”کتنی سردی ہوگی؟ کیا اتنی کہ ہم جم جائیں؟“ اس خیال نے ہی اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے...... کیا آج رات ان کا مرنا طے تھا؟ ان وحشیوں کے ہاتھوں نہیں تو ان پہاڑوں میں سردی کے باعث......

وہ بے قراری سے عینا کی طرف جھکی۔ ”عینا...... ہمیں مدد بلانی ہوگی...... تم سن رہی ہو؟ ہم یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔“

”میں نہیں چل سکتی۔“ اتنی دیر میں اس کی پہلی دھیمی سی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ ”تم جاؤ۔“ اس نے سر اٹھایا اور اگلے ہی پل اس نے گاڑی کے فرش پر الٹی کر دی۔

حرم بے اختیار پیچھے ہٹی۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا، عینا ٹھیک نہیں تھی...... شاید اسے کوئی اندرونی چوٹ لگی تھی۔

عینا کو گاڑی میں ہی رہنا چاہیے تھا۔ وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ پہاڑ چڑھے یا جھاڑیوں میں سے راستہ بناتی پھرے۔

مگر وہ کیا کرے۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا اور عینا اتنے ہوش میں نہیں تھی کہ اس سے مشورہ کر سکتی۔

کیا وہ مدد آنے تک عینا کے ساتھ رکتی؟ خود کو اور اسے گرم رکھنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈتی؟ یا اسے یہیں چھوڑ کر پیدل نکل کر کہیں سگنل ڈھونڈتی اور مدد بلانے کی کوشش کرتی۔

عینا کا فون...... اسے اچانک خیال آیا۔ وہ کہاں تھا؟

اس کا اپنا فون کمر پر بندھے پاؤچ میں محفوظ تھا۔ مگر اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ عینا کا فون اب بھی گاڑی کے اندر ہے یا نہیں۔ جب گاڑی ڈھلوان سے نیچے لڑھک رہی تھی تو کھلی کھڑکی سے بے شمار گھاس پھوس کا کچرا اندر آگیا تھا۔ کیا فون بھی باہر جا گرا تھا؟

گاڑی الٹی نہیں ہوئی تھی تو فون کو یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے سیٹ بیلٹ کھولی، جھک کر گندے فرش پر اور ہر دراڑ اور کونے میں بے تابی سے ہاتھ چلانے لگی۔ اندازے سے عینا کی الٹیوں سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے۔ فون سے پہلے اس کے ہاتھ وہ نیل فائلر لگا جو اس نے آستین میں اٹکایا تھا۔ اس بار حرم نے اسے گریبان کے اندر چھپا لیا تاکہ دوبارہ گرنے کا امکان نہ رہے۔ اس... بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ اسے بھی زخم دے سکتا ہے۔

”یا اللہ...... پلیز...... پلیز......“ اس کی آواز ٹوٹ کر گلے میں ہی بکھر گئی۔ ”بس ایک بار...... بس ایک بار یہ منحوس فون مل جائے۔“

اس کی انگلیاں فرش پر بے ترتیب کانپتی پھر رہی تھیں، اور آنسو گالوں سے بہہ کر گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔ اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس لمحے نہیں۔ اس اندھیرے میں نہیں۔ اس ویرانے میں نہیں۔ اسے اپنے بستر میں ہونا چاہیے تھا۔ کمبل میں لپٹی ہوئی، محفوظ...... سلامت۔

اس نے کبھی غلط دوست نہیں بنائے تھے۔ کبھی رات گئے آوارہ نہیں پھری تھی۔ کبھی غلط صحبت میں نہیں رہی تھی۔ اس کا تو کوئی بوائے فرینڈ تک نہیں تھا...... پھر بھی آج وہ یہاں تھی۔ اس ویرانے میں، ٹوٹی پھوٹی گاڑی میں۔ ایک نیم بے ہوش دوست کے ساتھ۔ ہر لمحہ اُن بھیڑیوں کی آمد کے خوف سے لرزتی ہوئی۔

اسی پل دروازے کے ساتھ اس کا ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ مستطیل، سرد۔ اس نے بے اختیار گرفت جمالی۔ آنسو پھر بہہ نکلے، مگر اس بار لبوں پر شکر کے ٹوٹے پھوٹے کلمات تھے۔

عجیب بات تھی زندگی میں ملی بڑی بڑی نعمتیں بھی اسے سجدے میں نہ جھکا سکیں، مگر اس لمحے...... اس اندھیرے، اس خوف، اس قید میں ایک معمولی سی چیز پر وہ یوں شکر گزار ہو رہی تھی جیسے یہی اس کی نجات ہو۔

''عینا......'' وہ اس کی طرف جھکی۔ ''مجھے فون مل گیا ہے۔ میں باہر کہیں جا کر سگنل ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ٹھیک ہے...... اگر ہم یہیں رہے تو نہیں بچ سکیں گے۔''

عینا نے جواب دینے کے بجائے ذرا سا ہاتھ اٹھایا۔

اسے یقین نہیں تھا، یہ گاڑی عینا کے لیے محفوظ پناہ گاہ تھی بھی یا نہیں...... مگر اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

پیسنجر سائڈ کا دروازہ جام تھا جسے وہ کمینہ زور لگا لگا کر نہ کھول سکا تھا۔ اسے پچھلی سیٹ کے دروازے سے باہر نکلنا پڑا اور وہ بھی کافی مشکل ثابت ہوا۔

باہر نکلتے ہی اس کے فلیٹ سینڈل مٹی میں دھنس گئے اور فضا کی یخ بستگی یکلخت ہڈیوں میں اتر گئی۔ ایک ہاتھ گرد آلود گاڑی پر رکھے، وہ آہستہ آہستہ گھومی، باہر پھیلے گھپ اندھیرے میں خود کو سمتوں سے آشنا کرنے کی کوشش کرتی ہوئی۔ ندی کی مدھم سی آواز کے ساتھ، دونوں طرف کی جھاڑیوں میں سے سرسراتی ہوا کی سرگوشیاں تھیں۔

ایک بار پھر اس نے آنکھیں پھاڑ کر اوپر ڈھلوان میں کہیں چھپی سڑک کی طرف دیکھا، شاید ہیڈ لائٹس کی کوئی جھلک نظر آ جائے۔ مگر صرف ستارے دکھائی دیے۔ مخملی آسمان میں ناقابلِ یقین حد تک روشن جلتے ہوئے۔ رات اب مکمل خاموشی میں ڈوب چکی تھی، اس نے ٹھنڈی، تازہ ہوا کا ایک گہرا سانس لیا اور ڈھلوان کی چڑھائی کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ عادل کے ساتھ ہی نیچے اترا تھا۔ اوپر سڑک پر رک کر اندازے لگانا بیکار تھا، گاڑی کہاں رکی تھی، لڑکیاں زندہ تھیں یا نہیں، یہ سب جاننے کے لیے نیچے جانا ضروری تھا۔

سڑک کا کنارہ یہاں باقاعدہ ڈھلوان نہیں تھا، وہ کچا کٹ جو پہاڑی راستوں پر بارشوں اور لینڈ سلائڈز کے بعد بن جاتا ہے۔ صرف ڈھیلی مٹی، چھوٹے بڑے پتھر اور جھاڑیاں، جو ذرا سی ٹھوکر پر کھسکنے لگتی تھیں۔

زاویار نے عادل کو اشارہ کیا کہ فاصلے سے پیچھے رہے۔ وہ سیدھا نیچے نہیں اتر رہے تھے۔ ایسے ڈھلوان پر سیدھا اترنا خطرناک تھا، اس لیے وہ آڑے ترچھے، زگ زیگ انداز میں نیچے بڑھ رہے تھے...... کبھی کسی درخت کی جڑ کو پکڑ کر، کبھی کسی چٹان کے کنارے پاؤں جما کر۔

ہر چند قدم پر رک کر زاویار نیچے جھانکتا، اندھیرے میں گاڑی کی کسی جھلک کی تلاش میں۔ کہیں سے بہتے پانی کی مدھم آواز آ رہی تھی، جو اس بات کی نشانی تھی کہ وہ وادی کے کافی قریب پہنچ چکے ہیں۔ مگر جوں جوں وہ نیچے آ رہے تھے، ڈھلوان مزید غیر مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔

عادل کے قدم بار بار ڈگمگاتے۔ ایک جگہ اس کا پاؤں پھسلا تو اس نے گھبرا کر جھاڑی پکڑی، مٹی اور پتھر اس کے ساتھ نیچے کھسک گئے۔ زاویار نے پلٹ کر ایک تیز نگاہ ڈالی۔

''دھیان سے۔ یہاں ایک قدم بھی غلط ہوا تو سیدھے نیچے جاؤ گے۔''

کافی نیچے آ کر، بالآخر اندھیرے میں گاڑی کا بھاری سایہ دکھائی دیا۔ وہ دونوں رک گئے۔ یہی وہ جگہ تھی۔

زاویار نے موبائل نکال کر ٹارچ روشن کی اور اگلے ہی پل سیٹی بجائی۔ ڈھلوان کا آخری حصہ اس نے جمپ لگا کر پھلانگا اور گاڑی کے پاس پہنچا۔

''کیا وہ زندہ ہیں؟'' عادل نے اسے ٹارچ کی روشنی گاڑی میں ڈالتے دیکھ کر وہیں سے پوچھا۔

زاویار نے پوری گاڑی کا جائزہ لینے کے بعد ٹارچ کی روشنی اس کی سمت کی...... چہرے پر سنجیدگی تھی۔ نیچے آنے سے پہلے انہوں نے اپنے ماسک ہٹا دیے تھے۔

''حرم نکل گئی۔''

''کیا......؟'' عادل تو اچھلا ہی...... مگر ان سے کچھ ہی فاصلے پر جھاڑیوں میں دبکی حرم اپنا نام سنتے ہی پوری جان سے لرز گئی۔

''کیا کہہ رہا ہے...... کیسے نکل گئی؟''

حرم کی دھڑکنیں ساکت ہوئیں۔ انہوں نے اس کا نام لیا تھا بالکل صاف اور واضح انداز میں...... یہ کوئی اتفاق نہیں تھا۔

اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا کہ وہ انہیں جانتے تھے اور بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

حرم نے سر اٹھانے کی جراءت نہیں کی۔ ایک لمحے کو بھی نہیں...... ذرا سی حرکت، ذرا سی آواز اور وہ موبائل ٹارچیں سیدھی اس پر آ جاتیں۔

''میں نے یہ سارا کھٹ راگ اس لیے نہیں پھیلایا تھا کہ

ہاتھ سے نکل جائے۔'' زاویار کا لہجہ جھنجلاہٹ سے بھرپور تھا۔ اس نے موبائل کو دائرے میں گھمایا، ٹارچ کی سفید دھار جھاڑیوں، پتھروں اور درختوں کے تنوں پر پھسلتی چلی گئی۔

''وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔ اس ویرانے میں کہاں جاسکتی ہے۔'' عادل نے بھی اپنی ٹارچ روشن کرلی۔

''یا اللہ یہ ہیں کون......؟'' یہ دوسری آواز بھی اس کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی مگر ابھی پہچان پوری طرح واضح نہیں تھی۔

سردی میں جھاڑیوں کے پتے اس کی جلد پر کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ گھٹنوں میں اینٹھن تھی، سانس بے قابو۔ اس نے پیر پیچھے جما کر، مٹی پر وزن ڈالتے ہوئے، بہت آہستہ سے سر اٹھایا۔

دو موبائل ٹارچوں کی روشنی اتنی تھی کہ اب ان کے چہرے صاف نظر آرہے تھے۔

حیرت کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ ایک پل کو اس کی سانس رک گئی۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی، اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

یہ عادل تھا مناہل کا ایکس اور دوسرا...... زاویار حیدر...... ان کے گروپ کا لیڈر...... اور ایک صوبائی وزیر کا اکلوتا اور بے حد بگڑا ہوا بیٹا۔

حرم کے بے یقین، منجمد ذہن میں اس وقت ایک ہی سوال گونجنے لگا۔ بڑے بڑے سوالیہ نشان کے ساتھ...... کیوں؟

وہ ان کے پیچھے کیوں تھے......؟ ٹھیک ہے وہ بگڑے ہوئے تھے، بے لگام تھے، کمینے تھے مگر ان ہی کے پیچھے کیوں...... اسے یاد نہیں پڑتا تھا اس کی کبھی زاویار کے ساتھ براہِ راست بات بھی ہوئی ہو۔ کوئی جھگڑا، کوئی ٹکراؤ، کوئی انکار...... کچھ بھی نہیں۔

اور عادل...... وہ تو مناہل سے منگنی کرنے والا تھا۔ وہ کیسے اس کھیل کا حصہ بن سکتا تھا؟ ایسا کھیل جو محض خوفزدہ کرنا نہیں تھا، یہ تو جانچ کر، ناپ تول کر، زندگیوں کو کنارے لگا دینے والا عمل تھا۔

وہ مڑنا چاہتی تھی مگر اس کا پیر جس پتھر پر پڑا وہ جما ہوا نہیں تھا، اگلے ہی لمحے وہ پتھر اس کے وزن سے پھسل کر نیچے لڑھکا...... اور اس کے ساتھ تین چار اور پتھر بھی، خشک، بے رحم آواز کے ساتھ ڈھلوان پر اچھلتے چلے گئے۔

''شٹ...... وہ یہیں ہے......'' زاویار کسی چیتے کی طرح چوکنا ہوا، آواز اتنی بلند تھی کہ اس کے ہیجان میں مزید اضافہ ہوا...... اس نے فوراً ٹارچ اسی سمت گھما دی۔

سفید روشنی جھاڑیوں کو چیرتی ہوئی اس جگہ آن ٹھہری جہاں حرم ابھی ایک لمحہ پہلے تھی۔ اب احتیاط کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ ویسے بھی دیکھ ہی لیتا۔ حرم نے ایک ہی لمحے میں فیصلہ کیا۔ اس نے روشنی سے بچنے کی کوشش میں ایک لمبی جست لگائی...... پاؤں اس ناہموار زمین پر اتنی زور سے پڑے کہ وہ گھٹنوں کے بل جا گری...... درد کا نوکیلا احساس گھٹنوں سے اٹھا اسے چیخنے پر مجبور کرگیا...... مگر یہ درد بھی اتنا ہولناک نہیں تھا جتنا ان کے ہاتھ لگنے کا خیال...... رگوں میں خون کے ساتھ دوڑتی دہشت کے ساتھ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھی اور دیوانہ وار دوڑ پڑی۔

''وہ رہی...... بھاگ رہی ہے...... تو اسے گاڑی تک لے جا...... میں اُسے پکڑتا ہوں......'' چیخ کر عادل سے کہتے ہوئے وہ اس کی طرف لپکا...... اب وہ اسے صاف دکھائی دے گئی تھی۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ انہیں دیکھ چکی ہے...... یہ اب محض ڈرانے یا پکڑنے کا کھیل نہیں رہا تھا، یہ معاملہ ہاتھ سے نکلنے سے پہلے نمٹانے کا تھا۔ وہ دونوں ندی کے کنارے پھیلی نسبتاً ہموار زمین پر تھے......

نرم مٹی، جھاڑیاں اور جگہ جگہ بکھرے پتھر۔ اس کے پیروں میں اسنیکرز تھے...... اس زمین پر دوڑنے کے لیے موزوں۔ وہ لمبے مگر نپے تلے قدم رکھ رہا تھا، رفتار برقرار رکھتے ہوئے سانس قابو میں رکھے۔

حرم کے لیے مسئلہ زمین نہیں تھی اس کے پاؤں تھے۔ سینڈل نرم مٹی میں دھنس رہے تھے۔ ہر قدم کے ساتھ توازن بگڑتا، اور جھاڑیاں اس کے بازوؤں اور پنڈلیوں سے ٹکرا کر رفتار توڑ دیتیں۔ وہ سیدھی نہیں بھاگ پا رہی تھی۔ کبھی جھاڑیوں سے بچتی، کبھی کسی پتھر پر پاؤں پڑنے سے بچانے کو قدم بدلتی۔ سانس ٹوٹ ٹوٹ کر آرہا تھا، مگر وہ رک نہیں سکتی تھی۔

''حرم رک جاؤ...... تم بھاگ نہیں سکتیں...... خود کو اور مجھے تھکانا بند کرو۔'' وہ اس کے پیچھے چلا رہا تھا۔ ''تمہاری دوست ویسے بھی ہمارے قبضے میں ہے...... کیا تم اسے یونہی چھوڑ دوگی؟''

اس کی نظر دھندلا رہی تھی۔ سینہ جل رہا تھا، جیسے پھیپھڑوں میں آگ لگی ہو۔ وہ اس کی آواز صاف سن رہی تھی۔ اتنی قریب کہ الفاظ اس کے کانوں کے اندر اترتے محسوس ہو رہے تھے۔

ایک لمحے کو اس کے قدم ڈگمگائے۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شاید وہ اسے پکڑ ہی لیتا۔ مگر عینا کی تصویر ذہن میں

ابھری۔ گاڑی میں بے ہوش۔ وہ اس کے لیے خود کو پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ اگر اسے خود کو بچانا تھا...... اگر اسے عینا کو بچانا تھا تو اسے بھاگتے رہنا تھا۔ جب تک سانس چلتی۔ جب تک پاؤں زمین چھوڑنے سے انکار نہ کرتے۔

وہ اس کے بہت قریب تھا، وہ محسوس کر رہی تھی کہ پھر اچانک...... پیچھے سے وزن اس پر آ پڑا۔ ایک سخت بازو اس کی کمر کے گرد لپٹا، دوسرے نے کندھے کو جکڑا۔ اگلے ہی لمحے حرم کے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ اس کی چیخ گلے میں ہی دب کر رہ گئی۔

زاویار نے اسے جس سختی سے دبوچا تھا کہ اس کی سانس رکنے لگی۔ کمر زاویار کے سینے سے جا لگی، وہ گھسٹتی ہوئی دو قدم آگے گئی، پھر دونوں لڑکھڑا کر رک گئے۔

''کہا تھا نا......'' اس کی سانس اس کے کان کے پاس گرم اور تیز تھی۔ ''تم بھاگ نہیں سکتیں۔''

حرم نے پوری طاقت سے کہنیاں پیچھے ماریں۔ ایک ضرب اس کے پیٹ پر لگی، دوسری پسلیوں پر مگر گرفت ڈھیلی نہیں پڑی۔ زاویار نے اسے زمین سے ذرا سا اوپر اٹھایا، اور ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا۔

''چھوڑو مجھے!'' حلق کے بل چلاتے ہوئے اس کی چیخیں آسمان ہلا رہی تھیں کہ زاویار کا ہاتھ اس کے چہرے پر آ گیا۔ ہتھیلی اس کی ناک اور منہ پر پوری قوت سے جماتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا۔ ''ششش......''

ہوا ایک دم سے غائب ہوئی تھی...... حرم نے سر جھٹکا، گردن موڑی، اس کے ہاتھ کو نوچنے کی کوشش کی مگر گرفت آہنی تھی۔

وہ اسے خود سے بھینچے رہا، جب تک اس کی مزاحمت دم نہ توڑ گئی۔ بازو بے جان ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ ہٹاتے ہی وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

''کیا یار... تم لڑکیاں کتنی نازک ہوتی ہو۔''

آواز میں ہنسی بھی تھی، ہلکی سی جھنجلاہٹ بھی۔ ''میں تو سمجھا میں نے تمہیں مار ہی ڈالا...... اپنے ارمان نکالنے سے پہلے ہی۔''

آنکھیں ابھی بند تھیں مگر یہ الفاظ اس کے کانوں میں کیلوں کی طرح اتر گئے۔ ہوش پوری طرح واپس نہیں آیا تھا، مگر یادداشت جاگ چکی تھی ساتھ ہی یہ احساس بھی پوری شدت سے حملہ آور ہوا...... کہ وہ گھیری جا چکی ہے۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ اوپر کریم رنگ کی چھت تھی، فالس سیلنگ میں نفیس نقش و نگار، مدھم سنہری روشنی نقطوں کی صورت بکھری ہوئی۔ ساتھ ہی اپنے نیچے دبیز رگ کی ٹھنڈی سختی کا احساس ہوا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر میں ایسی چکر دار ٹیس اٹھی کہ آنکھوں کے آگے سیاہی لہرا گئی۔

''میں کہاں ہوں؟'' اسے خود اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔

''حرم...... تم ٹھیک ہو؟'' یہ آواز مانوس تھی۔

''عینا۔'' اس نے گردن موڑی۔ عینا چند قدم کے فاصلے پر فرش پر ہی بیٹھی تھی، بال بکھرے، چہرہ زرد، متورم مگر کھلی ہوئی آنکھیں۔ ہوش میں۔ زندہ۔ حرم کے سینے میں پھنسی سانس دھیرے سے باہر نکلی...... عینا کھسک کر اس کے قریب ہوئی تھی۔

تب اس نے کمرے کو دیکھا۔ دیواروں پر بھاری پردے، اور سامنے ایک بڑے صوفے پر زاویار ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر قدرے اکتاہٹ تھی۔

عادل کمرے کے وسط میں ٹہل رہا تھا، بے چینی اس کے قدموں میں صاف جھلک رہی تھی۔

اب اسے سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ان کا گھر تو نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ شاید وہی فارم ہاؤس تھا جس کی افواہیں اکثر زیر گردش رہتی تھیں...... حرم کی ریڑھ میں سنسناہٹ دوڑی۔ کپکپاتے لبوں پر خود بخود ہی یہ سوال آیا۔ ''ہم یہاں کیوں ہیں؟''

''یہ بات......'' زاویار اچانک جوش سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ''میں تو مرا جا رہا تھا کہ تم کب ہوش میں آؤ اور مجھ سے یہ سوال کرو۔''

''زاویار!'' عادل کے قدم وہیں جم گئے۔ اس کی آواز میں تنبیہ تھی، آنکھوں میں صاف پیغام خاموش رہو۔ وہ یقینی طور پر نہیں چاہتا تھا کہ زاویار اپنا منہ کھولے...... مگر کیوں؟

''ہم نے کیا کیا ہے...... ہم نے ایسا کیا کیا ہے؟'' عینا نے دھیمی اور لرزتی آواز میں کہا...... اس کا مخاطب عادل تھا...... اسے شاید زاویار کو دیکھ شاک نہیں لگا تھا، اس کی ساری بے یقینی عادل کے لیے تھی۔ ''میں نے ہمیشہ تمہیں اچھا انسان سمجھا تھا، تم اور منابل......''

''اوہ کم آن......'' زاویار نے ایک دم ہی چلا کر اس کی بات کاٹی...... وہ اپنی جگہ سے اٹھا...... ایک ہی جست میں عادل تک کا فاصلہ طے کیا۔ ''تمہیں واقعی میں یہ لگتا ہے کہ وہ سب رئیل تھا؟ تمہیں واقعی یہ لگتا ہے کہ یہ دونوں کپل تھے؟'' اس نے دونوں ہاتھوں میں عادل کا منہ پکڑ کے

زبردستی ان کی طرف تھمایا۔ ”دیکھو اِسے...... اور پھر اپنی فرینڈ کو دیکھو...... ان کا کوئی میل ہے بھی؟ یہ کور بوائے اور وہ......“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

عادل نے جھنجلا کر اس کے ہاتھ جھٹک دیے، چہرہ چھڑایا۔

عینا اور حرم نے وحشت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک پل لگا تھا یہ سمجھنے میں کہ یہ کہانی آج کے آج نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ کچھ زیادہ پرانا تھا...... کچھ زیادہ تاریک۔

”تو وہ سب کیا تھا؟“ حرم، زاویار کی طرف دیکھ رہی تھی...... عادل سے جواب ملنا مشکل تھا، وہ جان گئی تھی۔

”شغل میلا......“ ہنس کر کندھے اُچکاتے ہوئے اس نے ٹیبل سے سگریٹ کیس اٹھایا۔

”زاویار...... تجھے جو کرنا ہے، جلدی کر...... اور یہ سب ختم کر......“ عادل پھر بے چین ہوا تھا......

حرم کو وہ خوفزدہ لگا۔ ایسی کیا بات تھی جو وہ اتنا ڈر رہا تھا......؟ کیا وہ بات مناہل سے متعلق تھی؟ یقیناً...... کیا بریک اَپ سے متعلق...... حرم کا دماغ لمحوں میں ہر ممکن زاویہ ٹٹولنے لگا۔

”لیکن ہم یہاں کیوں ہیں؟ ہم ہی کیوں؟“ عینا کا ضبط ٹوٹا تو وہ چیخ اٹھی۔

”یہ تو اپنی اُس فرینڈ سے پوچھو جو خود گرم بستر میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہوگی اور تم دونوں کو یہاں پھنسا گئی......“ بے نیازی سے کہتے ہوئے اس نے سگریٹ سلگایا۔

”زاویار...... تو اپنا منہ بند کرے گا۔“ عادل اسے گھور رہا تھا جیسے کچا چبا جائے گا۔

”سوری، دوست......“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”انہیں بھی حقیقت جاننے کا حق ہے خاص طور پر میری حرم کو۔“ کمینگی سے آنکھ مارتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ ”تو بتاؤ میری جان......“

وہ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا چہرہ اس کے قریب تر تھا۔ ”آج سے شروع کروں؟ یا دو مہینے پہلے سے؟“ اس نے خباثت زدہ لگاوٹ سے کہا۔

حرم کے اندر ایک طوفان سا اٹھا...... جو سینے سے نکل کر انگلیوں تک پھیل گیا۔ اس کی مٹھی خود بخود بھنچ گئی۔ لمحہ بھر کو دل چاہا کہ اس چہرے کو نوچ ڈالے ناخنوں سے، دانتوں سے...... کسی بھی طرح۔

”دو مہینے پہلے سے۔“ آواز اس کی اپنی تھی مگر اسے سن کر خود حیرت ہوئی کہ وہ کانپ کیوں نہیں رہی تھی۔

کمرے کے دوسرے کونے میں عادل تڑپ اٹھا۔

اس نے جھنجلاہٹ میں ٹیبل کو ایک زوردار لات ماری۔ شیشے ہلکے سے بجے۔

زاویار نے پلٹ کر اسے دیکھا ایک لمحے کو۔ پھر ہنسا۔ اونچی، بے ربط ہنسی۔ اور دوبارہ حرم کی طرف جھک آیا۔

”دو مہینے پہلے عادل اسے کہیں ہماری ایک پارٹی میں لے کر آیا تھا...... وہ ہمارے گروپ میں کافی فیمس تھی یونو...... عادل کی وجہ سے۔ سب جانتے تھے وہ ہمارے چاکلیٹ بوائے کی بندی ہے چاہے ٹیمپریری ہی سہی......“ اس نے ایک بار پھر ایک کمینی مسکراہٹ سے عادل کی سمت دیکھا جو سختی سے لب بھینچے اسے گھور رہا تھا۔

وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا...... کہنیاں رگ پر ٹکا کر اطمینان سے نیم دراز ہو کر...... ”اب سب جانتے ہیں ہماری پارٹیوں میں کیا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کوئی اپنی مرضی سے آئے تو اس میں قصور کس کا؟ اسے بھی کسی نے اسپیشل ڈرنک پلا دی......“ اس نے کندھے اُچکائے۔ ”چلو...... اب تم سے کیا چھپانا، اس پر نوید اور انس کی نیت خراب ہوگئی تھی۔“

حرم کا دل کہیں گہرائی میں گرا...... اس کے ہاتھ کی گرفت عینا کے ہاتھ پر سخت ہوئی۔

”ان گدھوں کو لگا تھا نشہ زیادہ دیں گے تو اسے کچھ پتا نہیں چلے گا...... مگر خیر وہ بندی چالاک تھی، سمجھ گئی...... ایسے میں عادل کو معاملہ سنبھالنے آگے آنا پڑا...... اسے اس سے شادی نہیں کرنی تھی بس کچھ وقت کے لیے اسے بہلا کے رکھنا تھا اور اس نے یہ کیا بھی...... مگر ٹھیک ایک مہینے بعد...... بوم......“ اس نے اچانک سے چٹکی بجائی۔ ”مناہل نے اس کے سر پر پریگننٹ ہونے کا بم پھوڑ دیا...... اب بتاؤ عادل بیچارہ کیا کرے...... وہ تو اس رات اس کے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا۔“

عینا کی سسکیاں بے قابو ہوئیں...... حرم ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا جسم ٹھنڈے پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ وہ کیسی دوست تھی...... مناہل اتنا کچھ جھیل رہی تھی اور اسے کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔

”اب مسئلہ یہ ہے...... وہ عادل کو دھمکا رہی ہے......“ اس نے عادل کی طرف دیکھا۔

”پرایا بچہ اپنے سر لینا؟ ناممکن۔ سچ بتانا؟ وہ بھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ”اس صورت میں تو ہم سب پھنسیں گے۔“

”تو تم لوگوں نے اُسے مارنے کا پلان بنایا؟“ یہ

سوال کرتے ہوئے حرم خود بھی کانپ گئی۔
''پلان پرفیکٹ تھا اگر عین وقت پر اس کا ارادہ نہ بدلا ہوتا...... وہ بیوقوف خود ہی عادل سے اپنے آج کے دن کا پلان ڈسکس کر چکی تھی...... اور پھر......'' اس کی نگاہ اچانک حرم پر جم گئی۔ ''اور پھر گاڑی میں میری نظر تم پر پڑی...... اوہ بٹر فلائی......!'' وہ سر پیچھے کر کے ہنسا۔
''تم تو پہلے سال سے میرا کرش ہو۔ بس ایک مسئلہ تھا۔ میری ریپوٹیشن لڑکیوں میں عادل جیسی صاف نہیں۔''
اس نے طنزیہ نظر عادل پر ڈالی۔
''اور دوسرا...... عادل کا یہ لیکچر کہ اگر میں نے تمہارے بارے میں کچھ بھی الٹا سوچا تو تمہارے بھائی میرا ایسا پتا کاٹیں گے کہ نشان تک نہیں ملے گا۔''
حرم جانتی تھی، وہ غلط نہیں تھا...... یہ عادل کی ریپوٹیشن ہی تھی کہ مناہل اس کے دام میں آ گئی...... اگر زاویار اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا تو کیا حرم قبول کرتی...... کبھی نہیں۔
''تو تمہیں کیا لگتا ہے...... ہمیں اس طرح اٹھا کر لانے سے وہ تمہیں بخش دیں گے؟'' حرم اس کی آنکھوں میں گھور رہی تھی۔
''انہیں کیا پتا...... تم کہاں ہو۔ تمہاری گمشدگی سے کوئی ہمارا تعلق نہیں جوڑ پائے گا...... مناہل بھی نہیں......''
بے پروائی سے کہتا وہ اٹھا اور پیچھے ٹیبل کی طرف پلٹا...... تب حرم کی نظر پہلی بار اس پسٹل پر پڑی جسے وہ ہاتھ بڑھا کر اٹھا رہا تھا......
''جیسے مہک افتخار کی گمشدگی سے نہیں جوڑ پایا تھا......'' اس کی دھیمی سی بڑبڑاہٹ اُبھری...... اب سب سمجھ آ رہا تھا۔ اب سب کچھ واضح تھا۔
''کیا یاد دلا دیا......'' وہ ہنسا۔ ''اسے ہم نے نہیں مارا تھا، وہ اوور ڈوز سے مری تھی۔''
''مری؟'' عینا چلا اٹھی۔ ''اوہ میرے خدایا...... اوہ میرے خدایا......'' ہذیانی ہو کر چیختے ہوئے اس نے اپنے بال جکڑ لیے۔
''زاویار...... تیرا مسئلہ کیا ہے؟'' عادل کا ضبط چیخ اٹھا، اس نے جس طرح آ کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا......
زاویار کی نظر آہستہ سے اس ہاتھ پر گئی۔ نگاہ میں ناگواری نہیں تھی بس ایک سرد تنبیہ۔
''ہاتھ پیچھے کر۔'' اس نے پسٹل سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ عادل فوراً ساکت ہو گیا۔

حرم انہیں دیکھ رہی تھی بنا پلک جھپکائے۔ مگر دماغ میں خیالات ایک دوسرے پر چڑھتے جا رہے تھے۔ یہ سب ان کے لیے ایک مشغلے جیسا تھا۔ یہ درندے تھے، انسانیت کے نام پہ دھبا تھے...... چاہے مناہل کے لیے پلان بنایا ہو، چاہے مہک کی موت میں شامل رہے ہوں، چاہے ان سے پہلے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو روند چکے ہوں...... اور اب اپنا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے کھولنے کے بعد...... حرم کو ایک بات صاف دکھائی دے رہی تھی...... وہ انہیں یہاں سے زندہ واپس نہیں جانے دیں گے۔
وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے...... ان کے درمیان کا کھچاؤ صاف محسوس ہو رہا تھا......
حرم دھیرے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عینا نے اس کی تقلید کی......
عین اسی لمحے زاویار نے گردن موڑی۔ نظر سیدھی حرم پر آٹھہری۔
''چلو بے بی گرل......'' اس کی آنکھوں میں حیوانی چمک تھی۔ ''رات کے کچھ ہی گھنٹے بچے ہیں، میں انہیں ضائع نہیں کرنا چاہتا......''
حرم کی روح فنا ہوئی...... انگلیاں عینا کے بازوؤں میں اتر گئیں...... یہ مرحلہ بھی آنا تھا اس کی جان نچوڑنے کو...... روح کھینچنے کو۔
''نہیں...... نہیں...... پلیز پلیز پلیز......''
زاویار نے ہاتھ پھیلائے۔ اس بار مسکراہٹ صاف تھی خباثت سے بھری۔ ''اگر تم انہیں فری کا شو دکھانا چاہتی ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ اس کی طرف بڑھا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''
سفید پڑتی رنگت کے ساتھ وہ دو قدم پیچھے ہٹی...... دیوار، فرش، کمرا سب اس پر سمٹتے جا رہے تھے، آکسیجن کم ہوتی جا رہی تھی۔
''عادل کچھ کرو...... یہ مت ہونے دو...... تم ایسے نہیں ہو......'' عینا چیخ رہی تھی، عادل کو پکار رہی تھی...... وہ نجانے کس خوش فہمی میں تھی۔ یہ وہی تو تھا جو کچھ دیر پہلے زاویار کو سب کچھ جلدی نمٹانے کو کہہ رہا تھا۔ یہ وہی تھا جو مناہل کی بربادی میں شامل تھا، اسے مارنے کے پلان میں شامل تھا۔ اس وقت بھی وہ دور کھڑا اس طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔
حرم کا ذہن سن ہو رہا تھا، دھڑکنیں کانوں میں بج رہی تھیں، اتنی تیز کہ باقی ہر آواز دبتی جا رہی تھی۔ سوچ ختم ہو گئی تھی۔ صرف ایک خواہش باقی تھی...... وہ مرنے کو تیار تھی مگر

اس کے ہاتھ لگنے کو نہیں...... اسے بھاگنا تھا چاہے جو بھی۔ کچھ نہیں تھا...... پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھتے، کوئی راہِ فرار ڈھونڈتے دروازے پر نظر پڑتے ہی وہ دوڑ پڑی۔

اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے اس کا وجود جھنجھنایا...... زاویار نے اسے پیچھے سے کھینچا تھا، پسٹل کی ٹھنڈی، بے رحم نال اس کی گردن سے آلگی۔ سانس وہیں رک گئی۔

عینا کی چیخ اس کے حلق میں ہی گھٹ گئی یوں جیسے کسی نے حلق دبا کر آواز بند کر دی ہو۔

''اتنی مشکل سے ہاتھ لگی ہو۔'' اس کی آواز کان کے قریب تھی اور حد سے زیادہ پُرسکون۔ ''اتنی آسانی سے جانے دوں...... ہاں......؟''

اسے اپنی گرفت میں جکڑے وہ مڑ کر عادل سے مخاطب ہوا تو آواز ہموار تھی، تقریباً سپاٹ...... ''عادل...... اپنی اس سالی کو سنبھال لینا۔''

وہ اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا تھا۔

دروازہ دھڑام سے بند ہوا اور شاید...... زندگی کا آخری در بھی...... کمرا بڑا تھا، مگر حرم کو سانس لینے کی جگہ نہیں مل رہی تھی، وہ ہانپ رہی تھی...... مچل رہی تھی۔

زاویار نے اسے پیچھے بیڈ کی طرف دھکیلا۔ اس کی مضبوط گرفت بے رحم اور جارحانہ تھی۔ وہ اس پر جھکا۔ اس کی سانسیں، اس کا وزن، اس کی موجودگی...... اس پر پہاڑ سا ٹوٹا تھا۔

اس کی سانس بند ہونے لگی تھی اس بوجھ سے کہ اچانک اسی لمحے...... اس کے سینے میں کچھ چبھا۔ تیز، بے رحم سا درد...... نوکیلا مگر چونکا دینے والا۔ حرم کی سانس اٹک گئی۔

نیل فائلر۔ وہ وہیں تھا۔ ابھی بھی۔

اسے جیسے کسی نے اندر سے جھنجھوڑ دیا...... خوف کے نیچے دبے ہوئے جذبات کی ایک اور تہ جاگ گئی...... نفرت، غضب...... انکار۔

وہ مکمل طور پر بے بس نہیں تھی۔ ابھی نہیں۔ اس نے دانت بھینچے۔ آنکھوں میں آنسو تھے، جسم و جاں کی پوری توانائی لگا کر وہ پہلو کے بل ہوئی اپنا بازو اس کے اور اپنے بیچ لاتے ہوئے۔

زاویار اس کی اس جنبش کو محض ایک کمزور سی تڑپ سمجھ رہا تھا۔ مگر حرم کے لیے یہ زندگی اور موت کی لڑائی تھی اور وہ لڑ رہی تھی۔

چیونٹی کی رفتار سے سرکتے ان وحشت زدہ لمحوں میں بھی اس کی مزاحمت زندہ تھی، اس کا ذہن فوکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا...... نیل فائلر کوئی تیز دھار چاقو نہیں تھا۔

غلط زاویہ، غلط جگہ، یا ذرا سی تاخیر اور اس کے پاس بچنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

اسے صرف ایک وار کرنا تھا۔ قریب سے۔ درست زاویے پر اور کاری۔ ایسی جگہ۔ جہاں ردِعمل کا وقت ہی نہ ملے۔

زاویار کی توجہ بھلا اس کے ہاتھ کی طرف کیوں ہوتی...... اس کے لیے تو وہ ڈھیر ہو چکی تھی۔

نیل فائلر پر گرفت جماتے ہوئے اس نے بازو تیزی سے نکالا...... وہ ذرا اوپر ہوا اور...... اسی پل...... ایک آخری نظر اس کی وحشت سے دہکتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے نیل فائلر اس کے نرخرے میں اتارا...... اتنا قریب، اتنا اچانک کہ اسے بچنے، سنبھلنے، یا سمجھنے کا موقع تک نہ ملا۔

حرکت رکی نہیں۔ وہ اسے نیچے تک کھینچتی چلی گئی...... اس کی پھیلتی ہوئی آنکھوں میں صرف اور صرف بے یقینی کا رنگ تھا۔

اسے اپنے خون میں رنگتا ہوا وہ اس کے پہلو میں ڈھیر ہوا تو وہ ایک پل بھی ضائع کیے بغیر جھٹکے سے اٹھی۔

سینہ اس طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا جیسے ابھی پھٹ جائے گا، دل بے قابو ہو کر پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے، اس نے ایک قدم پیچھے لیا، پھر دوسرا۔ قدم لڑکھڑائے مگر وہ گری نہیں۔

آنکھوں کے سامنے اندھیرا اور روشنی باری باری ناچ رہے تھے۔ کانوں میں صرف دھونکنی کی طرح چلتی اپنی سانسوں کی آواز تھی۔

اسی لمحے اس کی نظر اس پسٹل پر پڑی جو زاویار کے ڈھیلے ہاتھ سے پھسل کر فرش پر آ گیا تھا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

اس نے بنا لمحہ ضائع کیے جھپٹ کر اسے اٹھایا تھا۔

''اسے بچاؤ عادل...... یہ مت کرو...... اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا تم جانتے ہو...... ہمیں یہاں سے باہر نکالو...... ہم کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے...... ہم تمہارا نام تک نہیں لیں گے، میں قسم کھاتی ہوں۔'' عینا، عادل کے قدموں میں گڑگڑاتی اسے بچانے کی بھیک مانگ رہی تھی۔

''لیکن میں نہیں کھاتی۔''

اس کی غضب ناک دہکتی آواز پر عینا نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

چہرے پر آنسوؤں اور خون کی نمی لرزتے ہاتھوں میں پستول لیے وہ لڑکھڑا رہی تھی...... عادل کی آنکھیں پھیلی تھیں وہ بے اختیار پیچھے ہٹا۔

وہ اُسے دیکھ رہی تھی یک ٹک۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک اس کا واحد خیال یہاں سے زندہ نکلنا تھا، مگر اس لمحے، اس وجیہہ چہرے کو دیکھتے ہوئے، اسے اچانک احساس ہوا۔

وہ معصوم نہیں تھا۔ وہ بے گناہ نہیں تھا، اس کی خاموشی بے بسی نہیں تھی۔ زاویار کھلا درندہ تھا، چیختا، اُچھلتا، بے قابو۔ اس کے پنجے نظر آتے تھے، اس کے دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس سے ڈرنا آسان تھا، اس سے بچنے کی خواہش فطری تھی۔

عادل مختلف تھا۔ وہ خوبصورت چہرے کی اوٹ میں چھپا ہوا زہر تھا۔ وہ مخمل میں لپٹا خنجر تھا۔۔۔ جو پہلے یقین بناتا، پھر دل میں اترتا، جس کے نام پر لڑکیاں خود کو محفوظ سمجھتیں۔۔۔ وہ زاویار سے زیادہ خطرناک تھا، اندر سے اس سے زیادہ تاریک۔

مہک، منال اور نہ جانے کتنی اور۔ یہ سب حادثے نہیں تھے۔ یہ انتخاب تھے۔

اگر یہ آدمی زندہ رہتا، بچ جاتا اور یقیناً بچتا۔۔۔ سونے کے تاروں سے بنے طاقت اور اثر و رسوخ کے جال کے پیچھے محفوظ، اس تک کوئی سزا پہنچ ہی نہ پاتی۔۔۔ یہ کہانی پھر اور، کسی اور لڑکی کے ساتھ دوبارہ لکھی جاتی۔ وہ موذی تھے، حیوان تھے۔۔۔ اور ایسے حیوانوں کو جینے کا کوئی حق نہیں تھا۔

اس کا لرزتا ہاتھ ذرا اوپر اٹھا۔

عادل چیخنے لگا۔ مدد کی درخواست، باہر نکالنے کے وعدے، قسمیں، یقین دہانیاں۔ مگر اس کے الفاظ اس تک پہنچ ہی نہیں رہے تھے۔ وہ دماغ بند کر چکی تھی۔

انگلی ٹریگر پر دبی۔۔۔ ایک بار۔۔۔ ہاتھ کو جھٹکا لگا۔

دوسری بار۔۔۔ سانس سینے میں اٹکی۔

تیسری بار۔۔۔ فیصلہ کن آواز گونجی۔

اس کا جسم دھپ کی بھاری آواز کے ساتھ زمین پر آ گرا تھا۔

☆☆☆

حرم نے اس رات فارم ہاؤس چھوڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ باوجود اس کے کہ وہاں نہ کوئی سیکیورٹی گارڈ موجود تھا اور نہ کوئی چوکیدار۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ جائے وقوعہ کو چھوڑنے کی صورت میں واقعات کو مسخ کیے جانے کا امکان پیدا ہو جاتا۔ ایک لمحے کی عجلت پوری کہانی دفن کر دیتی۔ اور وہ یہ قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں تھی۔

اس نے وہیں سے کال کی تھی۔ متعلقہ حکام کو، اپنے بھائیوں کو۔۔۔ عینا کے گھر والوں کو۔ فارم ہاؤس میں مکمل پورے آ رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ پولیس، فرانزک ٹیمیں اور تفتیشی افسران فارم ہاؤس کو گھیر چکے تھے۔ اسی تفتیشی افسر نے کم از کم پانچ بار حرم کا بیان قلم بند کیا، جب اس نے بتایا کہ اس نے کس طرح سیلف ڈیفنس میں دو جانیں لیں۔

وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں حیرت بھی تھی اور بے یقینی بھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے سامنے ایک نازک سی لڑکی بیٹھی تھی، اور لاشیں دو بنے ٹھنے مردوں کی تھیں۔ مگر شواہد کسی ذاتی تاثر کے تابع نہیں ہوتے۔ ان کی ٹوٹی بکھری حالت، بکھرا ہوا منظر اور بے جان اجسام سب کچھ چیخ چیخ کر وہی کہانی سنا رہے تھے جو حرم اور عینا نے بیان کی تھی۔

حرم کے بڑے بھائی پولیس کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ آمد خاموش تھی مگر اثر فوری۔ انہوں نے آتے ہی سب سنبھال لیا۔ قانونی نکات، بیانات کی ترتیب، اور یہ اطمینان کہ کوئی ثبوت ضائع نہ ہو۔

اس کیس کے منظرِ عام پر آتے ہی وی آئی پی کے نام کے ساتھ جڑی ہوئی دراڑیں کھلنے لگیں۔ ایک کے بعد ایک لڑکیاں سامنے آئیں۔ وہ چہرے جو اب تک خوف، شرم یا دھمکیوں کے باعث خاموش تھے۔ بیانات مختلف تھے، مگر انجام یکساں۔ وہ سب اسی بھیڑیوں کے غول کا شکار بن چکی تھیں۔ میڈیا اور سوشل میڈیا پر یہ کیس جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ وہ نام جو کل تک ناقابلِ گرفت سمجھے جاتے تھے، اب سرخیوں میں تھے۔

چھ لڑکوں کی گرفتاری رکوانے کی ان کے بارسوخ اہلِ خانہ نے بھرپور کوشش کی مگر اس بار طاقت کی یہ لڑائی یک طرفہ نہیں تھی۔

حرم کے لیے یہ راستہ آسان نہیں تھا۔ تفتیشی مراحل، عدالتی پیشیاں، اور بار بار دہرائے گئے بیانات۔ مگر یہ سب اُس رات کے مقابلے کچھ بھی نہیں تھا جو اس کی باقی زندگی کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن چکی تھی۔

وہ جانتی تھی۔۔۔ اس نظامِ عدل میں طاقتور اکثر سزا تو دور، جیل کی دہلیز تک بھی زیادہ دیر نہیں رکتے۔ تاریخیں، ضمانتیں، اور بند کمروں کے فیصلے۔۔۔ سب کچھ ممکن تھا۔

مگر اسے اتنا اطمینان ضرور تھا، ان نشان زدہ چہروں سے اب کم از کم کوئی اور لڑکی نہیں ڈسی جائے گی۔

❖❖❖

وہ دونوں آبادی کی طرف چلنے لگے۔ اس علاقے کی ایک گلی میں داخل ہوکر دونوں نے رک کر دائیں بائیں دیکھا اور چلتے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے چلے گئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ وہ دستک گہری خاموشی کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

اسی نے دوبارہ دستک دی تو اندر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''آپ کے مہمان آئے ہیں، دروازہ کھولیں۔'' وہ اسی انداز میں بولا جیسے اس علاقے میں رہنے والے لوگ بولتے تھے۔

''کہاں سے آگئے مہمان......'' دروازہ کھلا اور اندر سے نکلنے والے شخص نے جونہی ان کی طرف دیکھا۔ ایک دم سے ایک نے اس کے اوپر چادر ڈالی اور اس کی گردن کے ایک حصے کو دبایا تو وہ ان کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ ایک نے اسے کندھے پر بوری کی طرح اُٹھایا اور چلتے ہوئے اپنی کار کے پاس پہنچے۔ اسے پچھلی سیٹ پر لٹا کر گاڑی بیک ہوئی اور تیزی سے اس جگہ سے نکل گئی۔

☆☆☆

شہر کے پوش علاقے میں وہ بنگلا معروف سرجن ڈاکٹر آفتاب احمد کا تھا۔ اس وسیع وعریض بنگلے میں تین افراد اپنے تین ملازمین کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ڈاکٹر آفتاب ساٹھ سال کی عمر کا صحت مند اور تندرست شخص تھا۔ وہ روزانہ بلاناغہ ورزش کرتا تھا اور اپنی صحت کے مطابق خوراک کھاتا تھا۔ اس کی بیوی ڈاکٹر نفیسہ پچاس سال سے زائد عمر ہونے کے باوجود اپنی پُرکشش شخصیت کی بدولت کم عمر لگتی تھی۔ ان کا ایک بیٹا بیرونِ ملک تعلیم کے حصول کے لیے گیا ہوا تھا جبکہ بیٹی فلک آفتاب ڈاکٹر بننے کے بعد ہاؤس جاب کر رہی تھی کہ اس نے بیچ میں ہی سب کچھ چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو اپنی ذات میں محصور کرلیا۔

ڈاکٹر آفتاب احمد اور ڈاکٹر نفیسہ اپنی بیٹی کے لیے پریشان تھے اور اس کوشش میں بھی تھے کہ کسی طرح سے وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئے اور اپنی ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد ان کے ذاتی اسپتال کی بھاگ دوڑ سنبھال کر زندگی کی نئی راہ پر رواں دواں ہوجائے۔

ڈاکٹر آفتاب شہر کا بہترین سرجن تھا۔ وہ دھیما بولتا تھا اور اس کا رویہ ایک عام آدمی سے لے کر متمول انسان تک ایک جیسا ہی تھا۔ اس کا اسپتال مہنگا اسپتال تھا جہاں بڑے بڑے لوگ اپنا علاج کراتے تھے لیکن اس کے باوجود اس نے عام لوگوں کے علاج معالجے کے لیے ایک حصہ مختص کیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی ڈاکٹر نفیسہ بھی متحمل مزاج خاتون تھی۔

فلک ایک ہنس مکھ لڑکی تھی۔ وہ زندگی کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہونا جانتی تھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ ہنستی تھی اور جو دل میں آتا، وہ کھاتی تھی۔ وہ اکثر فٹ پاتھ پر لگی چٹخارے دار ریڑھیوں سے بھی لے کر کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی اور اس کے ساتھ اس کی دوست بھی شامل ہوتی تھیں۔

اس ہنستی مسکراتی لڑکی کو اچانک ایک لڑکے سے محبت ہوگئی۔ اس کا نام منصور تھا اور وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم وچراغ بھی تھا۔ منصور کے والدین دولت میں فلک کے ماں باپ کے برابر تو نہیں لیکن اپنے بزنس میں وہ کامیاب اور اچھی زندگی گزار رہے تھے۔

فلک کی منصور سے اچانک ملاقات ہوئی تھی اور دونوں کی وہ پہلی ملاقات محبت میں بدل گئی تھی۔ فلک اور بھی زیادہ خوش رہنے لگی تھی۔ اس کے چہرے کی شگفتگی بھی بڑھ گئی تھی۔ منصور بھی ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ دونوں کے اسپتال الگ الگ تھے لیکن ان کی ملاقات ہر روز نہیں تو ہفتے میں دو بار ضرور ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک دوسرے کو فارغ اوقات میں فون پر میسج کرتے رہتے تھے۔

منصور نے فلک سے کہا تھا کہ اکیس تاریخ کو اس کی سالگرہ ہے اور وہ اسے اپنے گھر مدعو کرے گا اور سب گھر والوں سے اس کا تعارف کرائے گا۔ اس کے گھر والے تنگ نظر نہیں ہیں اس لیے وہ ان سے مل کر خوش ہوگی۔ فلک نے بھی سوچ لیا تھا کہ اس ملاقات کے بعد وہ بھی منصور کو اپنے والدین سے ملوائے گی۔ اکیس تاریخ آنے میں پانچ دن باقی تھے کہ اچانک منصور لاپتا ہوگیا۔

اس کا موبائل فون بند جانے لگا اور اس کا اتا پتا ایسا ہوگیا جیسے منصور سے فلک کبھی ملی ہی نہ ہو۔ بار بار کوشش کرنے کے بعد بھی جب منصور نہ ملا تو وہ پریشان ہوگئی۔

ایک دن وہ اس کے اسپتال چلی گئی جہاں وہ ہاؤس جاب کرتا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ تین دن سے منصور نہیں آرہا ہے۔ فلک اس کے کولیگ ڈاکٹرز کے رابطے میں رہنے لگی، ہر روز اس کو ایک ہی جواب ملتا کہ منصور کا کوئی پتا نہیں چل رہا ہے۔

اکیس تاریخ بھی گزر گئی اور اس کے بعد کئی دن مزید بیت گئے۔ فلک نے رابطہ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ اداس اور پریشان رہنے لگی۔ وہ اسے دن میں متعدد بار فون کرتی تھی

اور ہر بار اسے فون بند ہی ملتا تھا۔

فلک کے لیے وہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔ فلک کی زندگی بدل چکی تھی۔ ہر وقت ہنسنے کھیلنے والی لڑکی اچانک گم صم اور ارد گرد سے بے نیاز ہو گئی تھی۔

جب اُس کے والدین نے اس کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی، فلک کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ زندگی سے اس کی دلچسپی معدوم ہو گئی تھی۔ بہت کوشش کے بعد آخر کار ڈاکٹر نفیسہ جاننے میں کامیاب ہو ہی گئی کہ فلک کی اس حالت کے پیچھے کونسی وجہ پوشیدہ ہے۔

ڈاکٹر نفیسہ نے جب ڈاکٹر آفتاب کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔ ایک دن دونوں میاں بیوی نے فلک کو اپنے پاس بٹھایا اور سمجھانے لگے۔

''تم ہماری پیاری اور لاڈلی بیٹی ہو۔ تمہیں وہ لڑکا پسند آیا تھا تو ہمیں اسی وقت بتاتیں۔ ہم اس کے والدین سے ملتے، اور اس گھر میں آنے جانے کا راستہ کھل جاتا تو آج ہم خود اس حقیقت کو جاننے کے لیے ان کے پاس جاتے، اب ہم محض ان باتوں پر یقین کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے جو منصور کے ساتھ کام کرنے والے ڈاکٹرز نے تمہیں بتائی تھیں۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منصور نے جان بوجھ کر تم سے رشتہ توڑ لیا ہو۔'' ڈاکٹر نفیسہ نے اپنا اندیشہ بیان کیا۔

فلک جلدی سے بولی۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔''

''یہ تمہاری مما کا ایک خیال ہے۔ تم دوبارہ اپنے کام پر جاؤ۔ میں کچھ پتا کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے جلدی سے کہا۔

''آپ کیا کریں گے؟'' فلک نے ان کی طرف دیکھا۔

''میں کوشش کرتا ہوں کہ ان کے بارے میں یہ جان سکوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں اور اس کے بعد ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔'' ڈاکٹر آفتاب نے کہا۔

''آپ کیسے پتا کریں گے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہاری خوشی اور چاہ کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ بس تم وہ پہلے والی فلک بن جاؤ جو ہنستی اور مسکراتی تھی۔ جس کے گھر میں ہونے سے رونق ہوتی تھی اور ہمارے دل ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

فلک کے لیے فی الحال مسکرانا ممکن نہیں تھا۔ وہ اسی طرح چپ رہی۔ ڈاکٹر آفتاب اور نفیسہ نے فیصلہ کیا کہ کچھ دن وہ فلک کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔

کچھ دن مزید گزر گئے اور فلک ایک دن تیار ہو کر اسپتال چلی گئی۔ اس کے بعد اس کے معمول میں یہ فرق آ گیا کہ وہ اسپتال جاتی، اپنا کام کرتی اور گھر میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ فلک زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔ وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی لیکن اس کے چہرے کی مسکراہٹ واپس آ گئی تھی۔ تب ڈاکٹر آفتاب نے اپنے دوست کی فیملی کی دعوت کی تو ان کے بیٹے رضوان سے فلک کی ملاقات ہوئی۔

رضوان خود اور اس کا خاندان بھی ڈاکٹر تھا۔ وہ امیر ترین لوگ تھے۔ ڈاکٹر آفتاب سے ان کے گہرے مراسم تھے۔

فلک سے ملنے کے بعد رضوان کسی نہ کسی بہانے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ فلک کو بھی رضوان سے دلچسپی ہونے لگی۔ فلک کا ماضی گرد میں دفن ہونے لگا۔ اس کی زندگی بدل رہی تھی، اس کے باوجود وہ منصور کو اپنے دل سے نہیں نکال سکی تھی۔ اس کا دل رضوان کی طرف مائل ہوتا تھا لیکن منصور کا خیال بھی اس کو کھینچ کر اپنی طرف لے جاتا تھا۔

نومبر کی چمکدار دوپہر کے دو بجے تھے۔

فلک نے اپنا موبائل فون چارجنگ پر لگایا ہوا تھا۔ وہ خود کچھ دیر قبل اسپتال سے واپس آئی تھی اور فریش ہونے کے بعد تولیے سے چہرہ صاف کر رہی تھی کہ اس کے موبائل فون پر میسج ٹون بجی۔ اس نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا کیونکہ اس کی دوستوں اور رضوان کی طرف سے اسے میسج آتے رہتے تھے اور وہ تسلی سے فارغ ہو کر پڑھتی تھی۔

فلک نے تولیا ایک طرف رکھا تو دوبارہ میسج ٹون نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ موبائل فون کے پاس گئی اور اسے اُٹھا کر اس نے جونہی میسج بکس دیکھا، اس کے دل کی دھڑکن منتشر ہونے لگی۔ میسج منصور کی طرف سے تھا۔

پہلے میسج میں لکھا تھا۔ ''فلک، میں تمہارا منصور۔''

فلک نے جلدی سے دوسرا میسج پڑھا، لکھا تھا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں تم سے رابطہ نہیں کر سکا اور نہ ہی یہ بتا سکا میرے ساتھ کیا... ہوا تھا اور مجھے اچانک کیوں شہر چھوڑ کر جانا پڑا۔ اگر تم مجھے معاف کر دو تو میں اس وقت پرانے ڈاک خانے کے چھوٹے گیٹ کے پاس تمہارا منتظر ہوں۔''

میسج پڑھ کر فلک کے جسم میں بے چینی سی دوڑنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو گئی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں اور مضطرب وجود کے ساتھ میسج لکھا۔ ''کیا یہ تم ہی ہو منصور؟''

جواب آیا۔ ''میں منصور تم کو میسج کر رہا ہوں۔''

"تم کہاں تھے؟"

"یہ سب بتانے کے لیے تو تمہیں بلایا ہے۔ تم جتنی جلدی ہوسکے آجاؤ۔ میں سب بتاتا ہوں۔"

"میں ابھی نکل رہی ہوں۔" فلک نے عجلت میں میسج لکھا اور اس نے موبائل فون اسی جگہ رکھا، آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لیا اور جوتے نکال کر پہننے کے بعد اپنا پرس پکڑا، بے چین نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے چند ثانئے سوچا کہ وہ کوئی چیز بھول تو نہیں رہی ہے اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے دل و دماغ میں منصور سے ملنے کی چاہ شدید تھی۔

فلک نے اپنی گاڑی نکالی اور تیزی سے وہ پرانے ڈاک خانے کی طرف چلی گئی جو اس کے گھر سے کم از کم پانچ کلومیٹر دور تھا۔

☆☆☆

دوپہر کے تین بجے تھے جب ڈاکٹر آفتاب اور اس سے کچھ دیر بعد ڈاکٹر نفیسہ بھی آگئی تھی۔

ڈاکٹر آفتاب کو فلک کی گاڑی نہ دیکھ کر لگا تھا کہ وہ ابھی نہیں آئی۔ جب نفیسہ نے بھی اس کی گاڑی نہیں دیکھی تو کھانے کی میز تک جاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر آفتاب سے پوچھا۔

"فلک نہیں آئی؟"

"گاڑی تو اس کی موجود نہیں ہے۔" ڈاکٹر آفتاب نے سالن ڈالتے ہوئے کہا۔

نفیسہ کے قدم ڈائننگ ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے رک گئے اور اس کا رخ دروازے کی طرف ہوگیا۔ اس نے مین دروازہ کھول کر گیٹ پر موجود چوکیدار سے پوچھا۔

"فلک گھر آئی تھی؟"

"جی بیگم صاحبہ وہ آئی تھیں اور تھوڑی دیر کے بعد چلی گئی تھیں۔" چوکیدار نے جواب دیا۔

"کتنی دیر ہوئی ہے اسے گئے ہوئے؟" نفیسہ نے پوچھا۔

"ایک گھنٹا ہوگیا ہوگا۔" چوکیدار نے بتایا۔

چوکیدار کا جواب سن کر نفیسہ کے چہرے پر پریشانی سی ابھری۔ "وہ اکیلی تھی یا اس کی کوئی دوست ساتھ تھی؟"

"وہ اکیلی تھیں بیگم صاحبہ۔"

نفیسہ سوچتی ہوئی ڈائننگ ٹیبل پر آئی تو ڈاکٹر آفتاب نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا...... پریشان سی ہو؟"

"فلک آئی تھی اور ایک گھنٹا پہلے وہ کہیں چلی گئی تھی۔" نفیسہ نے جواب دیا۔

"اپنی کسی دوست کی طرف چلی گئی ہوگی، تم کھانا کھاؤ۔" ڈاکٹر آفتاب کے کہنے پر نفیسہ بھی کھانا کھانے لگیں۔

دونوں کھانے سے فارغ ہوکر کچھ دیر آرام کرتے تھے اور اس کے بعد شام کی چائے کے بعد وہ دوبارہ اسپتال چلے جاتے تھے۔ نفیسہ کو چین نہیں آرہا تھا۔ وہ کمرے میں جاکر فلک کو کال کرنے لگی۔ بیل جارہی تھی۔ نفیسہ نے جب تین، چار بار کال کی اور بیل جانے کے باوجود اس نے کال اٹینڈ نہیں کی تو نفیسہ کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

"فلک فون نہیں اٹھارہی۔ مجھے پریشانی ہورہی ہے۔"

"شاید وہ دوستوں کے ساتھ کہیں مصروف ہو۔" ڈاکٹر آفتاب بولا۔

نفیسہ ٹہلنے لگی اور دوبارہ کال کی۔ اس بار بھی جب کال اٹینڈ نہ ہوئی تو وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے میں گئی اور جونہی اس نے لائٹ جلا کر دیکھا کہ اس کا موبائل فون چارجنگ پر لگا ہوا ہے تو وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھی اور موبائل فون چارجنگ سے الگ کرکے اسے دیکھنا چاہا تو موبائل فون پر اسکرین لاک لگا ہوا تھا۔

نفیسہ واپس اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ "فلک کا موبائل فون اس کے کمرے میں تھا۔"

ڈاکٹر آفتاب لیٹ چکا تھا۔ نفیسہ کی بات سن کر وہ جلدی سے اٹھا۔ "موبائل فون اس کے کمرے میں تھا؟"

"وہ اچانک کہاں چلی گئی کہ اپنا موبائل فون لے جانا بھی بھول گئی۔" نفیسہ کی سوالیہ نگاہیں ڈاکٹر آفتاب کے چہرے پر تھیں۔

"اس کی کسی دوست کو کال کرو۔"

"اس کی ایک ہی دوست کا میرے پاس نمبر ہے۔"

نفیسہ نے اپنے موبائل فون سے اس کا نمبر نکال کر کال کی تو اس نے بتایا کہ وہ فلک کے اسپتال سے جانے کے پندرہ منٹ بعد خود بھی چلی گئی تھی۔ اور کسی دوست کی طرف کوئی پارٹی نہیں تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر آفتاب اور نفیسہ نے جہاں سے وہ معلوم کرسکتے تھے، فلک کے بارے میں معلوم کیا تو فلک ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں تھی۔

اس جواب نے دونوں میاں بیوی کو پریشان کردیا تھا۔ فلک کا موبائل فون لاک تھا اس لیے وہ کچھ جان نہیں سکتے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب اور نفیسہ کی پریشانی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اندھیرا گہرا ہوگیا تھا تو نفیسہ نے کہا۔ "اب کیا کریں؟"

"اب ایک ہی راستہ ہے۔" ڈاکٹر آفتاب پریشانی کے عالم میں بولا۔

"وہ کیا؟" نفیسہ نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"پولیس کو بتانا پڑے گا۔ وہی ہماری مدد کرسکتی ہے۔" ڈاکٹر آفتاب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

دونوں کے بیچ گہری خاموشی چھا گئی۔ نفیسہ نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔"ہم کچھ دیر مزید انتظار کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر آفتاب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان دونوں کے لیے ایک ایک لمحہ سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ اس دوران میں دونوں فلک کے بارے میں جس سے مزید پوچھ سکتے تھے، وہ بھی پوچھ لیا۔ ان کی پریشانی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

کچھ وقت مزید گزر گیا تھا۔ آخر کار دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پولیس سے رابطہ کرتے ہیں۔

☆☆☆

انسپکٹر جنید خان کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ وہ خوب صورت اور اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ جب وہ اس پیشے میں آیا تھا تو اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ اپنا کام ایمانداری سے کرے گا۔

ڈاکٹر آفتاب سے انسپکٹر جنید کا تعلق کچھ ماہ قبل بنا تھا جب اس کا باپ ایک بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر آفتاب کے اسپتال میں داخل ہوا تھا۔ وہاں علاج کے دوران دونوں میں اچھی گپ شپ ہوگئی تھی۔

جب ڈاکٹر آفتاب پولیس اسٹیشن پہنچا تو اس وقت انسپکٹر جنید کہیں جانے کی تیاری میں تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کو دیکھ کر وہ رک گیا اور دونوں کمرے میں چلے گئے۔ ڈاکٹر آفتاب نے جب اپنے آنے کی وجہ بتائی تو انسپکٹر جنید جس غیر اہم کام کے لیے جانے والا تھا، وہ ترک کردیا۔

"میری بیٹی فلک پچھلے چار، پانچ گھنٹوں سے لاپتا ہے۔" ڈاکٹر آفتاب نے بتایا۔

"مجھے اس کی تفصیل بتائیں۔" انسپکٹر جنید نے کاغذ اور پنسل سنبھال لی۔ ڈاکٹر آفتاب بتانے لگا اور انسپکٹر جنید اس کو لکھتا رہا۔ جب بات مکمل ہوگئی تو انسپکٹر نے فلک کے بارے میں چند سوالات کرنے کے بعد کہا۔"اس کا موبائل فون ہے آپ کے پاس؟"

"جی میں لے کر آیا ہوں۔" ڈاکٹر آفتاب نے کہتے ہوئے جیب سے فلک کا موبائل فون نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔"موبائل فون لاک ہے اس لیے ہم دیکھ نہیں سکے۔"

"میں اس کا لاک کھلوا لیتا ہوں۔" انسپکٹر جنید نے کہہ کر موبائل فون ایک طرف رکھ دیا۔"آپ مجھے یہ بتائیں کہ فلک کا آپ کے ساتھ کوئی جھگڑا، یا کوئی ایسی بات ہوئی ہو جس کی وجہ سے وہ کہیں چلی گئی ہو؟"

"ہم اس کے ساتھ دوستوں کی طرح تھے۔ اس کی کسی بات کو رد نہیں کرتے۔ وہ کوئی بھی بات ہم سے کہہ دیتی ہے اور ہم پوری کردیتے ہیں۔ ہم نے اپنی بیٹی کو روک ٹوک جیسی پابندی سے ہمیشہ آزاد رکھا ہے۔"

"آپ نے ابھی بتایا کہ آپ نے فلک کے بارے میں اس کے قریب رہنے والوں سے کسی نہ کسی بہانے سے دریافت کرلیا ہے۔ مجھے کچھ وقت دیں میں اس کا لاک کھلوا کر دیکھتا ہوں کہ فلک کو آخری کال کہاں سے آئی تھی تو اور کس نے کی تھی۔"

"جی آپ اچھی طرح سے تسلی کریں۔"

"آپ گھر جائیں میں آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔"

انسپکٹر جنید نے ڈاکٹر آفتاب کا فون نمبر لکھا اور وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

☆☆☆

فلک کے موبائل فون کی تفصیل انسپکٹر کے سامنے آگئی تھی۔ آخری کال جس نمبر سے آئی تھی، اس کا پتا بھی اس کے سامنے ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ وہ میسج اس نے اچھی طرح سے پڑھ لیے تھے۔

انسپکٹر جنید نے فلک کا موبائل فون جیب میں ڈالا اور اپنی گاڑی نکال کر پرانے ڈاک خانے کی طرف چلا گیا۔

اس ڈاک خانے کو دو سڑکیں لگتی تھیں۔ ڈاک خانے کے مین گیٹ کی طرف بارونق مارکیٹ تھی جبکہ دوسری طرف اس کا چھوٹا گیٹ تھا اور وہ سڑک تقریباً بے رونق رہتی تھی، کیونکہ اس کے سامنے اسکول کے عقب کی طویل دیوار تھی اور وہاں قریب کوئی دکان اور مارکیٹ نہیں تھی وہ محض ایک سڑک تھی۔ جس پر لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔

ڈاک خانے کے چھوٹے گیٹ سے کچھ آگے ایک پان شاپ تھی۔ اور اس سے کچھ ہی قدموں پر بازار شروع ہوجاتا تھا۔

انسپکٹر نے رک کر اردگرد کا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور چلتا ہوا پان شاپ کی طرف چلا گیا۔ اس وقت وہاں موجود لڑکا ایک گاہک کو پان اور سگریٹ دے رہا تھا۔ اس جگہ سے بھی اس نے دیکھا کہ ڈاک خانے کا چھوٹا گیٹ واضح دیکھا جاسکتا تھا۔ انسپکٹر اس وقت پولیس وردی میں نہیں تھا۔ اس نے جاکر پہلے سگریٹ لیا اور اسے سلگاتے

ہوئے بولا۔ ”سارا دن تم ہی دکان پر ہوتے ہو یا تمہاری ڈیوٹی اب شروع ہوئی ہے۔“

”اب میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ بڑا بھائی آنے والا ہے اور رات کو وہی ہوتا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”آج دوپہر کے بعد ڈاک خانے کے چھوٹے گیٹ کے پاس سفید کار دیکھی تھی تم نے؟ اس جگہ کھڑی ہو؟“ انسپکٹر جنید نے پوچھا تو اس نے مشکوک سے نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا نام انسپکٹر جنید ہے۔“

وہ ایک دم مسکرایا۔ ”ایک گاڑی رکی تھی اس جگہ۔ دس، پندرہ منٹ رکی رہی۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی باہر نکلی اور کسی کو جیسے تلاش کر رہی ہو اس نے دائیں بائیں دیکھا اچانک اس نے اس جانب دیکھا تو وہ جلدی سے کار میں بیٹھی اور میری دکان کے سامنے سے گزر کر چلی گئی۔“

”اس طرف کون تھا؟“

”میں نے دیکھا نہیں۔ لیکن میرا اندازہ تھا کہ کسی نے اس لڑکی کو اشارہ کر کے بلایا ہوگا۔“ لڑکے نے بتایا تو انسپکٹر جنید نے اس طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ لڑکے کا خیال ٹھیک ہی ہوگا۔

”کچھ اور دیکھا تھا تم نے؟“

”نہیں سر...... وہ بھی کام کرتے ہوئے میری نظر اس طرف چلی گئی تھی۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

انسپکٹر جنید نے اس جگہ کھڑا ہو کر سامنے کا جائزہ لیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ایک بات تو صاف ہو گئی تھی کہ فلک اس جگہ آئی تھی اور جس نے بلایا تھا، وہ بھی موجود تھا۔

انسپکٹر نے ڈاکٹر آفتاب کو کال کی تو اس نے پہلی ہی بیل پر رابطہ کر لیا۔ اس کی بے چین سے آواز آئی ”جی انسپکٹر صاحب کچھ پتا چلا؟“

”ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ منصور کون ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”منصور......؟“ نام سنتے ہی ڈاکٹر آفتاب سوچنے لگا۔ قریب بیٹھی نفیسہ نے آہستہ سے بتایا تو ڈاکٹر آفتاب بولا۔ ”یہ وہ لڑکا تھا جسے فلک پسند کرتی تھی۔“

”آپ کبھی ملے منصور سے؟“

”نہیں...... کیوں خیریت ہے؟“ ڈاکٹر آفتاب نے پریشانی سے پوچھا۔

”میں تھوڑی دیر میں آپ کے پاس حاضر ہوتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ تسلی دینے کے بعد انسپکٹر جنید نے کال منقطع کر دی اور جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ اس پر منصور کے گھر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔

انسپکٹر جنید جب اس علاقے میں پہنچا تو اسے وہ گھر تلاش کرنے میں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ایک کشادہ گلی میں وہ بڑا گھر تھا۔ گیٹ کے ساتھ نیم پلیٹ لگی تھی جس پر نصیر احمد لکھا ہوا تھا۔ انسپکٹر جنید نے بیل دی تو تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے دروازہ کھولا۔ انسپکٹر جنید نے کہا۔ ”نصیر صاحب گھر پر ہیں؟“

”آپ کون؟“ اس نے پوچھا۔

”انہیں بتاؤ کہ جنید خان آیا ہے۔“ انسپکٹر نے کہا تو وہ گیٹ بند کر کے چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ملازم نے تھوڑا سا گیٹ کھولا اور کہا۔

”وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی جنید خان کو نہیں جانتے۔“

”انہیں بتاؤ انسپکٹر جنید خان ملنا چاہتا ہے۔“ یہ سنتے ہی وہ ملازم پھر چلا گیا۔ اس بار آیا تو وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ دوسرے لمحے دروازہ کھلا اور ایک ساٹھ سال کی عمر کا شخص داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی اور آنکھوں میں سوال تھا۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔

”جی فرمائیے۔“ نصیر احمد کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ جاننا چاہتا ہے۔

”آپ نصیر احمد ہیں؟“ انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

”جی۔“ نصیر احمد کا سوالیہ چہرہ ابھی تک انسپکٹر جنید کی طرف متوجہ تھا۔

”منصور بھی اسی گھر میں رہتا ہے؟“ انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

نصیر احمد چونکا اور اس کے چہرے پر کرب ابھر آیا۔

”آپ کے پاس منصور کی کوئی خبر ہے؟“

”خبر...... مطلب......؟“ انسپکٹر نے متحیر نظروں سے نصیر احمد کا چہرہ دیکھا۔

نصیر بولا۔ ”میرے بیٹے منصور کو چھ ماہ قبل اغوا کر لیا گیا تھا۔ مجھ سے اس کا تاوان مانگا گیا اور جب میں تاوان دینے کے لیے تیار ہو گیا تو اچانک ان سے رابطہ ختم ہو گیا۔ فون بند ہو گیا اور اس کے بعد آج تک یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ منصور کہاں ہے......“ نصیر احمد کی آواز میں دکھ تھا اور آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔

انسپکٹر جنید کو اس کی بات سن کر حیرت کا جھٹکا لگا۔

”آپ نے پولیس کو اطلاع دی تھی؟“

”میرے پاس سب کچھ محفوظ ہے۔ جس نمبر سے مجھے کال آتی تھی، پولیس نے اس نمبر کو ٹریس کرنے کی پوری کوشش کی تھی...... ہر کوشش کے باوجود منصور اور اسے اغوا

کرنے والوں کا کوئی پتا نہیں چلا اور اب آپ کے آنے سے میرے اندر امید جاگ گئی کہ شاید آپ کوئی خبر لے کر آئے ہیں۔'' نصیر احمد بولا۔

''آپ کے پاس ایف آئی آر کی کاپی ہے؟'' انسپکٹر جنید نے کہا تو تھوڑی دیر کے بعد نصیر احمد کا ملازم ایک فائل لے آیا۔

انسپکٹر جنید اس فائل کو پڑھنے لگا۔ جس نمبر سے نصیر احمد کو کال آئی تھی، وہ نمبر انسپکٹر نے نوٹ کرلیا تھا۔ فائل ایک طرف رکھنے کے بعد انسپکٹر نے نصیر احمد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے علم میں تھا کہ آپ کا بیٹا فلک نام کی لڑکی کو پسند کرتا؟''

''ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' اس کی بات سن کر نصیر احمد نے نفی میں گردن ہلائی۔

''جب منصور کا اغوا ہوا تھا تو اس کا موبائل فون اسی کے پاس تھا؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''جی...... موبائل فون اسی کے پاس تھا۔ شروع میں مجھے آنے والی کال اسی کے نمبر سے آئی تھی۔''

''آپ نے کبھی منصور کے نمبر پر دوبارہ کال کی؟''

''میں چھ ماہ سے بلا ناغہ اس کے نمبر پر کال کرتا ہوں اور ہر بار وہ نمبر بند ملتا ہے۔'' نصیر احمد اپنے آنسو ضبط کرتا ہوا بولا۔

انسپکٹر جنید سوچنے لگا۔ نصیر احمد بولا۔ ''آپ نے فلک کا ذکر کیا تھا؟''

انسپکٹر جنید چونکا۔ ''ہاں...... فلک اور منصور ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ فلک شہر کے معروف ڈاکٹر آفتاب کی بیٹی ہے...... چھ ماہ کے بعد اچانک فلک کو ایک میسج آتا ہے اور میسج میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ اس سے ملے۔ فلک اس سے ملنے جاتی ہے اور آج دوپہر سے وہ بھی لاپتا ہے۔''

''میسج کس نے کیا تھا؟''

''میسج منصور کے موبائل نمبر سے کیا گیا تھا۔'' انسپکٹر جنید کے انکشاف پر نصیر احمد چونکا اور اس کی آنکھوں کی چمک دو چند ہوگئی۔

''منصور نے میسج کیا تھا؟'' نصیر احمد کے پاس بولنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

''لیکن اس نمبر پر میں کئی بار کوشش کر چکا ہوں۔ وہ بند مل رہا ہے۔'' انسپکٹر جنید نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب آپ کیا سمجھتے ہیں...... منصور اور وہ لڑکی فلک ایک دوسرے کے رابطے میں تھے؟''

''فلک جاتے ہوئے اپنا موبائل فون چارجنگ پر بھول گئی۔ اس لیے میں نے اس کا موبائل فون چیک کیا۔ پچھلے چھ ماہ سے منصور کی طرف سے فلک کو کوئی کال نہیں آئی تھی۔ فلک نے کئی کالز کی تھیں جو اٹینڈ نہیں ہوئی تھیں۔'' انسپکٹر جنید نے بتایا۔

''اگر فلک کو منصور کا میسج آیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ منصور نے ہی اسے میسج کیا تھا اور وہ کہیں موجود ہے؟''

''ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے نصیر صاحب۔'' انسپکٹر جنید سوچتے ہوئے بولا۔ ''فلک جب سے گئی ہے، وہ بھی لاپتا ہے۔'' اچانک انسپکٹر جنید کا موبائل بجنے لگا۔ دوسری طرف اس کا نائب بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ فلک کی کار مل گئی ہے۔

کال منقطع کرنے کے بعد انسپکٹر جنید نے نصیر کے پریشان چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جس کار میں فلک گئی تھی وہ مل گئی ہے۔ میں چلتا ہوں آپ سے رابطہ رہے گا۔''

جانے سے قبل انسپکٹر جنید نے منصور کی تصویر اپنے موبائل فون میں محفوظ کرلی تھی۔

☆☆☆

شہر سے تقریباً بیس کلومیٹر کی دوری پر اور سڑک سے آدھا کلومیٹر اندر کی طرف وہ ایک ویران جگہ تھی۔ وہاں فلک کی کار ترچھی کھڑی تھی۔

انسپکٹر جنید کے نائب نوید کے ذمے فلک کی کار کی تلاش تھی۔ وہ ہر اس جگہ گیا جہاں کیمرے لگے تھے۔ وہ کار کسی کیمرے کی زد میں نہیں آئی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا کہ وہ کار ان شاہراہوں پر گئی ہی نہیں جہاں کیمرے نصب تھے۔

نوید ایک جگہ کھڑا تھا جب ایک گدھا گاڑی اس کے قریب رکی۔ گدھا گاڑی والے نے کہا۔ ''جناب صاحب بہادر...... یہ آگے ایک پتلی سی سڑک اندر کو جاتی ہے۔ اس سے آگے میری رہائش ہے۔ کئی گھنٹوں سے وہاں ایک کار کھڑی ہے۔''

یہ سنتے ہی نوید چونکا۔ وہ اسی وقت اپنی بائیک پر سوار ہوا اور اس جگہ پہنچ گیا۔ سامنے فلک کی گاڑی موجود تھی۔

انسپکٹر جنید بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار اس جگہ پہنچا۔ کار کا نمبر وہی تھا جو ڈاکٹر آفتاب نے لکھوایا تھا۔ اس جگہ سے آگے روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہاں آبادی تھی جبکہ جس جگہ وہ گاڑی کھڑی تھی، وہ ویران تھی۔

انسپکٹر جنید نے دروازہ کھولنا چاہا تو وہ کھل گیا۔ چابی اندر لگی ہوئی تھی۔ انسپکٹر جنید نے ٹارچ کی مدد سے گاڑی کو اندر سے بغور دیکھا، پچھلی سیٹ پر فلک کا پرس پڑا تھا۔

انسپکٹر جنید نے پرس اُٹھا کر کھولا، اندر سے ٹشو پیپر، لپ اسٹک، کچھ پیسے اور ایک سونے کی رنگ تھی۔ ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد سب کچھ دوبارہ پرس کے اندر رکھا اور نوید کے حوالے کر دیا۔

گاڑی کی ڈکی کھولی تو وہ خالی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں انسپکٹر جنید اور نوید بغور ہر چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ ڈکی بند کرنے کے بعد انسپکٹر جنید نے پوچھا۔ ''تم کو کیسے پتا چلا یہ گاڑی یہاں ہے؟''

''میں پیچھے کھڑا تھا کہ ایک گدھا گاڑی والا وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے بتا کر گیا تھا۔''

''وہ اسی جگہ کا رہائشی ہے؟''

''اس نے بتایا تو یہی تھا۔''

''تم کال کر کے کسی کو بلاؤ اور گاڑی پولیس اسٹیشن لے جاؤ۔'' انسپکٹر جنید کہتا ہوا آبادی کی طرف دیکھنے لگا۔ تب تک نوید کسی کو کال کرنے لگا۔ وہ کال کرنے سے فارغ ہوا تو انسپکٹر جنید نے کہا۔ ''جس گدھا گاڑی والے نے تم کو کار کے بارے میں بتایا تھا وہ اگر اسی جگہ کا رہائشی ہوا تو وہ واپس ضرور آئے گا، ہمیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''تب تک گاڑی لینے والے بھی آجائیں گے۔'' نوید نے کہا۔ دونوں فلک کی گاڑی میں ہی بیٹھ گئے۔ انسپکٹر جنید نے اندر روشنی کی ہوئی تھی اور وہ گاڑی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک گاڑی کے بریک کے پاس اسے قمیص کا ٹوٹا ہوا بٹن دکھائی دیا۔ انسپکٹر جنید نے جھک کر وہ بٹن اُٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ عام سا بٹن تھا۔ وہ بٹن نوید کی طرف بڑھا کر بولا۔ ''ذرا غور سے دیکھو، اس بٹن میں کوئی خاص بات ہے؟''

نوید اس بٹن کو لے کر غور سے دیکھتا رہا۔ ''یہ ایک عام سا نیلے رنگ کا بٹن ہے۔''

اسے کچھ خاص دکھائی نہیں دیا تو انسپکٹر جنید نے وہ بٹن لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس دوران وہ گدھا گاڑی والا آگیا۔ دونوں باہر نکلے اور اسے روک لیا۔

''تم اسی جگہ رہتے ہو؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''وہ سامنے میرا گھر ہے۔'' اس نے بتایا۔

''یہ گاڑی جب یہاں آئی تھی تو تم کہاں تھے؟'' انسپکٹر جنید نے سوال کیا۔

''میں اس جگہ گھاس کاٹ رہا تھا۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کر کے بتایا۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ''گاڑی اس جگہ رکی اور ایک آدمی باہر نکلا۔ اس نے سگریٹ جلایا، اس کے کش لیتا رہا اور اس کے بعد وہ واپس پیدل چلا گیا۔''

''اس آدمی کا حلیہ بتا سکتے ہو۔'' انسپکٹر جنید نے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کا چہرہ زیادہ تر دوسری طرف ہی رہا تھا۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ لیکن جتنا دیکھ سکا بتاتا ہوں۔ اس کے چہرے پر بڑی مونچھیں اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے کالے رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور......'' وہ سوچنے لگا۔ ''بس اتنا ہی دیکھا تھا۔''

انسپکٹر جنید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ اور بھی ہے تو مجھے سوچ کر بتاؤ۔''

''اور کچھ نہیں ہے۔ میں بس اتنا ہی جانتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا وقت ہوگا جب وہ گاڑی یہاں چھوڑ کر گیا تھا؟''

''اس آدمی کے جانے کے بعد جب گھاس کاٹ کر میں اپنے گھر پہنچا تو اس وقت سوا چار بجے تھے۔''

''جب وہ آدمی گیا تھا تو تم کتنی دیر کے بعد گھر گئے تھے؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''یہی کوئی دس، پندرہ منٹ کے بعد میں چلا گیا تھا۔ گدھا گاڑی پر مجھے یہاں سے گھر جاتے ہوئے دس منٹ لگتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہوا کہ وہ تقریباً پونے چار بجے گاڑی چھوڑ کر گیا تھا۔'' انسپکٹر جنید سوچتے ہوئے بولا۔ اس نے گدھا گاڑی والے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''اگر تم سے دوبارہ ملنا ہو تو تم کہاں ملو گے؟''

''سامنے جو آبادی ہے وہاں میرے گھر میں کریانہ کی دکان بھی ہے۔ کاکا کریانہ اسٹور کے نام سے مشہور ہے۔ میں کسی کام سے گیا ہوتا ہوں تو میری بیوی وہاں بیٹھتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام امتیاز ہے۔''

اس دوران ایک پولیس وین آگئی۔ انسپکٹر جنید نے ریڑھی والے کا شکریہ ادا کیا اور وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گاڑی اس جگہ سے لے گئے اور وہ جگہ کچھ ہی دیر میں ویران ہوگئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر آفتاب اور نفیسہ گم صم بیٹھے تھے۔ اُن کے سامنے فلک کا وہ پرس تھا جو اس کی گاڑی سے برآمد ہوا تھا۔

ان دونوں کے سامنے انسپکٹر جنید بیٹھا تھا۔ وہ ان کو ساری صورت حال سے آگاہ کر چکا تھا۔

''آپ لوگوں نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ منصور نام کا لڑکا اور فلک ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔'' انسپکٹر جنید نے کہہ کر دونوں کا جائزہ لیا۔

''منصور چھ ماہ سے لاپتا ہے۔ چھ ماہ کے بعد اس کے موبائل فون سے فلک کو میسج آیا اور فلک اس سے ملنے چلی گئی اور خود بھی لاپتا ہو گئی۔'' انسپکٹر جنید بولتا ہوا کچھ دیر کے لیے چپ ہوا اور بولا۔ ''جس حلیے کا شخص فلک کی گاڑی ویران جگہ چھوڑ کر گیا، اس کی شکل منصور سے نہیں ملتی۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ جن لوگوں نے منصور کو اغوا کیا تھا انہوں نے ہی فلک کو بھی بہانے سے بلا کر اغوا کر لیا ہو؟'' ڈاکٹر آفتاب ایک دم سے بولا۔

''چھ ماہ بعد وہ لوگ فلک کو کیوں اغوا کریں گے جبکہ منصور کو اغوا کرنے والے بھی غائب ہیں۔'' انسپکٹر جنید نے دونوں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''ممکن ہے کہ چھ ماہ پہلے منصور کا لاپتا ہونا ایک ڈراما ہو؟'' نفیسہ بولی۔

''وہ ایسا ڈراما کیوں کرے گا؟''

''یہ بات آپ اُس کے والدین سے پوچھیں۔''

''میں ان سے بہت کچھ پوچھ چکا ہوں۔ ان کے کیس کی فائل پڑھ لی ہے۔ میرا نائب نوید بتا رہا تھا کہ اس نے ریکارڈ دیکھا ہے۔ چھ ماہ قبل جب منصور اغوا ہوا تھا اس وقت اخبارات میں ایک خبر چھپی تھی کہ ایک جرائم پیشہ گروہ نے آپس میں اُلجھ کر ایک دوسرے پر حملہ کر دیا تھا۔ اس میں کچھ مارے گئے تھے اور کچھ فرار ہو گئے تھے۔'' انسپکٹر جنید بولا۔

''ہو سکتا ہے کہ منصور بچ گیا ہو اور کہیں روپوش ہو گیا ہو۔ دوبارہ منظر پر آکر اس نے فلک کو میسج کیا اور فلک اس کے پیچھے پاگلوں کی طرح بھاگ کھڑی ہوئی۔'' ڈاکٹر آفتاب کو فلک کی اس بے وقوفی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

''ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ میں اس کیس کو حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ابھی میں چلتا ہوں۔'' انسپکٹر جنید کھڑا ہو گیا۔

''انسپکٹر صاحب ہم بہت پریشان ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے آپ ہماری لاپتا بیٹی کو تلاش کر دیں۔'' ڈاکٹر آفتاب کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

''میں کوشش کر رہا ہوں۔'' انسپکٹر جنید جانے لگا تھا کہ رک گیا۔ ''ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی پوچھیں۔'' ڈاکٹر آفتاب چونکا۔

''مس فلک کی کہیں منگنی ہوئی تھی، یا کہیں کوئی بات چل رہی ہو؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''میرے ایک ڈاکٹر دوست ہیں، ان کا ڈاکٹر بیٹا ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم فلک کی شادی اُس سے کر دیں۔'' ڈاکٹر آفتاب نے بتایا۔

''کیا نام ہے اُس لڑکے کا؟''

''اس کا نام رضوان ہے۔''

''اس کا کوئی پتا بتا سکتے ہیں؟'' انسپکٹر جنید نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر آفتاب اور نفیسہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے بعد نفیسہ نے کہا۔ ''ہم فلک کے لاپتا ہونے کی خبر اُن تک پہنچانا نہیں چاہتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں کیا کیا مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میری طرف سے ان کے کان میں بھنک بھی نہیں پڑے گی۔ مجھے ان کا پتا بتا دیں۔'' انسپکٹر جنید نے تسلی دی تو ڈاکٹر آفتاب نے ان کا پتا اسے بتا دیا۔

انسپکٹر جنید ان سے اجازت لے کر اپنے گھر پہنچا تو اس کی بیوی فاخرہ اس وقت جاگ رہی تھی۔

انسپکٹر جنید اور فاخرہ نے ایک دوسرے سے محبت کی شادی کی تھی۔ دونوں خوشگوار زندگی گزار رہے تھے اور فاخرہ ایک بڑے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام پر چلے جاتے تھے اور گھر کے دروازے پر تالا لگ جاتا تھا۔ دونوں کے پاس اپنی اپنی چابی تھی۔

فاخرہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے شام تک واپس آجاتی تھی اور پھر گھر کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ البتہ انسپکٹر جنید کے آنے کا کوئی مخصوص وقت نہیں تھا۔

''کھانا لگا دوں؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''تم نے کھا لیا؟'' انسپکٹر جنید نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں کام میں مصروف تھی اس لیے ابھی نہیں کھایا۔'' فاخرہ مسکرائی۔

''میں جب بھی دیر سے آتا ہوں تم ایسا ہی کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتی ہو۔ جبکہ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ تم کھانا کھا لیا کرو۔''

''تم فریش ہو جاؤ، میں کھانا لگاتی ہوں۔'' فاخرہ نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ انسپکٹر جنید مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ فاخرہ اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتی۔

باتھ روم میں جانے سے پہلے انسپکٹر جنید نے شرٹ

اتاری اور پینٹ کی جیب میں جونہی ہاتھ گیا اس کے ہاتھ میں وہ بٹن آگیا۔ اس نے بٹن کو دیکھا اور موبائل فون نکال کر نوید کو کال کرنے کے بعد بولا۔ ''تم ایسا کرنا آج رات اسے اپنے مہمان خانے میں لے آنا۔ صبح اس سے ملاقات کروں گا۔''

دوسری طرف سے نوید کی آواز اُبھری۔ ''جی بہتر۔''

انسپکٹر جنید نے بٹن پینٹ کی جیب میں رکھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ کمرے کے دروازے کے نیچے سے کوئی سایہ دوسری طرف گیا جیسے کسی نے دروازے کے ساتھ لگ کر کچھ سننے کی کوشش کی ہو......

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک دم چونکا۔ اس نے خالی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا۔ اسے دائیں بائیں دیواریں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کا دھیان اوپر کی طرف گیا تو چھت پر ایک پنکھا لٹک رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

وہ ایک چھوٹا کمرا تھا۔ کمرے کا اکلوتا دروازہ بند تھا اور وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا اور اسے...... کھولنا چاہا، وہ باہر سے مقفل تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی مترشح تھی۔

اسے یاد آیا کہ رات کو اس کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ اس نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا تھا کہ کون ہے اور باہر سے کسی نے بتایا تھا کہ آپ کے مہمان آئے ہیں۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا تھا تو کسی نے اس پر کپڑا ڈال کر اس کی کسی رگ کو دبا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ اس کمرے میں تھا۔

وہ ابھی رات کو پیش آنے والا واقعہ یاد ہی کر رہا تھا کہ دروازے کے پاس آہٹ ہوئی تو وہ فوری اس طرف متوجہ ہو گیا۔

دروازہ کھلا۔ پہلے نوید اور اس کے پیچھے انسپکٹر جنید داخل ہوا تو ان دونوں کو دیکھ کر وہ بولا۔ ''اچھا ہوا آپ آگئے ہیں۔ رات مجھے کوئی بے ہوش کر کے یہاں لے آیا تھا۔ میں نے آپ کو اس گاڑی کی اطلاع دی تھی شاید آپ لوگوں کو اطلاع دینا کسی کو اچھا نہیں لگا تھا۔''

انسپکٹر جنید اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''ہمیں اچھا لگا تھا کہ تم نے ہمیں اس گاڑی کے بارے میں بتایا تھا۔ تم کو کوئی اور نہیں بلکہ میرے کہنے پر تمہیں یہاں لایا گیا تھا۔''

''کیوں جناب...... مجھے کیوں یہاں لائے ہیں آپ؟ میں نے کوئی غلطی کر دی تھی؟'' اس نے حیرت سے دونوں کی طرف دیکھا۔

''تم نے اپنا نام امتیاز بتایا تھا؟'' انسپکٹر جنید یاد کرتے ہوئے بولا۔

''جی میرا نام امتیاز ہی ہے۔''

''جانتے ہو میرے کہنے پر یہ بندہ تم کو یہاں کیوں لایا ہے؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم صاحب۔''

''تم کو اس لیے یہاں لایا گیا ہے تاکہ ہم تم سے ایک سچ جان سکیں۔ تم اگر سچ بتا دو گے تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''کونسا سچ جاننا چاہتے ہیں آپ؟'' امتیاز نے ایک بار پھر دونوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''وہ گاڑی جس کے بارے میں تم نے نوید کو اطلاع دی تھی، اس گاڑی کو تم وہاں تک لائے تھے؟''

''مجھے تو صرف گدھا گاڑی چلانی آتی ہے میں......''

اس نے کہنا چاہا تو انسپکٹر جنید نے اس کی بات کاٹی اور متانت سے بولا۔

''سچ بات کرو۔ اس گاڑی کو تم وہاں تک لائے تھے؟''

''نہیں......''

''آخری بار پوچھ رہا ہوں اس کے بعد تم سے دوسرے طریقے سے نوید پوچھے گا...... گاڑی تم لائے تھے وہاں تک؟'' انسپکٹر جنید کا لہجہ درشت ہو گیا۔ امتیاز اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ انسپکٹر جنید کے چہرے کے تیور ایسے خطرناک ہو گئے تھے کہ اس کا دل کانپ گیا۔

''جی...... جی میں ہی لے کر آیا تھا'' خاموشی کے بعد اس نے اقرار کر لیا۔

انسپکٹر جنید بولا۔ ''اب مجھے ساری تفصیل بتا دو۔ تم اس گاڑی کو کہاں سے لائے تھے، اس گاڑی کی مالکن کہاں ہے؟''

امتیاز جلدی سے بولا۔ ''مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ گاڑی کس کی ہے۔ مجھے تو صابر نے کال کی تھی کہ ایک گاڑی لے جاؤ۔''

''صابر کون ہے؟''

''وہ اُلٹے سیدھے کام کرتا ہے۔''

''تیرا اس سے کیا تعلق ہے؟'' انسپکٹر جنید کی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اس نے ایک لمحے کے لیے انسپکٹر جنید کا چہرہ دیکھا۔

''مجھے وہ کوئی نہ کوئی کام کہہ دیا کرتا ہے اور میں وہ کر دیتا ہوں۔

"پیسے دیتا ہے تجھے؟"

"ہاں...... جی۔"

"صابر نے تجھے کہاں بلایا تھا؟" انسپکٹر جنید نے سوال کیا۔

"روز ہوٹل کے پاس بلایا تھا۔ میں پہنچا، اس نے وہ گاڑی میرے حوالے کی اور کہا اسے کسی ویرانے میں چھوڑ دینا۔ میں گاڑی اس جگہ لے آیا اور جب اپنی گدھا گاڑی پر نکلا تو مجھے یہ صاحب نظر آ گئے۔ میں نے ان کو بتا دیا۔"

"صابر کے ساتھ کب سے کام کر رہے ہو؟"

"ڈیڑھ، دو سال ہو گئے ہیں۔"

"کیا کیا کام کیا ہے اس کے ساتھ؟"

"کبھی کسی بے ہوش آدمی کو اس کے کہنے پر کہیں پھینک آتا تھا کبھی کوئی پیکٹ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتا تھا۔"

انسپکٹر جنید نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پھنکارتی آواز میں پوچھا۔ "صابر کے کہنے پر کبھی کسی کی لاش کو ٹھکانے لگایا ہے؟"

"نہیں جی...... بالکل نہیں جی۔" اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"صابر کا حلیہ بتاؤ اور یہ بتاؤ کہ وہ اس وقت کہاں ملے گا؟" انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟" امتیاز نے پوچھا۔

انسپکٹر جنید نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "صبح کے پونے دس بجے ہیں۔"

"اس وقت وہ گھر پر سو رہا ہوگا۔ اس کی خاص نشانی یہ ہے کہ اس کے ماتھے پر کم از کم تین انچ لمبا زخم کا نشان ہے......"

اس کے بعد امتیاز نے اس کا حلیہ اور گھر کا پتا بتا دیا۔

انسپکٹر جنید نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ایک بازو کی چڑھی ہوئی آستین نیچے کر کے اپنی جیب سے بٹن نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بٹن اپنی قمیص کے بازو پر ٹانک لینا، گاڑی میں رہ گیا تھا۔"

امتیاز نے چونک کر بٹن کی طرف دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے جو قمیص پہنی ہوئی تھی، اس کے بازو کا بٹن لٹک رہا تھا اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے یہ ٹوٹ کر نیچے گرا تھا، اسے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

جب انسپکٹر جنید کو وہ بٹن گاڑی میں ملا تھا اور جونہی اس کا سامنا امتیاز سے ہوا تھا تو اس نے اس بٹن کے رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی اور اس کے بازو کا بٹن بھی نہیں تھا۔

انسپکٹر جنید اسی وقت بھانپ گیا تھا۔

انسپکٹر جنید نے نوید کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اسے ابھی اپنا مہمان رکھنا ہے۔ میرے ساتھ چلو، صابر کو دیکھتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔"

"صاحب...... میں نے سچ بتا دیا ہے، مجھے اب چھوڑ دیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

انسپکٹر جنید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ابھی تم سے ایک چیز اور بھی پوچھنی ہے اور وہ صابر کو پکڑنے کے بعد پوچھوں گا۔"

امتیاز اس کی بات سن کر کشمکش و پیچ سے دیکھتا رہ گیا جبکہ وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

انسپکٹر جنید اور نوید اس محلے میں پہنچ گئے جس کا پتا امتیاز نے بتایا تھا۔ اس نے اس گلی اور جس مکان میں صابر رہتا تھا، وہ نشانیاں صحیح بتائی تھیں۔ نوید نے اس گلی کے نکڑ میں ایک کریانے کی دکان والے سے صابر کے گھر کی تصدیق بھی کر لی تھی۔

وہ دونوں اس کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ اس وقت گلی میں زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ انسپکٹر جنید کے اشارہ کرنے پر نوید نے دروازے پر لگی بیل بجائی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔

دوبارہ بیل دی تو تھوڑی دیر بعد کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ دونوں مستعد ہو کر کھڑے ہو گئے۔ جونہی دروازہ کھلا، خمار آلود آنکھوں سے صابر نے انسپکٹر جنید کی طرف دیکھا، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دینا چاہا۔

نوید نے ایک دم اپنا پیر دروازے میں اڑا دیا اور دونوں ہاتھوں کے دباؤ سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کو ناکام بنایا تو انسپکٹر جنید نے پوری قوت سے دروازہ اندر کی طرف دھکیل دیا۔

صابر کے لیے دروازہ بند کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بھاگا تو وہ دونوں بھی اندر چلے گئے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے ہی والا تھا کہ نوید نے اس کی ٹانگ کو اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں لے لیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن انسپکٹر جنید اس کو دبوچ چکا تھا۔

"تم ہو صابر...... ہم تو پہلے بھی مل چکے ہیں۔" انسپکٹر [جنید] اور نوید نے اسے ایک طرف بٹھایا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کی طرف نوید نے رسی سے باندھ دیا۔

صابر کچھ بولنے کے بجائے محض اس کو دیکھتا رہا۔ انسپکٹر جنید نے جھک کر اس کی قمیص کا کالر پکڑا اور اسے جھٹکا دے کر بولا۔ ''یاد ہے کہ ہم پہلے کہاں مل چکے ہیں؟''

''مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔'' اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''میں تم کو سب یاد کرا دوں گا۔ ابھی تم ہمارے ساتھ چلو۔''

''مجھے کس خوشی میں ساتھ لے جا رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟'' صابر کے لہجے میں پختگی ایسی تھی جیسے وہ ایک شریف اور بے گناہ شہری ہو۔

''چلو یہیں پوچھ لیتے ہیں......'' انسپکٹر جنید نے ایک دوسری کرسی اُٹھائی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''فلک کہاں ہے؟''

''کون فلک؟'' اس نے انسپکٹر جنید کی آنکھوں میں دیکھا۔

''وہ فلک جس کی گاڑی کو تم نے امتیاز کے حوالے کیا تھا کہ وہ اسے کسی ویرانے میں چھوڑ آئے۔''

''کس امتیاز کی بات کر رہے ہو انسپکٹر صاحب؟ میں کسی امتیاز اور فلک کو نہیں جانتا، اور یہ گاڑی کا کیا قصہ ہے جو آپ مجھے سنا رہے ہیں؟'' صابر پُراعتماد لہجے میں انجان بن کر بول رہا تھا۔

انسپکٹر جنید اور نوید نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے وہ دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اس کے پُراعتماد لہجے کی داد دے رہے ہوں۔

''تم ایک عادی مجرم ہو۔ آسانی سے تھوڑی بتاؤ گے۔ تمہاری خدمت کریں گے تو تم بولو گے۔''

انسپکٹر جنید کی بات سن کر صابر مسکرایا۔ ''انسپکٹر صاحب میرے ساتھ کچھ بھی کرنے سے پہلے سوچ سمجھ لیجیے گا۔ ایک شریف شہری پر تشدد بعد میں بھگتنا پڑے گا۔''

''یہ تمہاری دھمکی ہے یا تم مجھے مشورہ دے رہے ہو؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''جو چاہیں سمجھ لیں۔''

''ڈرتا تو میں کسی کے باپ سے بھی نہیں ہوں۔ فیصلہ تم کرلو کہ پیار سے بتاؤ گے یا خدمت کرانے کے بعد بولو گے...... دونوں صورتوں میں تمہارا بولنا تو لازمی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ پیار سے بتاؤ کہ فلک کہاں ہے؟'' انسپکٹر جنید کا آخری جملہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔

''میرے گھر میں ناجائز گھس کر مجھے اس طرح باندھ کر، نہ جانے کس کا جرم مجھ پر تھوپ رہے ہو۔ اس جرم کے لیے میں قانون کا دروازہ ہر قیمت پر کھٹکھٹاؤں گا۔'' صابر کے لب و لہجے میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔

انسپکٹر جنید اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''تم اس طرح سے نہیں مانو گے۔'' انسپکٹر جنید نے نوید کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ان سے کہو کہ گاڑی اندر لے آئیں۔'' ساتھ ہی انسپکٹر جنید نے ریوالور نکال کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ نوید نے کال کی اور تھوڑی دیر بعد باہر پولیس کی گاڑی آ گئی۔

پہلی بار صابر کے چہرے پر تغیر کے آثار اُبھرے تھے۔ وہ متوحش نگاہوں سے انسپکٹر جنید اور نوید کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اسے باہر لے گئے تو اردگرد کے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ صابر کو گاڑی میں بٹھا کر جب وہ اسے گلی سے لے جا رہے تھے تو اسی جگہ موجود ایک آدمی اپنے موبائل فون پر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو تیزی سے حرکت دے کر ایک میسج لکھ رہا تھا۔

جونہی وہ میسج متعلقہ شخص کو پہنچا اور اس نے وہ میسج پڑھا تو جیسے اس کے ہاتھوں میں بھونچال آ گیا ہو، اس نے تیزی سے ایک نمبر نکالا اور اس پر کال کر دی۔

جس نے وہ کال سنی، اس نے آگے کال کی اور اسے سفاک لہجے میں حکم دیا۔ ''صابر پکڑا گیا ہے۔ اس انسپکٹر کو اُلجھاؤ اور اس سے پہلے کہ وہ زبان کھولے، اسے چھڑا کر گولی مار دو۔''

☆☆☆

فاخرہ اسکول کے گیٹ سے باہر نکلی اور متلاشی نظروں سے اس رکشے کی طرف دیکھا جو اسے اسکول چھوڑنے اور لینے کے لیے آتا تھا۔

اس نے دائیں بائیں دیکھا، اسے رکشا دکھائی نہیں دیا۔ وہ وقت کا پابند تھا۔ فاخرہ نے سوچا کہ شاید رش کی وجہ سے وہ کہیں پھنس گیا ہو۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ ایک پچاس سال کی عمر کا شخص تیزی سے فاخرہ کے پاس پہنچا۔

''میرا نام برکت ہے اور میں اصغر کا بھائی ہوں۔ اس کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے اس نے مجھے بھیجا ہے...... آجایئے رکشا اُدھر کھڑا ہے۔'' وہ آدمی بولا۔

فاخرہ نے اس طرف دیکھا تو اسے برکت کا رکشا کھڑا دکھائی دیا۔ ''تم کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' فاخرہ بولی۔

''پہلے کبھی ایسی نوبت ہی نہیں آئی۔'' برکت مسکرایا۔

فاخرہ نے ایک لمحہ سوچا اور اس کے رکشے کی طرف چلی گئی۔ وہ پیچھے بیٹھ گئی اور برکت نے رکشا آگے بڑھا دیا۔ اس سڑک سے نکل کر رکشا دوسری طرف گیا تو اس نے رکشا ایک طرف روک دیا۔ ایک دم سے دو افراد دائیں اور بائیں سے آکر فاخرہ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ فاخرہ نے ان دونوں کی طرف حیران کن نگاہوں سے دیکھا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ

بولتی، ایک نے پستول نکال کر اس کی پسلی کے ساتھ لگا دیا اور بولا۔ ”کوئی آواز نہیں...... چپ چاپ بیٹھی رہو۔“

فاخرہ گھبرائے ہوئے انداز میں بیٹھی رہ گئی اور رکشا آگے بڑھ گیا۔ آدھا کلومیٹر آگے جا کر وہ رکشا پھر رک گیا۔ اس جگہ ایک کار کھڑی تھی۔ وہ لوگ فاخرہ کو لے کر رکشے سے باہر نکلے اور اس کار میں بٹھا کر تیزی سے اس جگہ سے نکل گئے۔ رکشا واپس اسکول کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

تقریباً دو گھنٹے تک صابر نے اپنی زبان کو مضبوطی سے بند رکھا تھا۔ وہ انسپکٹر جنید کے ہر سوال پر انجان بن کر جواب دینے کے بجائے سوال کر دیتا تھا۔ وہ ایسے ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ کچھ نہیں جانتا۔

کئی ہفتے قبل بھی صابر کو ایک جرم میں پولیس اسٹیشن لایا گیا تھا۔ اس وقت اس سے پوچھ گچھ کرنے والا کوئی دوسرا افسر تھا۔ تب بھی انسپکٹر جنید نے دیکھا تھا کہ صابر جیسا ڈھیٹ اور اپنی بات کا پکا مجرم اس سے پہلے کم ہی دیکھے تھے۔ اُس وقت بھی اس نے ایک بھی چیز کا اقرار نہیں کیا تھا اور جانے کس کی فون کال پر اسے رہائی مل گئی تھی اور وہ بڑے فاتح انداز میں پولیس اسٹیشن سے گیا تھا۔

دونوں اس وقت سے ایک دوسرے کے چہروں سے آشنا تھے۔ جب انسپکٹر جنید نے اپنے طریقے سے اس سے پوچھ گچھ کر لی اور وہ ناکام ہو گیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس پر اب دوسرا طریقہ آزمائے۔

اس سے قبل کہ وہ کچھ کرتا، انسپکٹر جنید کو ایک اجنبی نمبر سے کال موصول ہوئی۔ اس نے موبائل فون کان سے لگایا تو دوسری طرف سے ایک مدھم آواز آئی۔

”آپ کو ایک ضروری اطلاع دینی تھی۔“

”کون بول رہے ہو؟“

”آپ ضروری اطلاع سننا چاہیں گے؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے ایک ایک لفظ رک رک کر اپنا جملہ مکمل کیا۔

”کیا اطلاع ہے؟“

”آپ کی پیاری بیوی اسکول سے گھر نہیں پہنچی ہیں۔“ دوسری طرف سے بتایا گیا تو انسپکٹر جنید ایک دم چونکا۔

”تم کون بول رہے ہو؟“

”دیکھیں وہ ہماری مہمان ہیں اور ہم نے ان کو بڑی عزت اور احترام سے رکھا ہے۔ تاوان میں کوئی پیسہ نہیں چاہیے...... ہمارا ایک نگینہ آپ کے پاس ہے، وہ ہمیں واپس کر دیں...... معاملہ ختم ہو جائے گا۔“ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

”تم ہو کون؟“ انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

”تم سوچ لو میں، تم کو آدھے گھنٹے کے بعد کال کرتا ہوں۔“ دوسری طرف سے کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ انسپکٹر جنید نے اسی وقت اسی نمبر پر کال کی لیکن وہ فون سوئچ آف تھا۔ نوید اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“

انسپکٹر جنید اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے فاخرہ کو کال کرنے لگا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔

”مجھے بتاؤ گے، کیا ہوا ہے؟“ نوید نے دوبارہ پوچھا۔

”اس کے ساتھیوں نے فاخرہ کو اغوا کر لیا ہے۔“ انسپکٹر جنید نے سوچتے ہوئے بتایا۔ ”بدلے میں وہ اس کی رہائی مانگ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ صابر ایک خطرناک آدمی ہے اور وہ منصور اور فلک کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوگا۔“

”اگر یہ غیر اہم ہوتا تو وہ اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتے۔“ نوید بولا۔

”وہ مجھے آدھے گھنٹے کے بعد کال کریں گے تب تک تم اس نمبر کے بارے میں معلوم کرو کہ یہ کس کا نمبر ہے۔“ انسپکٹر جنید نے کہہ کر اسے نمبر لکھوایا اور کچھ ہدایت کرنے کے بعد وہ گاڑی نکال کر اسے تیز بھگاتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی ایک ایک کمرا اور اوپر تک تلاشی لینے کے بعد نیچے آیا...... گھر میں کوئی نہیں تھا۔ جو سامان جہاں تھا اسی جگہ موجود تھا۔

اسی اثنا میں انسپکٹر جنید کو اس کے موبائل فون پر بجنے والی بیل نے چونکا دیا۔ کال ڈاکٹر آفتاب کی تھی۔

”جی ڈاکٹر صاحب کیسے ہیں آپ؟“ انسپکٹر جنید نے کوشش کی کہ اس کے اندر کی پریشانی اس کے لہجے سے عیاں نہ ہو۔

”جس باپ کی بیٹی کل سے لاپتا ہو، وہ کیسا ہو سکتا ہے؟ میری بیٹی کا کچھ پتا چلا؟“ دوسری طرف سے اس کی گلوگیر آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

”میں اسی کی تلاش میں ہوں۔“

”اب تک کیا پیش رفت ہوئی ہے انسپکٹر جنید؟“

”ابھی میں کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”مجھے معلوم نہیں ہے کہ آپ کچھ بتانے کی پوزیشن میں ہیں، یا نہیں...... یا روایتی انداز میں تفتیش کے بعد مجھے

دلاسے کی لوری دیتے رہیں گے...... مجھے لگتا ہے کہ اوپر بات کرنی ہوگی۔''

''میں جانتا ہوں کہ آپ کی پہنچ اوپر تک ہے۔ لیکن میں جس کام میں ہاتھ ڈال لوں، اس میں غیر ذمے داری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔''

''ٹھیک ہے...... میں شام تک دیکھ لیتا ہوں ورنہ مجھے اوپر بات کرنی پڑے گی۔'' ڈاکٹر آفتاب نے خشک لہجے میں کہہ کر فون بند کردیا۔

انسپکٹر جنید نے ایک بار پھر اپنا بیڈ روم اچھی طرح سے دیکھا اور اس بار اس نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر بھی اندر دیکھا اور جونہی وہ دروازہ بند کرنے لگا، وہ چونکا۔ اس کی نگاہیں فرش پر رک گئیں۔

باتھ روم کے سفید ٹائلوں پر جوتوں کے نشان تھے۔ کسی نے بیسن کے قریب کھڑے ہوکر شاید ہاتھ دھوئے تھے اور اس کے دونوں جوتوں کے نیچے لگی مٹی وہاں واضح نشان چھوڑ گئی تھی۔

انسپکٹر جنید نیچے جھک گیا۔ اس نے غور سے دیکھا اور اپنے موبائل فون سے کچھ اینگل سے اس کی تصویریں بنالیں۔ انسپکٹر جنید کھڑا ہوگیا اور بیسن کی ٹونٹی کو غور سے دیکھنے کے بعد سوچا کہ اگر اس نے ہاتھ دھوئے ہیں تو اس پر شاید انگلیوں کے نشان بھی ہوں۔

اس دوران نوید کی کال آگئی۔ اس نے بتایا کہ وہ نمبر دور دراز ایک شہر میں مقیم کسی الطاف نام کے شخص پر ہے۔ انسپکٹر جنید نے سوچا کہ جرائم پیشہ لوگوں کے پاس ایسے کئی نمبرز ہوتے ہیں۔ انسپکٹر جنید نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھر سے باہر نکل کر انسپکٹر جنید نے ایک نگاہ اردگرد ڈالی اور اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد وہ چلا گیا۔

☆☆☆

اس آدمی کی کال آدھے گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے کے بعد آئی تھی۔ تب تک انسپکٹر جنید اور نوید پولیس اسٹیشن میں ہی موجود تھے۔ انہوں نے دوبارہ کوشش کرلی تھی لیکن صابر عادی مجرم تھا۔ اس پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ انسپکٹر جنید اس پر کسی طرح کا کوئی تشدد نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ محض اس کو ڈراتا رہا...... صابر بھی جانتا تھا کہ وہ اسے ہاتھ لگائے گا تو پھنس جائے گا۔

کال اسی نے کی تھی۔ ''کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

اس کی بات کو سن کر انسپکٹر جنید نے کچھ دیر سوچا اور بولا۔ ''اسے کہاں لے کر آؤں......''

''بہت اچھے...... تم اسے چھوڑ دو وہ خود ہی ہمارے پاس آجائے گا۔'' دوسری طرف سے اس نے خوش ہوکر کہا۔

''نہیں...... تم فاخرہ میرے حوالے کرو گے اور ادھر سے میں اسے چھوڑوں گا۔'' انسپکٹر جنید بولا۔

''تمہاری بیوی حفاظت سے ہے۔ وہ ایک جگہ محفوظ ہے۔ تم اسے آزاد کردو میں بتادیتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔''

''میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ ہم ایک کام کرتے ہیں۔ میرا آدمی صابر کو لے کر کسی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ فاخرہ کہاں ہے۔ جونہی فاخرہ مجھے ملی، میری ایک کال پر وہ اسے چھوڑ دے گا۔''

''زیادہ ہوشیار مت بنو۔ اتنی تمہاری نوکری نہیں ہے جتنی مدت سے میں یہ کام کررہا ہوں۔'' اس نے دوسری طرف سے درشت لہجے میں کہا۔ ''آدھے گھنٹے کے اندر تم اسے لے کر مارکیٹ روڈ پر آجاؤ...... تمہاری گاڑی سے ہمارا آدمی بعد میں نکلے گا، تمہاری بیوی کا پتا تمہیں پہلے بتا دوں گا۔''

انسپکٹر جنید نے اس کی بات کو سن کر کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔''

فون بند کرنے کے بعد اس نے نوید کی طرف دیکھا۔ اسپیکر آن تھا اس لیے اس نے ساری بات سن لی تھی۔

''کوئی بات نہیں...... بھابی کی زندگی اہم ہے۔ اسے لے چلتے ہیں۔'' نوید نے کہا۔

''ان کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔'' انسپکٹر جنید نے اپنا اندیشہ عیاں کیا۔ انسپکٹر جنید کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ کوئی فیصلہ کررہا ہو۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

جونہی انسپکٹر جنید تیزی سے آگے بڑھا، کچھ نہ سمجھتے ہوئے نوید اس کے پیچھے چلنے لگا۔ انسپکٹر جنید نے وہ دروازہ کھولا جس کمرے میں صابر بند تھا۔ دونوں اندر گئے تو نوید نے دروازہ بند کردیا۔

انسپکٹر جنید تیزی سے صابر کی طرف بڑھا اور ایک لمحے میں اطمینان سے براجمان صابر کو گریبان سے پکڑ کر پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ صابر اور نوید کے لیے وہ غیر متوقع تھا۔ صابر اس زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا کہ اسے لگا جیسے اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

وہ دیوار سے ٹکراتے ہی فرش پر گرا، انسپکٹر جنید نے اسے اٹھایا اور دوسری بار بھی اسے دیوار پر دے مارا۔ صابر کی چیخ نکل گئی تھی۔

"یہ تشدد تم پر بھاری پڑے گا۔"

"تم زندہ بچو گے تو مجھ پر بھاری بنو گے۔" انسپکٹر جنید نے اس کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لے جاتا ہوا بولا "تجھ جیسے کا زندہ رہنا بڑی غلطی ہے......"

وہ اسے کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ ان کے پیچھے دو اہلکار بھی چل دیے تھے۔ انسپکٹر جنید نے اسے گاڑی میں ٹھونسا اور اس کے دائیں بائیں دونوں اہلکار بیٹھ گئے۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر انسپکٹر جنید اور ساتھ والی سیٹ پر نوید بیٹھ گیا تھا۔

انسپکٹر جنید نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے غصے سے کہا۔ "کچھ مت بتاؤ لیکن مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

انسپکٹر جنید نے تیزی سے اس جگہ سے گاڑی نکالی تو پہلی بار صابر کی آنکھوں میں خوف دکھائی دینے لگا۔

"مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"میں نے کہا تھا کہ مجھے بتا دو۔ تم میرے ساتھ ڈرامے کرنے لگے۔ لیکن میں ڈرامے نہیں کرتا، اب تم نہیں بچو گے۔" انسپکٹر جنید کی گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔

صابر متوحش نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ انسپکٹر جنید کے تیور ٹھیک نہیں ہیں اور گاڑی جس طرف بھاگ رہی ہے، وہ بھی ویران راستہ تھا۔

"تم کہاں لے جا رہے ہو مجھے......"

"تجھے مارنے کے لیے لے جا رہا ہوں اور یہ جھوٹ نہیں ہے۔" انسپکٹر جنید کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

کچھ فاصلے پر مارکیٹ روڈ دکھائی دینے لگا تھا۔ سنسان جگہ تھی۔ انسپکٹر جنید نے گاڑی روک دی۔ اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا، اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔

"نوید اسے باہر نکالو اور گولی سے اُڑا دو۔" انسپکٹر جنید نے حکم دیا۔

"یہ غلط ہے...... ایسا مت کرنا...... میں بتاتا ہوں...... اس لڑکی کو پرنس اپنے ساتھ لے گیا تھا...... اور میرا کام گاڑی کو ٹھکانے لگانا تھا۔" صابر نے موت کو سامنے دیکھا تو وہ ایک دم سے گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"پرنس کون ہے؟" انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

"اس کا اصل نام کچھ اور ہے اور وہ پرنس خان کے نام سے مشہور ہے، اس کا دفتر گلیکسی سینٹر کے چوتھے فلور پر ہے۔" اس نے بتایا۔

ایک سادہ طبع نوجوان کی کہانی...... جو نامساعد حالات کی طنابیں گرفت میں رکھنا جانتا تھا۔

وادی مہران کے ایک دور دراز خطے سے جس کا تعلق تھا......

ایک پُراسرار واقعے نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا

جانگلی

جس میں محبت کی دیوانگی بھی ہے اور نفرتوں و عداوتوں کے دہکتے انگارے بھی۔

بہت جلد... سسپنس کے صفحات کی زینت

اس دوران انسپکٹر جنید کی کال آ گئی۔ دوسری طرف سے آواز آئی ”یہ گاڑی تمہاری ہی کھڑی ہے انسپکٹر؟“

”ہاں۔“

”اسے باہر نکالو۔“

”میری بیوی کہاں ہے؟“

”اسے باہر نکالو اور کال بند مت کرنا۔ اسے دیکھتے ہی بتاتا ہوں۔“ دوسری طرف سے وہ بولا۔

انسپکٹر جنید نے موبائل فون کان سے لگایا ہوا تھا اور اس نے نوید کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں باہر نکلے تو صابر کو بھی باہر نکال دیا۔ اسے دیکھتے ہی دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”تمہاری بیوی تمہارے گھر میں ہے..... اسے آگے آنے دو۔“

انسپکٹر جنید نے اسی وقت فون کاٹ کر فاخرہ کو کال کی۔ بیل جانے لگی۔ صابر ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ حیران تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی وقت فاخرہ کی آواز آئی۔

”ہیلو.....“

”تم کہاں ہو؟“

”میں گھر میں ہوں۔“

”تمہارے ساتھ تو کوئی نہیں ہے؟“

”نہیں میں اکیلی ہوں۔“

”دروازہ بند رکھنا اور میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ انسپکٹر جنید نے موبائل فون بند کیا اور صابر کی طرف پلٹا ہی تھا کہ ایک گولی آئی اور سیدھی صابر کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ تڑپا اور ساتھ ہی دوسری گولی نے اسے زمین پر ڈھیر کر دیا۔ وہ سب تیزی سے گاڑی کے پیچھے چلے گئے۔

صابر کی لاش زمین پر پڑی تھی اور سناٹا چھا گیا تھا۔ انسپکٹر جنید نے سامنے اور دائیں بائیں دیکھا، کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گولی چلانے والا کسی محفوظ جگہ پر چھپا ہوا تھا اور شاید وہ اپنا کام کرنے کے بعد اس جگہ سے چلا بھی گیا تھا۔

☆☆☆

”تم نے سارا گھر چھان لیا تھا لیکن سیڑھیوں کے نیچے کا وہ حصہ نہیں دیکھا تھا جہاں کیبن بنے ہوئے ہیں۔ میں اسی جگہ بندھی تھی اور میرے ہاتھ پیر اور منہ باندھا ہوا تھا، میرے ساتھ ایک آدمی تھا، جس کے پستول کا رخ میری طرف تھا۔ مجھے اغوا کرنے کے بعد وہ مجھے سیدھا اسی گھر میں لے آئے تھے۔“ فاخرہ بتا رہی تھی اور انسپکٹر جنید سنتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس نے شاید سیڑھیوں کا وہ حصہ نظر انداز کر دیا تھا کہ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ وہ اسے اس گھر میں رکھ سکتے تھے۔

”تم ابھی کچھ دن اسکول سے چھٹیاں لے لو۔ میں ایک کیس پر کام کر رہا ہوں مجھے ان کے پیچھے کچھ خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں۔“ انسپکٹر جنید نے کہا۔

”یہ تو تمہارا کام ہے۔ آئے دن تمہارا کسی نہ کسی خطرناک کام سے واسطہ پڑتا ہے تو کیا میں ڈر کر گھر بیٹھ جاؤں؟“ فاخرہ متانت سے بولی۔

انسپکٹر جنید نے سر ہلایا۔ ”کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ لیکن آئندہ تم زیادہ اپنی دیکھ بھال کرنا، کسی کی بات پر اعتبار مت کرنا اور مجھے ایک شک اور بھی ہے۔“

”وہ کیا شک ہے؟“

”مجھے لگتا ہے کہ ہماری غیر موجودگی میں ہمارے گھر میں کوئی آتا ہے۔“ انسپکٹر جنید سوچتے ہوئے بولا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ کچھ دیکھا ہے تم نے؟“ فاخرہ کے چہرے پر سنجیدگی عیاں ہو گئی تھی۔

”میں نے محسوس کیا ہے۔ میں نے ایک اہلکار کو کہہ دیا ہے وہ آج باہر کا لاک بدلوا دے گا، پھر دیکھتا ہوں۔“

انسپکٹر جنید کہہ کر اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں پر جو قدموں کے نشان تھے وہ غائب تھے۔ انسپکٹر جنید نے باہر نکل کر پوچھا۔ ”فاخرہ باتھ روم تم نے صاف کیا ہے؟“

”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کیوں کیا ہوا؟“

”وہاں کسی کے قدموں کے نشان تھے۔ اگر اس نے وہ دھو دیے ہیں تو یقیناً اس نے ٹونٹی کے نشان بھی صاف کر دیے ہوں گے۔“ انسپکٹر جنید نے ابھی بات مکمل کی تھی کہ اس کے موبائل فون نے اسے چونکا دیا۔ کال نصیر احمد کی تھی۔

فون کان سے لگا کر اس نے کہا۔ ”ہیلو.....“

”السلام علیکم، میں نصیر بول رہا ہوں۔“

”جی بات کیجیے نصیر صاحب۔“

”مجھے اپنے پاس بلا لیجیے یا پھر میری طرف آ جایئے۔ بات فون پر نہیں ہو سکتی اور بہت اہم ہے۔“ نصیر احمد کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

”میں کہاں آ جاؤں؟“ انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

”میں اس وقت گھر پر ہوں۔ لیکن گھر میں مناسب نہیں ہو گا۔ میں کلب روڈ کی طرف نکلتا ہوں۔ وہاں ایک چھوٹا سا ریستوران ہے۔ وہ جگہ مناسب رہے گی۔“ نصیر احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔

”میں اس جگہ ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ انسپکٹر جنید نے کہہ کر فون بند کیا اور سوچتا ہوا باہر کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

با ب روڈ پر کشادہ سڑکیں، گلف کلب اور دائیں بائیں کچھ عمارتیں کھڑی تھیں جو مختلف کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں رش وغیرہ کے بجائے پُرسکون ماحول رہتا تھا۔

ایک طرف چھوٹا سا ریستوران تھا۔ نصیر احمد نے اس جگہ کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ جاتے ہو وہ آسانی سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔

وہ اپنی گاڑی کے بجائے ٹیکسی پر آیا تھا اور ریستوران میں ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ دروازہ تھا جہاں سے لوگ آتے جاتے تھے۔ ڈائننگ ہال اتنا بڑا نہیں تھا، چند میزیں لگی ہوئی تھیں اور باقی انتظام باہر لان میں تھا۔

انسپکٹر جنید بھی جلدی پہنچ گیا تھا۔ وہ سیدھا نصیر احمد کے پاس چلا گیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

''مجھے ایک کال آئی تھی۔ کال کرنے والے نے مجھے بتایا کہ میرا بیٹا منصور اس کے پاس ہے اور اس کی رہائی کے لیے ایک کروڑ روپیہ چاہیے۔''

''کب کال آئی تھی؟''

''یہی کوئی ایک، ڈیڑھ گھنٹا پہلے...... اس کے فوری بعد میں نے آپ کو کال کی تھی۔'' نصیر احمد نے بتایا۔

''مجھے وہ نمبر نوٹ کرا دیں۔'' انسپکٹر جنید نے کہہ کر وہ نمبر اپنے موبائل فون میں نوٹ کر لیا تھا۔ ''اس نے اور کیا کہا تھا؟''

''پہلے اس نے میرا نام پوچھا تھا، اس کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ منصور اس کے پاس ہے۔ میں نے پوچھا تم کون بول رہے ہو۔ اس نے کہا کہ اس بات کو چھوڑو اور ایک کروڑ کا انتظام کرو۔ پیسے بھی اسے آج شام تک چاہئیں۔'' نصیر احمد کے لہجے میں خوف تھا۔

''آپ نے اس سے کہا تھا کہ وہ منصور سے بات کرائے؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''مجھے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔''

''اب کال آئے تو اس سے کہیں کہ میں کیسے یقین کروں کہ منصور تمہارے پاس ہے۔ میری اس سے بات کراؤ اور آپ جب بھی مجھے کال کریں گے اپنے اس نمبر سے نہیں کریں گے بلکہ وہ نمبر استعمال کریں گے جس کا نمبر زیادہ لوگوں کے پاس نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے رابطے میں رہیں اور اس کا تقاضا بڑھے تو پیسوں کی بات کل تک ٹالیں...... لیکن پہلے ضروری ہے کہ آپ منصور سے بات کریں اور تسلی کریں کہ وہ منصور ہی بول رہا ہے۔'' انسپکٹر جنید نے تاکید کی۔

''ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔''

''ابھی آپ جائیں اور میں تھوڑی دیر کے بعد نکلتا ہوں۔'' انسپکٹر جنید کے کہنے پر نصیر احمد اُٹھ کر چلا گیا۔

انسپکٹر جنید اسی جگہ بیٹھا سوچتا رہا کہ اچانک چھ ماہ کے بعد منصور کا تاوان مانگا جا رہا ہے؟ چھ ماہ تک وہ خاموش کیوں رہے تھے؟ انسپکٹر جنید کے لیے کسی بھی سوال کا جواب اخذ کرنا قبل از وقت تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بھی اس جگہ سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کا رخ گلیکسی سینٹر کی طرف تھا جہاں اسے پرنس خان کو تلاش کرنا تھا۔

وہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے اپنی گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور پیدل چلنے لگا۔ اس سینٹر کے نیچے بہت سے شاپنگ سینٹر تھے جبکہ اوپر کی منزلوں پر مختلف کمپنیوں کے دفاتر تھے۔

چوتھے فلور پر جا کر اس نے استقبالیہ کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا تھا۔ انسپکٹر جنید دھیرے دھیرے چلتا اس نوجوان کی طرف جا رہا تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک شخص اس تیزی سے باہر نکلا کہ وہ انسپکٹر جنید سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ اس نے سرعت سے چلتے ہوئے معذرت کی اور لفٹ میں چلا گیا۔

''یہاں پرنس خان کا آفس ہے۔''

''جی سر ہے۔''

''مجھے اُن سے ملنا ہے۔ ان کے آفس کا مجھے بتا دیں۔'' انسپکٹر جنید نے شائستہ لہجے میں بات کی تھی۔ وہ اپنی وردی میں نہیں تھا اس لیے اسے اپنی شناخت کرانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

''ان کا وہ آفس ہے۔'' نوجوان نے اس دروازے کی طرف اشارہ کیا جس سے کچھ دیر قبل ایک شخص تیزی سے باہر نکلا تھا۔ ''ابھی جو صاحب تیزی سے گئے ہیں وہی پرنس خان صاحب تھے۔''

انسپکٹر جنید چونکا۔ ''اوہ...... مجھے اُن سے ملنا تھا۔''

انسپکٹر جنید نے اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس لیے وہ تیزی سے لفٹ کی طرف دوڑا۔ لفٹ اوپر آ رہی تھی۔ جونہی لفٹ اوپر آئی۔ دروازہ کھلا اور کچھ لوگ باہر نکلے، انسپکٹر جنید جلدی سے اندر گیا، دروازہ بند ہوا اور

.....اس نے نیچے جانے کے لیے بٹن دبا دیا۔ لفٹ تیزی سے نیچے گئی اور بھاگتا ہوا باہر کی طرف دوڑا۔
اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا وہ نہیں تھا۔ وہ ابھی کھڑا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔
''مسٹر جنید...... میں ابھی آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایمرجنسی ہے۔'' دوسری طرف سے مضطرب ڈاکٹر آفتاب کی آواز آئی۔
''خیریت ہے۔ آپ گھبرائے ہوئے ہیں؟''
''ان باتوں کا وقت نہیں ہے آپ فوراً میرے گھر آجائیں۔'' اس نے یہ کہہ کر کال منقطع کردی۔
انسپکٹر جنید اسی وقت اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر جنید کے لیے ایک اور خبر منتظر تھی۔ ڈاکٹر آفتاب کے گھر پہنچنے پر اس نے بتایا کہ ابھی اسے ایک کال آئی تھی جس میں انہوں نے فلک کا تاوان مانگا ہے اور وہ بھی ایک کروڑ روپیہ۔
انسپکٹر جنید کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ نصیر احمد سے بھی اس کے بیٹے کا اتنا ہی تاوان مانگا گیا تھا۔ اس وقت اسے اور بھی حیرت کا جھٹکا لگا جب اس نے جس نمبر سے کال آئی تھی، وہ نمبر دیکھا تو وہی تھا، جس نمبر سے نصیر احمد کو کال آئی تھی۔
انسپکٹر جنید نے ڈاکٹر آفتاب پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے چپ چاپ وہ نمبر نوٹ کیا اور بولا۔
''پیسے کب مانگے ہیں انہوں؟''
''آج شام تک؟'' ڈاکٹر آفتاب نے بتایا۔
''اس سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسے منصور نے نہیں بلایا تھا۔'' انسپکٹر جنید نے کہنے کے بعد ڈاکٹر آفتاب کی طرف دیکھا۔
''ممکن ہے کہ اسی نے تاوان مانگا ہو۔'' ڈاکٹر آفتاب بولا۔
''پھر یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ دونوں نے مل کر پیسے مانگے ہوں؟'' انسپکٹر جنید نے کہا۔
ڈاکٹر آفتاب چونکا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''
''دونوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہو اور ان کو پیسوں کی ضرورت ہو۔'' انسپکٹر جنید نے کچھ وضاحت کی۔
''نہیں...... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ ناممکن ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے اپنی گردن کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔
''مجھے فلک ہے کہ منصور...! میری بیٹی کو بہانے سے بلا کر اسے اغوا کیا ہے اور اب وہ تاوان مانگ رہا ہے۔''
''ابھی بہت سے سوالوں کے جواب درکار ہیں۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ مجھے جلدی ان سوالوں کے جواب مل جائیں۔''
''انسپکٹر صاحب آپ کے ذہن میں سب سے اہم سوال کیا ہے؟'' ڈاکٹر آفتاب نے پوچھا۔
''ایک سوال میرے لیے معمّا ہے۔ منصور چھ ماہ تک کہاں تھا اور اب اچانک وہ نمودار ہوکر فلک کو بلالیتا ہے؟''
''اس سوال کا جواب آپ کو اس وقت مل جائے گا جب منصور آپ کی گرفت میں آئے گا۔ اس وقت سب سے اہم یہ بات ہے کہ میری بیٹی فلک کو بازیاب کرایا جائے۔''
''ان لوگوں کی دوبارہ کال آئے تو آپ اُن سے کچھ وقت لیں اور کوشش کریں کہ اس معاملے کو جتنا طول دے سکتے ہیں اتنا طول دیں تاکہ میں کسی طرح سے ان تک پہنچنے کی کوشش کروں۔''
''انسپکٹر صاحب آپ کے ہاتھ کوئی سراغ لگا ہے؟'' ڈاکٹر آفتاب نے گہری نظروں سے انسپکٹر جنید کی طرف دیکھا۔
انسپکٹر جنید نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اسی کوشش میں ہوں۔''
''کوشش میں ہیں یا مجھے بتانا نہیں چاہتے؟'' ڈاکٹر آفتاب کے چہرے پر متانت تھی۔
''آپ کے علم میں کوئی بات آئی ہے تو مجھ سے کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنی کوشش میں کہاں تک پہنچا ہوں۔'' انسپکٹر جنید کی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر تھیں۔
''مجھے کیا معلوم کہ آپ کی کوشش کہاں تک پہنچی ہے۔ میں تو فلک کی پریشانی میں ہوں اور لوگوں کو کچھ معلوم نہ ہوسکے، میں باقاعدہ اپنے اسپتال جاتا ہوں لیکن میرے لیے کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔''
''آپ اطمینان رکھیں، بہت جلدی میں فلک اور منصور کا سراغ لگالوں گا۔'' انسپکٹر جنید جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔
''ایک بات یاد رکھیے گا انسپکٹر صاحب۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ زیادہ انتظار کریں گے۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ میری ٹال مٹول سے فلک کو کوئی نقصان پہنچے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے کہا۔
''آپ بےفکر رہیں اور میرے ساتھ مسلسل رابطے میں رہیں۔'' انسپکٹر جنید نے اجازت لی اور باہر نکل گیا۔
اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اس نے وہ نمبر نوید کو بھیج کر تاکید کی کہ اسے فوری اس کی تفصیل بھیجے۔

☆☆☆

انسپکٹر جنید سب سے پہلے پرنس خان کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک اہلکار سادہ کپڑوں میں اس عمارت کے آس پاس کھڑا کر دیا تھا۔ اہلکار نے بڑی ہوشیاری سے چوکیدار سے پرنس خان کے بارے میں کچھ معلومات لینے کے بعد استدعا کی تھی کہ اسے نوکری کی اشد ضرورت ہے اور ان کے پاس ایک اچھی نوکری ہے، اس لیے جیسے ہی وہ آئیں تو اسے اشارہ کر کے بتا دینا کہ وہ آ گیا ہے۔ چوکیدار نے صلہ رحمی کے طور پر ہامی بھر لی تھی۔

نوید اس نمبر کی تفصیل لے کر انسپکٹر جنید کے پاس پہنچا تو دونوں گاڑی میں بیٹھ کر اس پتے پر چلے گئے۔

وہ ایک عام سا محلہ تھا۔ کچھ تلاش کے بعد ان کو اس کا مکان مل گیا۔ اندر سے ایک بزرگ باہر نکلے تو انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

"ہمیں سراج سے ملنا ہے؟"

بزرگ نے دونوں کا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میرا نام شہزاد ہے اور یہاں قریب ہی میرا گودام ہے۔ مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو میرا مال ٹرک سے اتار سکے اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ سراج کے پاس ایسے کام کے لیے مزدور ہیں۔" انسپکٹر جنید نے محلہ دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں زیادہ تر محنت کش لوگ رہتے ہیں اس لیے اس نے اسی حساب سے بات کی تھی۔

"آپ نے غلط سنا ہے۔ سراج یہ کام نہیں کرتا وہ تو ایک بڑے صاحب کے پاس ڈرائیوری کی نوکری کرتا ہے۔" بزرگ نے کہا۔

انسپکٹر جنید نے کچھ حیران ہونے کی اداکاری کی۔ "اچھا...... اگر وہ کہیں ڈرائیور کی جاب کرتا ہے تو آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں کوئی اور بھی سراج ہے؟"

بزرگ کچھ سوچنے لگے۔ "شاید ہو...... آپ دیکھ لیں۔"

"ویسے سراج شہر میں کس کے پاس جاب کرتا ہے۔ کیونکہ ہم بھی شہر سے آئے ہیں اور ممکن ہے کہ اس صاحب کو میں بھی جانتا ہوں۔"

"مجھے ان کا نام تو معلوم نہیں ہے مگر میرے پاس ان کا کارڈ ہے۔ سراج نے دیا تھا۔" بزرگ کہہ کر اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کارڈ لے کر باہر نکلے تو انسپکٹر جنید نے کارڈ دیکھا اور اسے پڑھ کر واپس کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں ان کو میں نہیں جانتا...... ہم اس سراج کو تلاش کرتے ہیں جس کے لیے ہم آئے ہیں...... شکریہ۔" انسپکٹر جنید نے مسکرا کر کہا اور اجازت لے کر چلا گیا۔ وہ تیزی سے چل رہا تھا، اس کے پیچھے نوید تھا۔

دونوں گاڑی میں بیٹھے اور دروازہ بند کرتے ہی نوید نے پوچھا۔ "وہ کارڈ کس کا تھا...... میں نے تمہارے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے تھے۔"

"جاننا چاہتے ہو وہ کارڈ کس کا تھا؟"

"اسی لیے تو پوچھا ہے؟" نوید اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر جنید نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنی سائڈ کا شیشہ اوپر کر لیا۔ وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اسے جو کچھ بتا رہا تھا اسے سن کر نوید کے چہرے پر بھی تغیر نمایاں ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر جنید اور نوید گاڑی میں بیٹھے اس انتظار میں تھے کہ ان کے اہلکار کی طرف سے پرنس خان کے بارے میں کوئی اطلاع آئے تو وہ اسی وقت اسے پکڑنے کے لیے اس طرف نکل جائیں۔ فی الحال اس کی طرف خاموشی تھی اور رابطہ ہونے پر اس نے بتایا کہ ابھی وہ نہیں آیا۔

اس دوران نصیر احمد کی کال آ گئی تھی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ "انسپکٹر صاحب ابھی میری منصور سے بات ہوئی ہے...... وہ منصور ہی تھا۔ میں اپنے بیٹے کی آواز سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔"

"کیا کہا تھا اُس نے؟"

"منصور نے کہا کہ وہ ٹھیک ہے لیکن وہ ظالم لوگوں کے پاس ہے جو اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے یہ بھی جاننا چاہا تھا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں تھا۔ ایک دم سے اس سے موبائل فون لے لیا گیا اور مجھے سخت الفاظ میں انہوں نے حکم دیا ہے کہ میں ایک گھنٹے کے اندر ایک کروڑ روپے کا بندوبست کر کے ان تک پہنچاؤں ورنہ وہ منصور کو مار دیں گے۔" نصیر احمد کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔

"آپ گھبرائیں نہیں...... دوبارہ فون آئے تو ان سے کہہ دیں پیسوں کے انتظام کے لیے آپ کو کچھ اور وقت دیں۔ انہیں یقین دلانے کی کوشش کریں کہ آپ ان کو پیسے آج ہی دیں گے۔"

"لیکن انسپکٹر صاحب۔" نصیر احمد نے حیرت سے کچھ کہنا چاہا۔

"جو میں کہہ رہا ہوں بس ویسا ہی کریں۔ میں اس وقت کوئی دوسرا کام نہیں کر رہا ہوں...... میرا فوکس ایک ہی کام پر ہے۔" انسپکٹر جنید نے مزید تسلی دینے کے بعد کال بند کر دی۔

نوید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اسے اٹھا لیں؟''

''اس کے پیچھے آدمی لگا دیے ہیں۔ وہ اسے مکڑی کی طرح وہ اسے نکال کر مہمان خانے میں پہنچا دیں گے۔ تب تک مجھے پرنس خان کا انتظار ہے۔'' انسپکٹر جنید نے سوچتے ہوئے کہا۔

''پرنس اگر آج سارا دن ہاتھ نہ لگا تو؟''

''ابھی انتظار کرتے ہیں...... تم نے اپنا آدمی دوسری طرف بھیج دیا ہے؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''وہ بھی اس جگہ موجود ہے۔'' نوید نے جواب دیا۔

انسپکٹر جنید کی کچھ دیر نظر ایک مال سے نکلنے والی خوب صورت اسمارٹ عورت پر تھی۔ اس نے آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس جگہ سے کچھ دور گلیکسی سینٹر تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''اس عورت کو دیکھ رہا ہوں۔''

''تم شادی شدہ ہو، میری شادی نہیں ہوئی اس لیے میں دیکھ سکتا ہوں۔'' نوید مسکرایا۔

اسی اثنا میں ایک قیمتی کار اس عورت کے سامنے رکی۔ وہ عورت گاڑی کی طرف بڑھی، پسنجر سیٹ کی طرف کا دروازہ کھلا۔ وہ اندر بیٹھی اور کار آگے بڑھنے کے لیے رینگی۔

جونہی وہ کار واپس جانے کے لیے گھومی تو انسپکٹر جنید چونکا، کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر پرنس خان بیٹھا تھا۔

''یہ رہا پرنس خان......'' انسپکٹر جنید نے جلدی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ نوید نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ اس دوران گاڑی گھوم کر آگے نکلی۔ انسپکٹر جنید نے بھی فوراً گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔

اگلی گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ایک ریستوران کے سامنے رک گئی۔ انسپکٹر جنید نے اپنی گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر روک دی تھی۔ پہلے وہ عورت باہر نکلی اور وہ ریستوران کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جونہی پرنس خان باہر نکلا اور اس نے دائیں بائیں دیکھا، ایک دم اس کی نگاہ انسپکٹر جنید کی گاڑی پر پڑی۔ اندر بیٹھا انسپکٹر جنید اسے صاف دکھائی دے گیا تھا۔

وہ سرعت سے گاڑی میں بیٹھا اور اس نے گاڑی کا رخ پھیر کیا دروازے کے پاس کھڑی عورت نے اسے جاتا ہوا دیکھا تو اس نے چلا کر اسے مخاطب کیا۔

''پرنس...... کہاں جا رہے ہو؟''

''تم جلدی سے نیچے اترو اور اپنی گھر چلی جاؤ۔''

انسپکٹر جنید چلا آیا۔ نوید اسی وقت باہر نکلا اور انسپکٹر جنید نے گاڑی پرنس کے پیچھے لگا دی۔

انسپکٹر جنید اپنی گاڑی اس کے پیچھے دوڑاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ پرنس کو کیسے پتا چلا کہ میں اس کے تعاقب میں ہوں کہ وہ مجھے دیکھتے ہی بھاگ گیا؟ کیا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی پرنس کا مخبر ہے؟

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ دونوں گاڑیوں کی رفتار غیر معمولی تھی۔

اچانک ایک دھماکا ہوا اور پرنس کی گاڑی ایک طرف سے آتی ہوئی مزدا کے ساتھ ٹکرا گئی۔ گاڑی کی ایک سائیڈ ہی لگی تھی اور گاڑی کا وہ حصہ اس کے نیچے والے حصے میں پھنس گیا تھا۔

انسپکٹر جنید کی گاڑی کی رفتار بھی کیونکہ تیز تھی اس لیے ایک دم سے بریک لگا کر گاڑی کو روکنا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ٹائر چیخے اور اگلی گاڑی سے ٹکرانے سے پہلے انسپکٹر جنید کی گاڑی رک گئی۔

وہ جلدی سے باہر نکلا تو پرنس ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ انسپکٹر جنید کی رفتار بھاگنے میں زیادہ تھی۔ اس نے جلدی ہی پرنس کو قابو میں کر لیا۔ پرنس خان نے مزاحمت کرتے ہوئے انسپکٹر جنید کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔

جس وقت انسپکٹر جنید اسے باندھ کر اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا چکا تھا تب پرنس خان کے موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔

انسپکٹر جنید نے اس کی جیب سے موبائل فون نکالا اور جب اسکرین پر دیکھا تو وہ چونکا۔ جس نمبر سے پرنس خان کو کال آ رہی تھی، وہ نمبر انسپکٹر جنید کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر جنید اس وقت نصیر احمد کے سامنے بیٹھا تھا۔ نصیر احمد نے پریشانی کے عالم میں اسے کال کر کے گھر بلا لیا تھا۔ انسپکٹر جنید جب سے اس کے گھر آیا تھا، وہ مسلسل اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بہت پریشان اور مضطرب تھا۔

''اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ منصور کو مار دے گا۔ مجھے ایک گھنٹے کے اندر اندر ایک کروڑ روپے دینا ہوگا۔''

انسپکٹر جنید نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا۔ شام کے چھ بج گئے تھے۔ ''اس کا مطلب ہے کہ سات بجے تک پیسے دینے ہوں گے۔''

''سات بجے نہیں...... آدھا گھنٹا گزر چکا ہے۔

ساڑھے چھ بجے مجھے پیسے پہنچانے ہیں۔'' وہ پریشانی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔

''انہوں نے پیسے کہاں منگوائے ہیں۔''

''اس نے مجھے خبردار کیا ہے کہ میں اکیلا آؤں۔ گاڑی میں خود چلا کر وہاں پہنچوں اور اس وقت تک گاڑی میں بیٹھا رہوں جب تک وہ خود میرے پاس نہیں آجائے گا اور میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائے گا۔'' نصیر احمد بتانے لگا ''جب وہ میرے ساتھ بیٹھ جائے گا تو منصور سامنے آئے گا۔ میں اس کو رقم دوں گا وہ اتر کر چلا جائے گا۔ اور منصور میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائے گا۔ یہ پلان دیا ہے اُس نے مجھے۔''

انسپکٹر جنید چپ چاپ سنتا رہا۔ ''اس نے بلایا کہاں ہے؟''

نصیر احمد نے جواب دیا۔ ''کینال روڈ...... شائن ہوٹل سے ذرا پیچھے۔''

''وہ سڑک خالی ہوتی ہے۔ آنا جانا بھی ہوتا ہے لیکن وہاں وہ اپنا معاملہ آسانی سے انجام دے سکتے ہیں۔''

نصیر نے گھڑی کی طرف دیکھا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ''بہت وقت ہو گیا ہے، مجھے جانا ہے۔''

''میں بھی وہاں موجود ہوں گا۔''

''میں نے آپ کو اس لیے بلایا تھا کہ آپ کوئی پلان بنانا چاہیں تو مجھے بتا دیں لیکن خدا کے لیے میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' نصیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔'' انسپکٹر جنید نے یقین دلایا۔

''آپ میرے ساتھ چلیں گے؟''

''آپ جائیں...... بے فکر رہیں، میں وہاں موجود ہوں گا۔'' انسپکٹر جنید نے کہا۔

دونوں ایک ساتھ ہی باہر نکلے اور اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ انسپکٹر جنید کا رخ دوسری طرف تھا۔ آگے جا کر اس نے نوید کو اپنے ساتھ بٹھایا جو ایک طرف کھڑا تھا پھر وہ اس جگہ سے چلے گئے۔

''اغوا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟'' نوید نے سوال کیا۔

''یہی تو اب جاننا ہے۔'' انسپکٹر جنید معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''ہمارے پاس تین بندے ہیں۔ پرنس خان، وہ عورت اور تیسرا وہ جس کے نام پر وہ نمبر ہے جس سے ڈاکٹر آفتاب اور نصیر احمد کو کالز آ رہی ہیں۔'' نوید نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ تین تو ہمارے مہمان ہیں اب یہ چوتھا باہر کیوں ہے؟'' انسپکٹر جنید بہت حد تک مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

''ہم ان کو اسی وقت گرفتار کریں گے۔''

''نہیں۔''

''پھر......؟''

''صرف دیکھیں گے۔'' انسپکٹر جنید نے کچھ دیر کے بعد جواب دیا۔

''صرف دیکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''ہر چیز فائدے کے لیے نہیں دیکھی جاتی، کچھ چیزیں معلومات کے لیے بھی دیکھی جاتی ہیں۔'' انسپکٹر جنید کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

اسی وقت ڈاکٹر آفتاب کی کال آ گئی۔ گاڑی چلاتے ہوئے انسپکٹر جنید نے موبائل فون نوید کی طرف بڑھا کر اسے اشارہ کیا کہ وہ اس کا اسپیکر آن کر دے۔

دوسری طرف سے ڈاکٹر آفتاب کی تیز آواز آئی۔

''انسپکٹر جنید...... تم چاہتے ہو کہ مجھے اپنی بیٹی کی لاش ملے۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''اب کیا ہونا باقی رہ گیا ہے۔ مجھ سے تاوان مانگا جا رہا ہے۔ دھمکی پر دھمکی مل رہی ہے۔ اور تم تماشا دیکھ رہے ہو۔''

''ابھی بھی اس کی کال آئی ہے؟''

''ہاں...... ابھی بھی آئی ہے اور خطرناک کال تھی۔'' اس کی غصے بھری آواز گاڑی کے اندر گونج رہی تھی۔

''آپ میرا انتظار کریں، میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔'' انسپکٹر جنید نے کہہ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

☆☆☆

نصیر کی کار ایک اندھیری جگہ پر نہر کنارے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ وہ ڈبل سڑک تھی۔ دونوں سڑکوں کے بیچ نہر تھی۔ نصیر ڈرائیونگ سیٹ پر سامنے دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے چہرے کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

نصیر کا دھیان سامنے کی طرف تھا اور وہ اس وقت چونکا جب اس کے برابر والا دروازہ کھلا اور ایک ایسا شخص اس کی برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گیا جس نے اپنے چہرے پر ماسک چڑھایا ہوا تھا۔

''پیسے لائے ہو؟'' اس نے آتے ہی پوچھا۔

''منصور کہاں ہے؟'' اس نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔ جس جگہ وہ کھڑا تھا، وہ اندھیرے میں ڈوبی

ہوئی تھی اور گاڑی کی محض وہ لائٹس روشن تھیں جس سے آنے جانے والوں کو معلوم ہو سکے کہ اس جگہ گاڑی کھڑی ہے۔ گاڑی کے اندر بھی اندھیرا تھا اس لیے وہ اسے ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔

''پیسے کہاں ہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔ ''پیسوں کے بارے میں بتاؤ گے تو منصور بھی سامنے آجائے گا۔''

نصیر احمد نے کچھ سوچنے کے بعد پچھلی سیٹ سے ایک چھوٹا بیگ اُٹھا کر اپنی گود میں رکھا اس کی زپ کھولی۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھنے کے بعد کہا۔ ''گاڑی آگے لے جاؤ۔''

نصیر نے بیگ اپنی گود میں ہی رہنے دیا اور گاڑی آگے لے گیا۔ اسی کی سائڈ پر ایک پیٹرول پمپ تھا اور اس کے ساتھ ایک چائے کا ہوٹل بنا ہوا تھا۔ دونوں چیزیں سڑک سے نیچے اتر کر سروس روڈ پر تھیں۔

''وہ دیکھو......'' اس نے چائے کے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔ منصور اس جگہ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ آدمی بولا۔ ''اسے بول کر آیا ہوں کہ یہاں سے مت بھاگنا۔ تجھے تیرا باپ آکر لے جائے گا۔ تم بھاگو گے تو تمہارے باپ کا نقصان ہو سکتا ہے اس لیے وہ بیٹھا چائے پی رہا ہے...... بیگ میرے حوالے کرو اور اپنے بیٹے کو لے کر یہاں سے چلتے بنو۔''

بیگ اپنی گود سے اٹھا کر نصیر احمد نے اس آدمی کے حوالے کر دیا۔ اس نے ایک بار پھر زپ کھولی اور دیکھنے کے بعد گاڑی سے باہر نکلا اور ایک طرف چلنے لگا۔

اسی وقت نصیر گاڑی سے باہر نکلا اور منصور کی طرف دوڑا۔ ایک دم اپنے باپ کو سامنے دیکھ کر منصور کھڑا ہو گیا۔

اپنے بیٹے سے ملتے ہوئے نصیر دل ہی دل میں انسپکٹر جنید کو بری طرح کوستا ہوا کہہ رہا تھا کہ اگر وہ اس مدد کرتا تو اس کے پیسے بچ سکتے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے جونہی اس نے نظر اُٹھا کر سامنے دیکھا، وہ چونکا۔ کچھ فاصلے پر انسپکٹر جنید کھڑا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر آفتاب اپنے سامنے براجمان انسپکٹر جنید کو ایسے گھور رہا تھا جیسے وہ اسے کچا ہی کھا جائے گا۔ تھوڑی دیر قبل انسپکٹر جنید اور نوید اس کے پاس پہنچے تھے۔

''میں نے بہت بڑی غلطی کر دی جو تم پر بھروسا کیا۔ مجھے پہلی ہی بار اولاد پر بات کرنی چاہیے تھی۔'' ڈاکٹر آفتاب کا لہجہ دھیما ضرور تھا لیکن اس کے الفاظ غصے کی آگ سے تر تھے۔

''ہم نے پوری کوشش کی ہے اور......'' انسپکٹر جنید نے کہنا چاہا۔

''تم نے جو کوشش کی ہے، وہ مجھے دکھائی دی ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب تمسخر سے بولا۔ ''ہم میاں بیوی کو یہ دکھ کھائے جا رہا ہے کہ ہماری بیٹی جانے کس حال میں ہوگی۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں دو افراد کو یہاں بلا سکتا ہوں؟'' انسپکٹر جنید کو موقع ملا تو وہ فوراً بولا۔

ڈاکٹر آفتاب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ کون لوگ ہیں جن کو تم یہاں بلانا چاہتے ہو؟''

''آپ اجازت دے دیں تو وہ ابھی آجائیں گے۔''

''یہاں ہم اپنی بیٹی کے غم میں کھانا پینا بھولے بیٹھے ہیں اور تم ہمارے ساتھ کوئی اور ہی ڈرامے بازی کر رہے ہو۔'' ڈاکٹر آفتاب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر نفیسہ بھی اس طرف آگئی تھی۔

وہ آتے ہی بولی۔ ''آپ مہربانی کریں اور یہاں سے چلے جائیں۔ ہم ایک کروڑ روپیہ دے کر اپنی بیٹی کو ان کے چنگل سے آزاد کرا لیں گے۔ ویسے بھی ان لوگوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع دی تو وہ کچھ بھی کر دیں گے اور ہم پولیس کی مداخلت نہیں چاہتے، اپنا مسئلہ خود ہی حل کر لیں گے۔''

''مجھے صرف آدھا گھنٹا دیں۔ ابھی سب کچھ حل ہو جائے گا۔ میں خود ہی ان لوگوں کو بلا لیتا ہوں......'' انسپکٹر جنید نے کہہ کر موبائل فون سے نوید کو کال کر کے کہا کہ وہ ان دونوں کو اندر لے آئے۔

ڈاکٹر آفتاب اور نفیسہ متحیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جونہی لاؤنج کا دروازہ کھلا اور جو نوید کے ساتھ اندر آئے تھے، انہیں دیکھ کر ڈاکٹر آفتاب اور نفیسہ چونکے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ وہ دونوں نصیر احمد اور منصور تھے۔

''یہ کون ہیں؟'' ڈاکٹر آفتاب نے دونوں کی طرف دیکھتے ہی پوچھا۔

نصیر احمد اور منصور کو ایک طرف بٹھا دیا گیا تھا۔ نوید ان کے پیچھے کھڑا تھا جبکہ ان چاروں کے درمیان انسپکٹر جنید تھا۔

''کیا آپ واقعی ان کو نہیں جانتے؟'' انسپکٹر جنید نے ڈاکٹر آفتاب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کون ہیں یہ؟'' ڈاکٹر آفتاب نے پوچھا۔

''یہ نصیر احمد اور ان کا بیٹا منصور ہے۔'' انسپکٹر جنید نے دونوں کا تعارف کرایا تو ڈاکٹر آفتاب نے حیرت سے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... توتم ہومنصور۔''

''ڈاکٹر آفتاب صاحب...... بہتر ہے کہ یہ اداکاری چھوڑ دیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں اور نہ یہ آپ دونوں کا پہلا تعارف نہیں ہے۔'' انسپکٹر جنید نے کہا تو ڈاکٹر آفتاب کے ساتھ ساتھ نفیسہ بھی اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''انسپکٹر صاحب بہت کچھ جانتے ہیں۔'' نصیر احمد نے ڈاکٹر آفتاب کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''کیا جانتے ہیں؟'' ڈاکٹر آفتاب کی آواز میں جیسے لکنت آگئی۔

''میں بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر جنید بولا۔ ''یہ نصیر احمد ہیں شہر کے بڑے بزنس مین ہیں۔ آپ کے ساتھ ان کا تعلق اچانک جڑا تھا اور پھر بہت مضبوط ہوگیا۔ بزنس میں ان کا ریکارڈ اتنا اچھا نہیں ہے۔ بہت تیز طرار ہیں' موقع محل دیکھ کر فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔ ایک سال پہلے یہ آپ کے پاس آئے تھے اور ان کے پاس بزنس کے لیے ایک پلان تھا۔ انہوں نے آپ کو ایک ایسا پلان دیا جس میں بہت نفع تھا۔ ڈاکٹر صاحب آپ اس کاروبار میں پیسہ لگانے کے لیے تیار ہوگئے تھے اور آپ نے نصیر احمد کو تین کروڑ روپے بھی دے دیے تھے۔''

انسپکٹر جنید نے کہہ کر ڈاکٹر آفتاب کی طرف دیکھا جو چہرہ دوسری طرف کیے اس کی بات سن رہا تھا۔

انسپکٹر جنید بولا۔ ''نصیر احمد کے ہاتھ میں پیسہ گیا تو ڈاکٹر آفتاب کے علم میں یہ بات آئی کہ اس پراجیکٹ کو دکھا کر نصیر احمد نے مزید چار لوگوں سے کروڑوں روپیہ وصول کیا ہوا ہے اور اس پراجیکٹ کا وجود ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر آفتاب نے جب نصیر احمد سے اس بارے میں بات کی تو پہلے وہ اسے جھوٹ کہتے رہے اور جب کچھ بحث ہوئی تو نصیر احمد نے فون بند کردیا۔ اس طرح جن لوگوں نے نصیر احمد کو پیسہ دیا تھا وہ ان کے سر ہوگئے۔ ڈاکٹر آفتاب نے اپنے ایک جاننے والے جرائم پیشہ سے منصور کو اغوا کرالیا اور ان سے اپنا پیسہ لینے میں کامیاب ہوگئے، منصور کو چھوڑ دیا...... نصیر احمد نے اسی وقت راتوں رات منصور کو دبئی بھجوا دیا اور ان لوگوں پر الزام لگادیا کہ انہوں نے اس کے بیٹے منصور کو اغوا کرلیا ہے۔ جنہوں نے پیسے لینے تھے ان کی جان کو بن گئی۔''

انسپکٹر جنید کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولا۔

''اس دوران فلک اور منصور میں دوستی بھی چل رہی تھی۔ منصور دبئی چلا گیا تھا اور فلک سے اس کا رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ پریشان تھی کہ منصور اچانک کہاں لاپتا ہوگیا ہے اور یہ ان سب کے لیے معما بن گیا تھا۔ جن لوگوں نے نصیر احمد سے رقم واپس لینی تھی، وہ اغوا کا الزام لگتے ہی چپ ہوگئے تھے۔''

انسپکٹر جنید نے ان چاروں کا باری باری جائزہ لیا اور کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔ ''نصیر احمد کے لیے حالات سازگار ہوگئے تھے۔ انہوں نے منصور کو واپس بلالیا۔ منصور ابھی دبئی سے پہنچا نہیں تھا کہ منصور کے موبائل فون سے فلک کو ایک میسج آتا ہے اور فلک دیوانہ وار اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ جاتی ہے۔ اور پھر لاپتا ہوجاتی ہے۔ جبکہ اسے منصور نے نہیں بلایا تھا کیونکہ وہ تو ابھی دبئی سے واپس ہی نہیں آیا تھا۔ دراصل منصور کا موبائل فون اسی کے پاس تھا جس نے منصور کو اغوا کیا تھا۔ اسی نے اس کے نمبر سے فلک کو میسج کیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ فلک اس کے پیار میں پاگل ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی چلی آئے گی۔ ایسا ہی ہوا اور اس نے فلک کو اغوا کرلیا۔''

منصور نے چونک کر پوچھا۔ ''فلک کو کس نے اغوا کیا تھا؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر جنید نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ڈاکٹر آفتاب اور ان کی بیگم صاحبہ کو یہ شک تھا کہ ان کی بیٹی کو منصور نے اغوا کرلیا ہے۔ یہ میرے پاس آئے رپورٹ درج ہوئی لیکن ان کو اپنی طاقت پر بھی زعم تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کو ان کے ایک آدمی نے بتایا کہ اس نے منصور کو دیکھا ہے۔ اس پر نگرانی کی گئی اور ایک دن ڈاکٹر آفتاب نے اپنے ایک آدمی سے منصور کو اغوا کرالیا۔ منصور کو اغوا کرنے کے بعد پوچھ گچھ سے یہ بات سامنے آئی کہ منصور نے فلک کو میسج نہیں کیا تھا اور اس کا موبائل فون اسی کے پاس تھا جس نے اس کو اغوا کیا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب جانتے تھے کہ منصور کو انہوں نے کس سے اغوا کرایا ہے اس لیے وہ اس تک پہنچ گئے جس نے فلک کو اغوا کیا تھا۔ فلک کو اغوا کرنے والے نے اس کی رہائی کا ایک کروڑ روپیہ مانگا اور ڈاکٹر آفتاب کے کہنے پر منصور کو اغوا کرنے والے نے بھی ایک کروڑ روپیہ ہی مانگا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی جیب سے ایک پیسہ نہیں دیں گے، منصور کے باپ سے پیسہ لے کر فلک کو اغوا کرنے والے کو دے دیں گے۔''

ڈاکٹر آفتاب نے کرسی پر بیٹھے ہوئے اپنا پہلو بدلا اور مضطربانہ انداز میں انسپکٹر جنید کی طرف دیکھنے لگا۔

''جب میں نے صابر کو پکڑا تو فلک کو اغوا کرنے والے نے میری بیوی کو اغوا کرالیا تاکہ میں اُلجھ جاؤں اور صابر کی رہائی ہوجائے کیونکہ صابر بہت کچھ جانتا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا